سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

اکادمی ادبیات پاکستان

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

◆

پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

شمارہ نمبر 106، جولائی تا ستمبر 2015

نگران : پروفیسر ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو (تمغۂ امتیاز)
مدیر منتظم : ڈاکٹر راشد حمید

مدیر اعلیٰ : نگہت سلیم
مدیر : اختر رضا سلیمی

اکادمی ادبیات پاکستان
پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ ۔ ایٹ بٹا ون، اسلام آباد

مجلسِ مشاورتِ متن

ڈاکٹر توصیف تبسم
ڈاکٹر اقبال آفاقی
محمد حمید شاہد
ڈاکٹر وحید احمد

ضروری گزارشات

☆ مجلے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اعزازیہ بھی اہلِ قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے نگارشات کے ساتھ اپنا پورا نام اور پتہ بھی تحریر کریں۔

☆ شاملِ اشاعت نگارشات کے نفسِ مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آرا کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آرا نہ سمجھا جائے۔

☆ نگارشات اِن پیج فارمیٹ میں بذریعہ ای میل بھیجی جا سکتی ہیں:

قیمت موجودہ شمارہ: -/100 روپے (اندرون ملک)　　40 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
سالانہ (4 شماروں کے لیے) -/400 روپے (اندرون ملک)　160 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
(رسالہ اندرون ملک بذریعہ رجسٹری اور بیرون ملک بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جاتا ہے۔
ڈاک خرچ ادارہ خود ادا کرتا ہے)

طباعت:	علی یاسر	051-9269712
سرکولیشن:	میر نواز سولنگی	051-9269708

مطبع: NUST پریس، سیکٹر H-12، اسلام آباد

ناشر

اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
رابطہ: 051-9269721، 051-9269714
Email: nighatsalem.dir.ce.pal@gmail.com
ar.saleemipal@gmail.com
Website: www.pal.gov.pk

فہرست

حضوری اپنے لیے ہی فقط نہیں مانگی (عقیدت)

نورین طلعت عروبہ — آن کی آن میں اوقات بدل سکتا ہے — 9
احسان اکبر، ڈاکٹر — ادب میں کچھ ملا تو آپؐ کے ادب کے سبب — 10
غلام مصطفیٰ بسمل — منبعِ نورِ خُدا ہو دل میرا — 11
خورشید ربانی — سلام — 13

حرف تھے اور بھی پر پھول بنایا مجھے تھا (غزلیات)

ظفر اقبال — کون ایسے بے سُود سفر میں شامل ہو جاتا ہے — 15
انور شعور — ڈھونڈنے پر بھی کوئی کام کہاں ملتا ہے — 16
نصرت زیدی — میں آزمائشوں کے یہ کن مرحلوں میں ہوں — 17
عباس رضوی — دشت میں رم نہ کیا شہر میں وحشت نہیں کی — 18
نسیم عباسی — کسی سے ایسی رتوں میں جدا نہیں ہوتے — 19
فیضی — اُٹھ کے وقتِ سحر نکلتے ہیں — 20
قمر رضا شہزاد — مرے مقام کو مت بیش و کم کیا جائے — 21
صفدر صدیق رضی — آستانہ بنا دیا گیا ہے — 22
فیضان عارف — تیری آنکھوں میں کس کی صورت ہے — 23
شکیل جاذب — جس کو دیکھا نہیں کئی دن سے — 25
شہزادا ظہر — حرف تھے اور بھی پر پھول بنایا مجھے تھا — 26
شہاب صفدر — آرام کشِ دامنِ ذی جاہ رہا ہے — 27
اطہر جعفری — ناصحا، کچھ یاد کر، وعدہ خلافی چھوڑ دے — 28
شمشیر حیدر — منفعت سے نہ سہارے سے ملا ہے مجھ کو — 29
علی یاسر — پوری ہوئی جو ہجر کی میعاد آوے گا — 30
عمران عامی — پہلے اس شہر کا سلطان کیا جائے گا — 31
سرفراز زاہد — پہلے بچوں کا رونا ہنستا ہے — 32
عابد خورشید — گرد چہرے سے جھاڑتا ہے مجھے — 33
سجاد بلوچ — ہزار وحشتیں لپٹی ہوئی ہیں سینے سے — 34

حسن جمیل جب کوئی در نہ کھلا لوٹ ہی آئے ہم بھی 35
نیر رانی شفق ملن رُت کے حسیں سپنے ذرا تعبیر کرتے ہیں 36
اعجاز حسین فاخر جان دینی تھی مگر جان نہیں دے پایا 37
محمد شعیب مرزا آئینے سے سوال کرتا ہوں 38

تیری دُھن میں رنگ جمائیں، چار سُروں کے پالے (نظمیں)

نصیر احمد ناصر ونڈو شاپنگ 39
تنویر قاضی اندھی ڈولفن 41
انجم سلیمی قوما 42
احمد لطیف دانہ و دام کا قصہ 43
نثار ترابی، ڈاکٹر ملی گیت 44
رفعت اقبال یا ساحرۃ العرب 45
شہزاد نیّر دنوں کا دُکھ 48
ضیاء الرشید، ڈاکٹر دو ہاتھوں کا کھیل 50
حفیظ اللہ بادل وصال رُت 51
عنبرین صلاح الدین نقش 52
نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر مگر میں کیسے پرسہ دوں؟ 53
سید مظہر مسعود پانی کی کہانی 55

اب ختم ہو چکی ہیں تحمل مزاجیاں (مزاح)

سرفراز شاہد قطعات 57
نیلم احمد بشیر وقت 59
عزیز فیصل، ڈاکٹر وصل کی نوبت نہ آئی عید پر 61
محمد عارف قطعات 63

آخر کس کہانی کو جلی عنوان ہونا ہے (ناول کا ایک باب)

ذکاء الرحمٰن کشف الکتاب 65
مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر انار کلی 72
ظفر سید لہو کی بُو ہوا میں ہے 83
اختر رضا سلیمی جندر 91

کیا باغ و بہار اُس کا فسانہ ہے سنو تو (افسانے)

نیلم احمد بشیر اکیلی 99
حنیف باوا آس کی لرزتی لو 103

نکہت یاسمین	ادب شناس	107
ممتاز راشد لاہوری	اَکھان بی بی	112
احمد حسن رانجھا	اجنبی	114
شاہین کاظمی	تریاق	118
محمد عباس	جاوید مستان	124
سدرہ حفیظ	باؤلی	133
محمد عثمان عالم	حاملہ آوازیں	136

کتابوں میں لکھے الفاظ مجھ سے پوچھتے ہیں (مضامین)

ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر	ناول کا قاری اور زندگی کے گورکھ دھندے	139
صلاح الدین درویش، ڈاکٹر	مابعد جدیدیت، لبرل علوم اور ڈی کنسٹرکشن	148
افشاں کرن	اوڈیسی اور اردو داستانوں میں مماثلت کا جائزہ	156

رفتگاں کی کھوج اور آئندگاں کا انتظار (یادداشتیں/خاکے)

ظفر اقبال	کچھ باعثِ تحریر بھی تھا	167
محمد اظہار الحق	کچھ گھائل دن کچھ وصل کی روشن راتیں	172
سیّد مظہر جمیل	ہمارے مرزا جی	180

اس جگہ سے سفر نکلتے ہیں (سفرنامہ)

ڈاکٹر نجیبہ عارف	جگہیں، چہرے، یادیں اور خیال	201
گلزار حسنین	واہ رے اندلس	219

میں جو بھی ہوں مجھے ویسا رقم کیا جائے (خصوصی مطالعے)

افضل احسن رندھاوا

افضل احسن رندھاوا/سلیم شہزاد	بیوہ	229
افضل احسن رندھاوا/سلیم شہزاد	دشمنی	239
افضل احسن رندھاوا/سلیم شہزاد	عورت، تلوار اور گھوڑا	244
افضل احسن رندھاوا/خالد فرہاد دھاریوال	کھوئی ہوئی خوشبو	250
افضل احسن رندھاوا/خالد فرہاد دھاریوال	الٰہی مُہر	255
افضل احسن رندھاوا/علی یاسر	اُلٹے پاؤں والی	260

جلیل عالی

محمد حمید شاہد	جلیل عالی، قلبِ غزل سے قلبیہ تک	265
جلیل عالی	قلبیہ	278

زبانِ یارِ من ترکی ومن ترکی نمی دانم (پاکستانی زبانوں سے تراجم)

براہوئی

وحید زہیر/تیمور دہوار موت سے مک مکا 289
افضل مراد/جہاں آرا تبسم تم مجھ سے ناراض نہ ہوا 291

بلوچی

مقبول انور/واحد بخش بزدار بے وفا 293
پروفیسر صبا دشتیاری/ڈاکٹر ہی پرواز جب چڑیاں چگ گئیں کھیت 295

پشتو

اکرم نازی/اکرم نازی لوڈشیڈنگ 298
رحمت شاہ سائل/م ۔ ر ۔ شفق ساحری نظم: میری نئی رائے 301
نصیب اللہ سیماب/اجمیر افغان اجنبی 306

پوٹھوہاری

شیراز اختر مغل/شیراز طاہر بڑائی 316
شیراز طاہر/شیراز طاہر جونک 317

پنجابی

اخلاق عاطف/اخلاق عاطف ککھ پردیسی 320
ملک شاہ سوار علی ناصر/گل حسن بدر بھاگ بھری 321

سرائیکی

سید حفیظ اللہ گیلانی/احسان بلوچ حاجت مند 323
جمشید ناصر/ طاہر شیرازی سانحہ پشاور کے تناظر میں 329

سندھی

ڈاکٹر ادل سومرو/حیدار سولنگی بچے ووٹ نہیں کرتے 330
رمضان نول/محمد مشتاق آثم صلیب/گم شدہ لو سے 332
منظور کھیا/شاہد حنائی سات مسافر 333

کشمیری

الطاف حسین اندرابی/غلام حسن بٹ ظلمِ عظیم 336

ہندکو

صوفی عبدالرشید/امتیاز الحق امتیاز ہندکو رباعیات 344

☆☆☆☆

اداریہ

ناول اس وقت دنیا کی مقبول ترین صنف ہے لیکن ہمارے ہاں ناول پڑھنے کا رجحان دیگر ادبی اصناف کی نسبت بہت کم ہے حالاں کہ پاکستانی زبانوں خاص کر اردو میں لکھا جانے والا ناول دنیا کی کسی بھی زبان کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ناول کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر ہم نے موجودہ شمارے میں ناول کے لیے الگ سے ایک گوشہ مختص کیا ہے جس کے تحت چار معاصر ناول نگاروں کے زیرِ تخلیق ناولوں کا ایک ایک باب شامل کیا گیا ہے۔

عالمی سطح پر ناول کے بعد اس وقت خودنوشت سوانح عمریاں، یادداشتیں اور سفرنامے بہت پذیرائی حاصل کر رہے ہیں۔ یہ تینوں اصناف اس حوالے سے انتہائی اہم ہیں کہ ان کی بنیاد لکھنے والے کے تجربات و مشاہدات پر ہوتی ہے۔ یوں ان میں ایک دور کی پوری تاریخ سانس لے رہی ہوتی ہے۔ موجودہ شمارے میں ان اصناف کے لیے بھی علاحدہ سے ایک گوشہ مختص کیا گیا ہے اور ان اصناف کے ممتاز لکھنے والوں سے غیر مطبوعہ نگارشات حاصل کی گئی ہیں۔

سہ ماہی ادبیات کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ وہ ایسا ادب پیش کرے جو نہ صرف اردو بل کہ تمام پاکستانی زبانوں کا نمائندہ اور یہاں کے بسنے والوں کی اجتماعی سوچ کا آئنہ دار ہو۔ حسبِ روایت موجودہ شمارے میں بھی جہاں حمد، نعت، سلام، غزلیں، افسانے، مضامین اور دیگر اردو اصناف شامل ہیں، وہاں دیگر پاکستانی زبانوں: براہوی، بلوچی، پشتو، پوٹھوہاری، پنجابی،

سرائیکی، سندھی، کشمیری اور ہندکو کے ممتاز لکھنے والوں کی نگارشات کے تراجم بھی شامل کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں خصوصی مطالعے کے تحت پنجابی کے ممتاز ادیب افضل احسن رندھاوا کے لیے الگ سے ایک گوشہ ترتیب دیا گیا ہے جس میں ان پنجابی کہانیوں کے اردو تراجم شائع کیے جا رہے ہیں۔ آئندہ شمارے میں ہم کچھ بڑے عالمی ادیبوں کے لیے گوشے مختص کر رہے ہیں تا کہ ان کی تخلیقات سے اردو کے قارئین بھی استفادہ کر سکیں۔

امید ہے حسب سابق آپ کو یہ کاوش بھی پسند آئے گی۔ ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

(ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو)

☆☆☆☆

نورین طلعت عروبہ

آن کی آن میں اوقات بدل سکتا ہے
تُو ہر اک شخص کے حالات بدل سکتا ہے

امتحانِ غمِ دُنیا ہے ادق میرے لیے
تُو جو چاہے تو سوالات بدل سکتا ہے

جو بھی کاذب ہے ترے سامنے حاضر ہوگا
ابھی دُنیا میں تو وہ بات بدل سکتا ہے

بخشنا مجھ کو قناعت تجھے دُشوار نہیں
اِک ترا حُکم مری ذات بدل سکتا ہے

خَیر کرتی ہی نہیں جن کے دلوں بیچ گُرور
تُو تو اُن کے بھی خیالات بدل سکتا ہے

تُو ہی دے سکتا ہے کفّار پہ سبقت ہم کو!
جیت میں تُو ہی ہر اک مات بدل سکتا ہے

تُو نے رکھی ہے خزاؤں کے تعاقب میں بہار
صبحِ روشن میں سیہ رات بدل سکتا ہے

☆☆☆☆

ڈاکٹر احسان اکبر

نعت

ادب میں کچھ ملا تو آپؐ کے ادب کے سبب
کیا ہی کیا؟ جو کیا ہے سو لطفِ رب کے سبب

بچا رہا ہوں تو کیسے؟ سبب نہیں معلوم
اے وجہِ کون و مکاں! اے ہر اک سبب کے سبب!

میں مُنکر اُن کا ہوا مُنکر آپؐ کے جو رہے
نصیب میں ہوا یہ فضل، فضلِ رب کے سبب

حضوری اپنے لیے ہی فقط نہیں مانگی
یہ التجا ہے بنیں ہم میں سب کے سب کے سبب

لوائے حمد کا سایہ نصیب ہو اُس دن
جو دن جل اُٹھے گا اللہ کے غضب کے سبب

ثنا گزاروں میں کیا دیکھ کر چُنے گئے ہم
بتائیں کیا بھلا اکرامِ بے سبب کے سبب

مواجہہ میں پڑھی اہلِ نعت نے مری نعت
میں مُفتخر ہوا ہوں نعتِ مُنتخب کے سبب

☆☆☆☆

غلام مصطفیٰ بسمل

نعت

منبعِ نُورِ خُدا ہو دل مرا
یا نبیؐ غارِ حرا ہو دل مرا

لب پہ ہوں کِھلتے درودوں کے گلاب
اور سجدے میں جھکا ہو دل مرا

آپؐ کے جلوؤں سے یہ پُر نُور ہے
کیوں نہ پھر عرشِ خدا ہو دل مرا

ہونٹ میرے اسم چُومیں آپؐ کا
میرے ہاتھوں میں کِھلا ہو دل مرا

چاند اُتریں روشنی کے اشک اشک
رنگ و خوشبو کی فضا ہو دل مرا

آپؐ ہی کی رہ گزر آنکھیں مری
آپؐ ہی کا نقشِ پا ہو دل مرا

سُوئے یثرب جو چلے ہیں قافلے
اُن کے حق بانگِ درا ہو دل مرا

میری سانسیں ہوں غلامِ مصطفےؐ
روضۂ صلِ علیٰ ہو دل مرا

صُورتِ شمس و قمر ہو جلوہ گر
گردشِ صبح و مسا ہو دل مرا

میں کھڑا ہوں صحنِ طیبہ میں حضورؐ
اور بخشش کی دُعا ہو دل مرا

صورتِ یٰسین و طٰہٰ ہوں حروف
صورتِ بابِ دُعا ہو دل مرا

☆☆☆☆

خورشید ربانی

سلام

خدا کی راہ کے بامِ شہِ ہدیٰؐ کے چراغ
نظر نظر میں فروزاں ہیں کربلا کے چراغ

نشانِ قریہء باطل مٹاتے جاتے ہیں
حسینؑ جادہء حق میں جلا جلا کے چراغ

فضائے خانۂ اسلام جن سے روشن ہے
نبیؐ کے گھر کے دیے ہیں رہِ رضا کے چراغ

وہ آب جُو کہ جو پہنچی نہیں تھی پیاسوں تک
جلاتی پھرتی ہے پلکوں پہ اب عزا کے چراغ

یہ ماہ و مہر حقیقت میں ہیں اُنہی کا نُور
جلے ہوئے ہیں جو اب سامنے ہوا کے چراغ

ہوائے کوفۂ شب کو خبر نہ تھی کہ یہ ہیں
علیؑ کے نورِ نظر اور مصطفیٰؐ کے چراغ

وہ شام آج بھی روتی ہے خون کے آنسو
کہ جس نے دشت میں دیکھے تھے مرتضیٰؑ کے چراغ

حریمِ صبر و رضا کا دیا جلایا ہے
حسینؑ ابنِ علیؑ نے بجھا بجھا کے چراغ

حسینؑ! کس کو پکاریں گے ہم تمھارے بعد
حسینؑ! کون جلائے گا اب وفا کے چراغ
☆☆☆☆

ظفر اقبال

کون ایسے بے سُود سفر میں شامل ہو جاتا ہے
راہرووں کو جب رستا ہی منزل ہو جاتا ہے
خود سے بھی ملنا ناممکن ہو جاتا ہے اکثر
کوئی تو ہے جو درمیان میں حائل ہو جاتا ہے
ہر شے کھو دیتے ہیں اور کچھ بھی نہیں بچتا باقی
پھر بھی لگتا ہے سارا کچھ حاصل ہو جاتا ہے
آنکھیں اور طرف کو کھنچتی ہوتی ہیں اُس لمحے
لیکن دل ایک اور ہی جانب مائل ہو جاتا ہے
لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں، یہ کھیل ہے ایسا
پل میں اچھا بھلا سخی بھی سائل ہو جاتا ہے
کوئی کنارا ایسا ہے کہ ڈبو دیتا ہے کشتی
ایک بھنور ہے جہاں سفینہ ساحل ہو جاتا ہے
ایسے لگتا ہے کہ ہوا بھی روک رکھی ہو اُس نے
بیٹھے بیٹھے سانس بھی لینا مُشکل ہو جاتا ہے
اُسے بھی یاد نہیں آتا ہے ایک چاہنے والا
دل بھی محبت کرتے کرتے غافل ہو جاتا ہے
پیش رفت کی کوشش بھی کرتے ہیں بہت ظفرؔ ہم
اور، اثر پہلے والا بھی زائل ہو جاتا ہے

☆☆☆☆

انورشعور

ڈھونڈنے پر بھی کوئی کام کہاں ملتا ہے
پھر بھی بے کار کو آرام کہاں ملتا ہے

چاہتے ہیں کہ پییں ہم سحر و شام مگر
وقت اتنا سحر و شام کہاں ملتا ہے

گفتگو فون پہ ہوتی ہے زبانی اُن سے
موقعِ نامہ و پیغام کہاں ملتا ہے

اور چیزوں کا تو کیا ذکر کہ بازاروں میں
پیار بھی بے دِرم و دام کہاں ملتا ہے

تجھ سے ہٹ کر ہمیں چلنے کے لیے چار قدم
راستہ اے روشِ عام کہاں ملتا ہے

کرنی پڑتی ہے بڑی کوہ کنی اس کے لیے
تحفتاً بادۂ گلفام کہاں ملتا ہے

کچھ بتانا نہ پڑے اس لیے غائب ہے شعورؔ
آج کل ہم سے وہ بدنام کہاں ملتا ہے

☆☆☆☆

نصرت زیدی

میں آزمائشوں کے یہ کن مرحلوں میں ہوں
اپنے ہیں میرے ساتھ کہ میں دشمنوں میں ہوں
وہ منزلِ مُراد نہیں دُور دُور تک
ہر اک سے پوچھتا ہوں میں کن راستوں میں ہوں
یا رب مجھے بھی کوئی عصائے کلیم دے
افسُوں زدہ ہوں، شہر کے جادوگروں میں ہوں
پچھلے پہر کی آہ و فُغاں سے نہیں فراغ
دن میں یہ ابتلا ہے کہ میں ناصحوں میں ہوں
پھر یاد آ رہا ہے پسِ در سے اک سلام
میں خوش نصیب وصل کی اُن ساعتوں میں ہوں
گھر جیسا اِن بگولوں میں حجرہ بنانے دے
اے دشتِ بے اماں میں تری وسعتوں میں ہوں
ہاں میرے پاس میرے مسائل کا حل نہیں
جو ماورائے عقل ہیں اُن مسئلوں میں ہوں
نصرتؔ حیا سے نام وہ لیتا نہیں تو کیا
راتوں کو اُس کے دل کی مگر دھڑکنوں میں ہوں

☆☆☆☆

عباس رضوی

دشت میں رم نہ کیا شہر میں وحشت نہیں کی
عشق میں جاں سے گزرنے کی جسارت نہیں کی

ہم بھی پھیلا نہ سکے اس کی طرف دستِ سوال
وہ سخی تھا مگر اس نے بھی سخاوت نہیں کی

خونِ دل ہم نے کسی طور نہ بیچا اپنا
یعنی جو لفظ لکھے ان کی تجارت نہیں کی

حسن کو مالِ غنیمت نہیں سمجھا ہم نے
عشق میں ہم نے رقیبوں سے شراکت نہیں کی

جاہ و منصب کو زر و مال کو ٹھکراتے رہے
یعنی دنیا کے خداؤں کی عبادت نہیں کی

ہم نے اولاد کی خوشیوں کو مقدم جانا
اپنے اجداد کے ورثے کی حفاظت نہیں کی

دل کسی اور کا ہے جاں یہ کسی اور کی ہے
ہم فقیروں نے امانت میں خیانت نہیں کی

ہم جنھیں آج بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں
ان دکھوں کی تو کسی نے بھی کفالت نہیں کی

☆☆☆☆

نسیم عباسی

کسی سے ایسی رتوں میں جدا نہیں ہوتے
کہ برف پگھلے تو پھر نقشِ پا نہیں ہوتے

قفس میں عدل کی کوئی بھی شِق نہیں ہوتی
ضمانتوں پہ پرندے رہا نہیں ہوتے

وہ اختلافِ نظر ہے کہ آئنے میں بھی
ہم اپنے ساتھ کبھی رونما نہیں ہوتے

اگر گریز کرے رات چھیڑ چھاڑ سے چاند
سمندروں میں تلاطم بپا نہیں ہوتے

نسیم زعمِ سفر میں جہاں پہنچ جائیں
ہم اپنے آپ سے آگے ذرا نہیں ہوتے

☆☆☆☆

فیضی

اُٹھ کے وقتِ سحر نکلتے ہیں
خواب ہیں، در بدر نکلتے ہیں

دل سے اُٹھتی ہیں یوں تمنائیں
جیسے شعلوں کے سر نکلتے ہیں

تم نے منزل سمجھ لیا ہے اسے
اس جگہ سے سفر نکلتے ہیں

کیسا آباد ہے یہ ویرانہ!
ہر جگہ گھر ہی گھر نکلتے ہیں

ہم نکلتے ہیں موج میں آ کر
آپ کچھ سوچ کر نکلتے ہیں

لکھنے بیٹھوں، تو کاغذوں سے مرے
کچھ پتنگوں کے پَر نکلتے ہیں

☆☆☆☆

قمر رضا شہزاد

مرے مقام کو مت بیش و کم کیا جائے
میں جو بھی ہوں مجھے ویسا رقم کیا جائے

میں ایک بھٹکے ہوئے عشق کی لپیٹ میں ہوں
سو مجھ پہ اب کسی آیت کا دم کیا جائے

میں رقص کرتا ہوں، جی بھر کے خاک اُڑاتا ہوں
مجھے بھی دشت کی وحشت میں ضم کیا جائے

مرے لہو سے کیا جائے راستہ روشن
مرا پھٹا ہوا کُرتا علم کیا جائے

سنائی جائے کوئی داستاں محبت کی
میں تھک چکا ہوں مجھے تازہ دم کیا جائے

فلک کو سونپ دیے جائیں یہ فلک زادے
زمیں کے بوجھ کو تھوڑا سا کم کیا جائے

جہانِ عشق ہے ہر شے سے ماورا شہزادؔ
یہاں نہ ذکرِ وجود و عدم کیا جائے

☆☆☆☆

صفدر صدیق رضی

آستانہ بنا دیا گیا ہے   آنا جانا بنا دیا گیا ہے
دفن کر کے پھر ایک بے گھر کو   آشیانہ بنا دیا گیا ہے
ملزموں کو بہ فیضِ حُسنِ سلوک   مجرمانہ بنا دیا گیا ہے
ہم نے سجدے تجھے کیے تو ہمیں   کافرانہ بنا دیا گیا ہے
مجھ سے معصوم کو بھی خلقت میں   جارحانہ بنا دیا گیا ہے
خوف طاری ہے گیت کیا گائیں   گنگنانا بنا دیا گیا ہے
عشق کچھ سرسری سا تھا پہلے   والہانہ بنا دیا گیا ہے
چند بکھرے ہوئے مکینوں سے   اک گھرانہ بنا دیا گیا ہے
جس ورق پہ گرے تھے اشک مرے   آب و دانہ بنا دیا گیا ہے
اک نظر سے تو بچ نکلتے ہم   پھر نشانہ بنا دیا گیا ہے
پل دو پل تجھ سے بات کی تھی کبھی   اک فسانہ بنا دیا گیا ہے
زندگی آ رہی تھی میری طرف   پھر بہانہ بنا دیا گیا ہے
خلق کے پاس کوئی وقت نہیں   اور زمانہ بنا دیا گیا ہے

☆☆☆☆

فیضان عارف

تیری آنکھوں میں کس کی صورت ہے
اس وضاحت کی کیا ضرورت ہے

تجھ کو محسوس کر لیا ہے بہت
اب تجھے دیکھنے کی حسرت ہے

میرے اپنے بھی فیصلے ہیں اٹل
میرے اندر بھی اک عدالت ہے

کارواں رک گیا ہے سانسوں کا
یہ بھی ہجرت کی اک علامت ہے

حرف حق دار پر بھی کہہ دینا
میرے اجداد کی روایت ہے

یاد کیا کیا دلاؤ گے اس کو
بھول جانا تو اس کی عادت ہے

کیسے قائم ہے یہ نظام اب تک
آج ہر شخص محوِ حیرت ہے

بولتی ہے لہو کی سچائی
اور یہ سچ مری وراثت ہے

کوئی انساں نہیں رہا انمول
اب تو ہر آدمی کی قیمت ہے

وہ مرا نام یاد رکھتا ہے
یہ بھی اس دور میں غنیمت ہے

ابنِ آدم ہوں اس لیے فیضانؔ
مجھ کو پیغمبروں سے نسبت ہے

☆☆☆☆

شکیل جاذب

جس کو دیکھا نہیں کئی دن سے
وہ ہے دل میں مکیں کئی دن سے

جانے کیسی نظر پڑی اُس کی
ہوں وہیں کا وہیں کئی دن سے

خشک دریا سے مجھ کو یاد آیا
میں بھی رویا نہیں کئی دن سے

ابر لازم ہوئے سرِ مژگاں
دل ہے سوکھی زمیں کئی دن سے

کر رہا ہوں عبث نظر انداز!
ایک رُوئے حسیں کئی دن سے

بن گئی ہیں بہ فیض مئے جاذبؔ
تلخیاں، انگبیں کئی دن سے

☆☆☆☆

شہزاد اظہر

حرف تھے اور بھی پر پھول بنایا مجھے تھا
تم نے تنہائی کی ٹہنی پہ کِھلایا مجھے تھا

یہ جو خود اپنی خبر تک اُسے ملتی نہیں ہے
میں نے لوگوں سے سُنا اُس نے بھلایا مجھے تھا

خواب کی آنکھ! قناعت تو نہیں کی میں نے
میری دو آنکھوں نے جتنا بھی دکھایا مجھے تھا

اک ستارے کی طرف میرے قدم کیا اُٹھتے
دن کی گلیوں میں بہت تم نے تھکایا مجھے تھا

اور بھی لوگ تھے آنا تھا جنھیں حُسن نظر
پر ترا رنگ گلستان میں بھایا مجھے تھا

آنچ دو آنچ کی رہ جاتی تھی ہر بار کی
اک ہرے نقش نے شہزاؔد ستایا مجھے تھا

☆☆☆☆

شہاب صفدر

آرام کشِ دامنِ ذی جاہ رہا ہے
جو ذرہ سلیماں کا ہوا خواہ رہا ہے

دفن اس میں ملیں گے کئی غرقاب سفینے
یہ دشت کہ دریا کی گذرگاہ رہا ہے

کیا باغ و بہار اس کا فسانہ ہے سنو تو
درویش کسی وقت شہنشاہ رہا ہے

وہ پُرزہ بھی خوشبو سے معطر ہے جو کچھ دیر
بکھرے ہوئے گُل ریزوں کے ہمراہ رہا ہے

پلکوں سے شہابؔ اس کی ستارے سے ہیں جھڑتے
خوش چشم دیا محوِ رُخِ ماہ رہا ہے

☆☆☆☆

اطہر جعفری

ناصحا، کچھ یاد کر، وعدہ خلافی چھوڑ دے
میں نے پہلے بھی کہا تھا، خود فریبی چھوڑ دے

رفتگاں کی کھوج اور آئندگاں کا انتظار
ہر گھڑی تبدیل ہوتی یہ کہانی چھوڑ دے

حاصلِ ہنگامِ دشتِ عشق ہے وہ تشنگی
جو فراتِ عصر میں موج انقلابی چھوڑ دے

لذتِ فریاد یہ منت کشِ اظہار ہے
جراتِ لب بستگی کر، لب کشائی چھوڑ دے

سوچتا کچھ اور ہوں اور سوجھتا کچھ اور ہے
بے خیالی کہہ رہی ہے، بے خیالی چھوڑ دے

روپ ہے بہروپ تیرا، ہے دغا فطرت تری
حال پر میرے، مجھے اے زندگانی چھوڑ دے

پرسشِ احوال مانگے ہے تعلق باہمی
بے سبب اطہرؔ نہیں، صحرا نوردی چھوڑ دے

☆☆☆☆

شمشیر حیدر

منفعت سے نہ سہارے سے ملا ہے مجھ کو
سب محبت کے خسارے سے ملا ہے مجھ کو

شعلہء عشق و جنوں تیرا پتہ بھی آخر
اپنے اندر کے شرارے سے ملا ہے مجھ کو

سب سمندر میں اسے ڈھونڈ رہے تھے جا کر
ایک موتی جو کنارے سے ملا ہے مجھ کو

ایک پیغام کہ خوشبو بھی جسے لا نہ سکی
تیری آنکھوں کے اِشارے سے ملا ہے مجھ کو

یہ جو دھرتی سے محبت کا یقیں ہے مجھ میں
کسی ویران ستارے سے ملا ہے مجھ کو

☆☆☆☆

علی یاسرؔ

پوری ہوئی جو ہجر کی میعاد آوے گا
قیدِ انا سے ہو کے وہ آزاد آوے گا
اُس بُت سے جی لگا نہ لگا کیا مجھے ولے
پھر کیا کرے گا جب وہ تجھے یاد آوے گا
میں تو کروں ہوں عمر بھر اک دشت کا سفر
کیا ہو گا جب وہ قریۂ آباد آوے گا
آوے گا اک سے ایک سخنور یہاں مگر
کوئی بھی میرؔ جیسا نہ استاد آوے گا
میں اُس کُوں دیکھتا ہوں تو آتا ہے دھیان میں
کس کام اس کے یہ دلِ برباد آوے گا
میں جب کہا کہ غم سے طبیعت بحال ہے
بولا وہ: روزِ حشر تُو ہی شاد آوے گا
واقف نہیں ہیں آبلے صحرا کی پیاس سے
اور سوچتے ہیں قیس پہ داد آوے گا
بازارِ ہست و بُود میں شیشہ گری مری
کوہِ جنوں بھی سر پہ مجھے لاد آوے گا

☆☆☆☆

عمران عامی

پہلے اس شہر کا سلطان کیا جائے گا
پھر مجھے بے سر و سامان کیا جائے گا
پہلے بھی کون سا خوش رہنے دیا جاتا ہے
جو مجھے اور پریشان کیا جائے گا
یہ خبر تھی مرے پر کاٹ دیے جائیں گے
کیا پتا تھا، مجھے بے جان کیا جائے گا
یہ پرندے تو کہیں اور بھی رہ سکتے ہیں
پر، درختوں کا جو نقصان کیا جائے گا
ہم بھی آزاد فضاؤں میں اگر رہنے لگے
پھر کسے زینتِ زندان کیا جائے گا
یہ جو سائے کی طرح ساتھ مرے رہتا ہے
اس فرشتے کو بھی انسان کیا جائے گا؟
عشق بھی کارِ ہوس ہے تو بتائے کوئی
کون سی بات پہ، پھر مان کیا جائے گا
یہ کسی آنکھ نے سوچا ہی نہیں تھا عامؔی
خواب سا شہر بھی ویران کیا جائے گا

☆☆☆☆

سرفراز زاہد

پہلے بچوں کا رونا بنتا ہے
تب زمیں پر کھلونا بنتا ہے

حسن کی قوس ٹوٹ جانے سے
مرا حیران ہونا بنتا ہے

ہفت افلاک کے سمٹنے سے
آنکھ کا ایک کونا بنتا ہے

اپنی پوروں سے چھو کے دکھلاؤ
خاک سے کیسے سونا بنتا ہے

ایک تصویر یوں بنائی ہے
جیسے انجان ہونا بنتا ہے

پہلے بنتا نہ تھا جہاں مصرع
اب وہاں جان کھونا بنتا ہے

☆☆☆☆

عابد خورشید

گرد چہرے سے جھاڑنا ہے مجھے
آئنے کو سنوارنا ہے مجھے

اِس لیے وقت مجتمع کیا ہے
ایک لمحہ سہارنا ہے مجھے

اے خدا اپنا کچھ ٹھکانہ کر
بوجھ سر سے اُتارنا ہے مجھے

سانس میں دفن کر چکا ہوں اُسے
اب فقط اُس کو مارنا ہے مجھے

اے فلک تھامنا مرے بازو
آج کا دِن گزارنا ہے مجھے

☆☆☆☆

سجاد بلوچ

ہزار وحشتیں لپٹی ہوئی ہیں سینے سے
پہ جی بھرا نہیں اب تک ہمارا جینے سے

کہیں خلاؤں کے پاتال میں پڑے ہوں گے
پھسل گئے جو کبھی ہم زمیں کے زینے سے

نگلنا چاہتی ہے مجھ کو یہ پہاڑ سی موج
لپٹ رہا ہوں میں اس ڈوبتے سفینے سے

پلٹ کے آگئی پھر سے ہوائے یخ بستہ
کھرچ رہا تھا ابھی برف آبگینے سے

جو مِلنا چاہو تو گزرے سمے میں آمِلنا
ہر ایک چیز دھری ہے اُسی قرینے سے

کئی دنوں سے نہیں دل کی چال ڈھال اچھی
یہ پھر سے بھاگنے والا ہے میرے سینے سے

☆☆☆☆

حسن جمیل

جب کوئی در نہ کھلا لوٹ ہی آئے ہم بھی
ڈھل گئے آخرِ کار آخری سائے ہم بھی

جہاں دیکھیں گے کسی پھول کو ہوتے پامال
رونے لگ جائیں گے دنیا کے ستائے ہم بھی

عشق میں کوئی بھی غافل نہیں رہتا نا دیر
تم سمجھتے ہو اشارے، تو کنائے ہم بھی

تیرے غم نے تو ہمیں ایسا کیا تھا روپوش
پھر زمانوں میں کہیں پر نظر آئے ہم بھی

تم ذرا بات چلاؤ تو سہی ان سے حسنؔ
پھر چلے آئیں گے دینے کوئی رائے ہم بھی

☆☆☆☆

نیر رانی شفق

ملن رُت کے حسیں سپنے ذرا تعبیر کرتے ہیں
چلو اِن چاند تاروں کو یونہی تسخیر کرتے ہیں
بنا کر چاند کو کشتی اُتر جائیں کنارے پر
بھلا ڈالیں سبھی صدمات جو دل گیر کرتے ہیں
سبھی باتیں، سبھی قصے، سبھی دکھ بھول کر اپنے
نئے قصے، نئی غزلیں کوئی تحریر کرتے ہیں
جو لفظوں اور معانی سے بہت ہے ماورا پیارے
ہے ابجد سے جو آگے وہ وفا تفسیر کرتے ہیں
بہت منہ زور ہیں دیکھو نکل جائیں نہ ہاتھوں سے
چلو اڑتے ہوئے لمحے یہیں زنجیر کرتے ہیں
حسد کی آگ کے شعلے جو بھڑکاتے ہیں اے لوگو!
جلاتے ہیں خود اپنی جاں جو یہ تقصیر کرتے ہیں
شکاری نفس بیٹھا ہے بچھا کر جال ہر لمحہ
چلا کر تیر تقوے کے اسے نخچیر کرتے ہیں
سکوتِ شب نے دکھلائے، نئے تارے تمنا کے
انھیں آنگن میں لانے کی کوئی تدبیر کرتے ہیں
روپہلی شام ہو یا ہوں سویرے ارغوانی سے
شفق رنگوں کے سب منظر مجھے تسخیر کرتے ہیں

☆☆☆☆

اعجاز حسین فاخر

جان دینی تھی مگر جان نہیں دے پایا
اپنے ہونے کا میں تاوان نہیں دے پایا
تیرے عشاق میں گمنام اگر ہوں تو سبب
دل تجھے میں علی الاعلان نہیں دے پایا
اس کی جھولی میں کئی میں نے مواقع ڈالے
پھر بھی دشمن مجھے نقصان نہیں دے پایا
وقتِ بزدل نے مری پیٹھ میں خنجر گھونپا
موت مجھ کو مرے شایان نہیں دے پایا
جس محبت کے لیے خلق کیا تھا رب نے
وہ محبت اسے انسان نہیں دے پایا
لے کے خود کو بھی مجھے گھر سے نکلنا تھا مگر
اتنی عجلت تھی کہ میں دھیان نہیں دے پایا
خون سے اپنے رقم کی ہے جو دیواروں پر
اس کہانی کو میں عنوان نہیں دے پایا
وقت پر گھیرنا تھا غیر کے لشکر کو مگر
فیصلہ وقت پہ سلطان نہیں دے پایا
جتنی ہنگامۂ دنیا سے ملی ہے فاخرؔ
اتنی وحشت مجھے زندان نہیں دے پایا

☆☆☆☆

محمد شعیب مرزا

آئینے سے سوال کرتا ہوں
خود شناسی کمال کرتا ہوں

ہاتھ رکھ کر میں نبض پر اُس کی
اپنی دھڑکن بحال کرتا ہوں

وہ مجھے روکتا ہی رہتا ہے
میں مسلسل سوال کرتا ہوں

اس کو رکھتا ہوں خوش بہر صورت
اپنا جینا محال کرتا ہوں

بات میری بُری لگے نہ اُسے
میں تو یہ بھی خیال کرتا ہوں

ایک ہرجائی کے لیے بھی شعیبؔ
زندگی کو وبال کرتا ہوں

☆☆☆☆

نصیر احمد ناصر

ونڈو شاپنگ

کبھی کبھی جب میرا دل
تنہائی سے بھر جاتا ہے
تو مَیں دنیا
تیری جانب یونہی
کچھ بھی لینے چل پڑتا ہوں
تیرے بازار میں دنیا
ریستوران ہیں، اونچے اونچے ہیبت ناک پلازے ہیں
سہ جہتی فلموں والے سنیما گھر ہیں
شاپنگ مال ہیں
شاپنگ مال جہاں پر
ایک ہی چھت کے نیچے
شیلفوں، ریکوں میں ہر چیز قرینے سے رکھی ہے
ہاتھ بڑھاؤ، لے لو
جو چاہو، جتنا چاہو
رکھ لو مال ٹرالی میں
جتنا جیب اجازت دیتی ہو

دنیا تیرے دل میں پتھر کی آنکھیں ہیں
جوان شیشوں سے شوکیسوں سے جھانکتی رہتی ہیں
جن میں مجھ جیسوں کے خواب رکھے ہیں
جینے مرنے کے اسباب رکھے ہیں
ملکوں اور زمینوں کی ہر جنس پڑی ہے
افلاک، ستارے، مہتاب رکھے ہیں
تیرے ظرفاب میں دنیا
نیلی، پیلی، سرخ، سنہری
کتنے رنگوں کی اسماک سجی ہیں
کتنے سورج زیرِ آب رکھے ہیں
کچھ چیزوں پر سیل لگی ہے
کچھ کی قیمت پوری ہے
لیکن ہر خواہش کی تکمیل ادھوری ہے

تیری "سٹاپ اینڈ شاپ" میں دنیا
میرے مطلب کی ایک بھی چیز نہیں
مجھ کو تو یہ بھی معلوم نہیں کیا لینے آتا ہوں
دنیا! تجھ کو دیکھ کے واپس مڑ جاتا ہوں
☆☆☆☆

تنویر قاضی

اندھی ڈولفن

اندھی ڈولفن
خواب دیکھتی ہے
وہ کبھی سوئی نہیں
چند قدم کے فاصلے پر
دریا کنارے
بد فعلی کا شکار ہونا اُسے
خون کے آنسو رلاتا ہے
وہ ایک دن
دل کی کھڑکی بند کر کے
ریت پر نیند اوڑھ لیتی ہے
کبھی نہ جاگنے کے لیے
ایک نئی ڈولفن پر
بیوپاری کی رال ٹپک رہی ہے
دریا کا دروازہ نہیں ہوتا
اور
اس پر مگر مچھ بھی فریفتہ ہیں

(نثری نظم)

انجم سلیمی

قوما

میں ازل سے ابل کے تعاقب میں ہوں
جلتی بجھتی ہوئی دودھیا روشنی
آگے چلتی ہوئی اک جگہ رک گئی
آنکھ دھندلا گئی
سانس کا شور سینے میں مدھم ہوا
رابطہ خود سے بھی، تجھ سے بھی کٹ گیا
مسئلہ کیا ہوا
کیا میں تیری خدائی کی حد میں نہیں؟
اُف خدایا یہ میں کس جگہ آ گیا!
اس جگہ تیرے سگنل نہیں آ رہے---

☆☆☆☆

احمد لطیف

دانہ و دام کا قصہ

پہلے جوتوں کی فکر تھی، اب گاڑی کے ٹائروں کا غم کھائے جا رہا ہے
ڈھول، دُھوپ اور ’’چکّو‘‘ سے بچنے کے لیے مجھے کیا کیا چھوڑنا پڑے گا
اپنا گھر چھوڑا، کراچی کا ہو لیا، پھر لاہور نے بلایا اور اب اسلام آباد میں ہوں
سمندر سے پہاڑوں تک کا سفر چھوٹی سی زندگی میں کر لیا
میں دریا کا بیٹا تھا اور پورس کے ساتھ رہتا تھا
دانا دُنکا انسان کو پرندہ بنا دیتا ہے
پَر تو ہر ایک کے پاس ہیں اور وقت پڑنے پر
شکل بدلتے رہتے ہیں
ہاتھ پتوار بھی ہیں اور تلوار بھی
کب پھڑ پھڑائیں گے اور کب لہرائیں گے
یہ دانہ و دام کا قصہ ہے
ناخوشی اور ناشکرا پن ایک ساتھ رہتے ہیں اور مجھے بے چین رکھتے ہیں
میں ازل کا شکر گزار، گلہ گزاری کے ہتھے چڑھ کر ناشکرا بن بیٹھا اور اب
دھکے کھا رہا ہوں

☆☆☆☆

ڈاکٹر نثار ترابی

ملی گیت

سورج چمکے بن کر تیری گلیوں کا بنجارا
تیرا جوگی ہو کر نکلے، شام کا پہلا تارا
تُو ہے مان ہمارا----
تری شامیں، خوشبو تھامیں، نَس نَس جوت جگائیں
تیرے نام پہ قریہ قریہ پھیل گیا، اجیارا
تُو ہے مان ہمارا----
تیری دُھن میں رنگ جمائیں، چار سُروں کے پالے
تیری موج میں گاتا جائے، تیرا راوی دھارا
تُو ہے مان ہمارا----
کیوں نہ تیری آن ہمیں ہو، اپنی جان سے پیاری
ہم نے ڈوب کے دریا دریا، تیرا نقش ابھارا
تُو ہے مان ہمارا----
تیرے خواب سجا کے پلکیں، قوس قزح شرمائیں
تیری مٹی کو چُومے تو جگنو بن جائے تارا
تُو ہے مان ہمارا----
تُو آنکھوں میں ٹھہرا سپنا، تجھ پہ نازاں جیون اپنا
تو ہی ناؤ، تو ہی دریا، تو ہی آس کنارا
تُو ہے مان ہمارا----

☆☆☆☆

رفعت اقبال

یا ساحرۃ العرب

مرا دل کہہ رہا ہے
نجد کے دشتِ بلا سے جو صدا آئی
اُسی کی تھی
عرب کی ساحرہ
جس نے بنو عامر کی رسوائی کا ساماں کر دیا
جادوگرِ امروز و فردا ساحرہ لیلیٰ
کسے اب ڈھونڈتی پھرتی ہے
خواہش کے بیاباں میں کسے آواز دیتی ہے
جنوں انگیز لہجے میں
کہیں میں تو نہیں
مجنوں خراباتی
جسے اک موجِ سرشاری میں
دل کی لغزشِ پا
جانبِ شہرِ نگاراں لے کے آئی تھی
اور اب اک منزلِ امکاں کے رستے میں
صدا زنجیر بنتی ہے

مری آنکھیں طلوعِ ماہ کے جادو میں جکڑی
التباسِ خواب کا منظر بناتی ہیں
فراموشی فزوں تر ہوتی جاتی ہے
ذرا گویائی باقی ہے
ابھی کچھ دیر پہلے شہر بصرہ میں
حسن اور صاعقہ اک دوسرے کے بازوؤں میں
جان دیتے تھے
بموں سے پھوٹتے ٹکڑوں کے گھاؤ
خوں اُگلتے تھے
تمھارے قیس پر جب سنگ برسے
ریشمی مخمل کے پردوں سے لگی
تم اشک روتی تھیں
زمانہ آج تک ان کی تجارت سے تونگر ہے
گریزاں رکھ کے مخمل کو
جسے حُسنِ بیابانی کی چاہت کا
بنایا تم نے زندانی
ہوا آزاد وہ جذبِ تخیل میں
اُسے کوئی خبر تھی کیا
گُلِ زخمِ ملامت سے ابد کا باغ مہکے گا
اساطیری کہانی میں سرافرازی لکھی

بختِ محبت نے
مگر یہ تن دریدہ عاشقانِ نو
اجل کی گود میں ہم وصل ان پاکیزگی زادوں کو
آخر کس کہانی کا جلی عنوان ہونا ہے
فقط اخبار کی چھوٹی خبر
سکرین پر اک عکس کی صورت
مرے آنسو بھی ارزانی
لہو ان کا بھی ارزانی

☆☆☆☆

شہزاد نیرؔ

دنوں کا دُکھ

عجب دن آپڑے ہیں
بوڑھی صدیاں رو کر دیکھتی ہیں
صبح کے کاندھے پہ پھولوں کے جنازے ہیں
نہ اِن کا بوجھ اٹھتا ہے
نہ آنکھیں نم اٹھا کر دو قدم چلتی ہیں
سکتہ ہے۔۔۔ سکوتِ مرگ سے بھی سخت سکتہ
سسکیوں کی راہ کو مسدود کرتا ہے
عجب سکتے کا پتھر ہے
دنوں کو توڑتا گھایل دلوں پر آپڑا
اب جو کسی کی چیخ سے دو نیم بھی ہوتا نہیں
کب سے یہاں سورج نہیں نکلا

کتابوں میں لکھے الفاظ مجھ سے پوچھتے ہیں
وقت کی تقویم میں کیسے یہ کالے دن لکھے تھے
روشنی کے نام پر آکر اندھیرے روشنی کا قتل کرتے ہیں
مقدس جسم اُدھڑتے ہیں

تو وحشت کے پرانے پتھروں کے واسطے یعنی نئی پوشاک سلتی ہے
عجب دن آ پڑے ہیں
وقت کی تقویم سے باہر کے دن ہیں
اور مرے شانوں پہ رکھے ہیں
نہ ان کا بوجھ اٹھتا ہے
نہ آنکھیں نم اٹھا کر دو قدم چلتی ہیں
سکتہ ہے ----

☆☆☆☆

ڈاکٹر ضیاءالرشید

دو ہاتھوں کا کھیل

دو ہاتھوں کا کھیل ہے سارا
سُر سے تال کا میل ہے سارا
دو ہاتھوں کا کھیل ہے سارا
گوری باورچی خانے میں
جھوٹے برتن مانج رہی ہے
سانول باہر تپتی دھوپ میں
کھیت سے چارا کاٹ رہا ہے
درزی بیٹھا باریکی سے
سوئی میں دھاگا ڈال رہا ہے
کوزہ گر کی چابک دستی
اپنے منہ سے بول رہی ہے
تکڑی سب کچھ تول رہی ہے
لکڑی کی بندوق اُٹھائے
بندر فوجی بنا ہوا ہے
بچے تالی پیٹ رہے ہیں

☆☆☆☆

حفیظ اللہ بادل

وصال رُت

غموں کی شاخوں
پہ زرد پتوں سے تھوڑا پیچھے
جو پھل لگے ہیں
فراق لمحوں کے رتجگوں سے
یہ پک چکے ہیں
انہیں نہ توڑو
کہ ان پھلوں سے
حسین رنگوں کی تتلیوں نے
فراق لمحوں کے زرد رنگوں
کو لے کے گنگا میں ڈالنا ہے
وصال رُت کو اُجالنا ہے

☆☆☆☆

عنبرین صلاح الدین

نقش

دِن میں دِن اِک اور بنایا
سُورج کو دو حصوں میں تقسیم کیا
پھر جاتے پہر میں، دِن کو کھینچ کے
سُورج کے دونوں ٹکڑوں کے بیچ رکھا
اور اُس کے جلتے دِل پر اپنا ہاتھ دھرا
اُس کے تپتے تن کے چاروں جانب چکر کھاتے کھاتے
اپنے من کو راکھ کیا
اور راکھ میں چند لکیریں کھینچیں!
گزرے دِن کو،
آنے والے اندھے دِن کو،
اپنے خواب میں روشن دِن اور
خود سے ہر پَل اوجھل دِن کو،
چاروں پہروں کے دو رویہ پُل سے جوڑا
خود کو وقت کے سارے کونوں تک پہنچایا
اپنا نقش کہیں نہیں چھوڑا!

☆☆☆☆

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

مگر میں کیسے پرسہ دوں؟

مرے کانوں میں چیخیں ہیں
مری آنکھوں کے تاروں کی
وہ جن کے کھیلنے کے دن تھے
لیکن ظالموں نے ان سے کیسا کھیل کھیلا تھا
مری آنکھوں میں منظر ہیں
بہت سفاک سے منظر
کہیں بکھری کتابیں ہیں
کہ جن پر موت لکھی ہے
کہیں بستہ ہے کاپی ہے
کہ جن پر خون کے دھبے
رُلائیں خون کے آنسو
کسی منظر میں مائیں، بین کرتی ہیں
کہیں پھولوں کی لاشوں پر
بہت سے پھول رکھے ہیں
مجھے ماؤں کی چیخیں رات بھر سونے نہیں دیتیں
مجھے پرسہ تو دینا ہے

مجھے ان سب دکھوں کو اپنی نظموں میں سمونا ہے
مرے آنسو بھی حاضر ہیں
مری یہ نظم نذرانہ
مگر میں کیسے پرسہ دوں
خدایا میں بھی تو ماں ہوں
سو ماں کا دکھ سمجھتی ہوں

☆☆☆☆

سید مظہر مسعود

پانی کی کہانی

بہت سی سیپیاں آپس میں
روزوشب اُلجھتی ہیں
ہرے خوابوں کی کشتی
پانیوں پر تیرتی ہے
اور تعبیروں کے تازہ خواب بُنتی ہے
ذرا سی پانیوں کی جنگ جاری ہوگئی
تو پھر
لہو کی جنگ میں تبدیل ہو جانے کا خطرہ ہے
نئے لوگوں کی دنیا میں
خدا اور ناخدا کے درمیاں کیا ہو رہا ہے
یوں!
سمندر کو، بہت پیاسے
کسی صحرا نے خط لکھا
مرے آنسو
ترے دامن کے موتی بن رہے ہیں
موتیوں سے وصل کی تخلیق کرنی ہے
سمندر دیکھ!

تیرے ہر کنارے پر
جلی الفاظ میں آدم کے بیٹوں کی
کہیں پائی گئی حوا کی بے بس بیٹیوں کی
داستاں لکھی ہوئی
صحرا سمندر کی سنی جو گفتگو
تو آسماں بولا
مجھے معلوم ہے سب کچھ
کہ میرے کیمروں کی آنکھ
سارے زاویے محفوظ کرتی ہے
خیالِ آدمی کی ہر نئی پرواز سے پہلے
کسی آغاز سے پہلے
کسی انجام سے پہلے
تمھاری زندگی کی
ہر طلوع و شام سے پہلے
وہ ساری پیاس پانی کی کہانی
ابتدا سے انتہا تک
اور
کسی معصوم ایڑی کی رگڑ سے
ہر زماں کی پیاس تک
میری نظر میں ہے

☆☆☆☆

سرفراز شاہد

قطعات

ماڈلنگ

فن کے چکر میں دخترانِ پاک
آج کل ماڈلنگ بھی کرتی ہیں
اور موقع ملے تو چپکے سے
یہ ”منی لانڈرنگ“ بھی کرتی ہیں

فیملی پلاننگ

ضبطِ تولید پر عمل کر لے
ورنہ جاں کی امان مانگے گا
پیدا ہوگا جہاں میں جو بچہ
روٹی، کپڑا، مکان مانگے گا

ٹیکس

اہلِ فن پڑ گئے ہیں چکر میں
جن کے کسبِ کمال پر ہے ٹیکس
مالِ رشوت پہ کچھ نہیں لگتا
صرفِ رزقِ حلال پر ہے ٹیکس

عدم برداشت

اب ختم ہو چکی ہیں تحمّل مزاجیاں
مہر و وفا کا واقعی فقدان ہو گیا
ہم نے جسے بھی پیش کیا دستِ دوستی
وہ شخص ہم سے دست و گریبان ہو گیا

بنامِ گوشت

ضابطے جو تھے شرافت کے وہ توڑے ہم نے
گند کو بیچ کے پیسے ہی بٹورے ہم نے
خرتو خر ہیں یہاں کتے بھی نہ چھوڑے ہم نے
قوم کے پیٹ میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

☆☆☆☆

نیلم احمد بشیر

وقت

دل میں کیسے کیسے خنجر لگتے ہیں   کل کے عاشق آج کے بندر لگتے ہیں
قومی بچت کے دفتر بڑھے جاتے ہیں   اپنا منتھلی خرچ وہاں سے لاتے ہیں
ہم بھی گئے تھے لینے کل کچھ سرمایہ   وہیں پہ وہ ظالم ہم سے آ ٹکرایا
گنجا تھا اور ہاتھ میں اس کے سوٹی تھی   پہلے سے تو میں بھی ویسے موٹی تھی
اک دوجے کو دیکھا تو ہم ڈر سے گئے   دل میں سوچا یہ تھا جس پر مر سے گئے
چہرے پہ ہم دونوں کے ہی جھریاں تھیں   دیکھ کے چلتیں دل پہ سوسو چھریاں تھیں
پیٹ بڑا تھا ڈھیلی تھی اس کی پتلون   ہو گیا میرے مردہ ارمانوں کا خون
اُس صبح میں نے سر میں تیل لگایا تھا   مہندی سے بالوں میں رنگ جمایا تھا
لگ رہی کسی ایکٹریس کی ممی تھی   بعد از لنچ کچھ اور بڑی میری ٹمی تھی
اک بابا چلتے میں دائیں کو جھولتا تھا   ایک کو سائن کرتے نام ہی بھولتا تھا
کچھ بابوں کے ابھی اوریجنل گھٹنے تھے   کچھ مائیوں کے فِگر جگاتے فتنے تھے
میں نے ہی بے چارے کو تب چھوڑا تھا   جانے کیوں اک پیار بھرا دل توڑا تھا
ویگن میں وہ مجھ سے ملنے آتا تھا   ریٹرن کرایہ یاد سے لے کر جاتا تھا
بچوں کے بچوں کا حال ہی پوچھ لیا   ایک کے بعد اک بور سوال ہی پوچھ لیا
آرتھرائیٹس کی کوئی نئی دوا آئی   پیار بھرے دو دلوں سے ایک صدا آئی
پوچھا کتنی شوگر ہے تیری جاناں   میں نے کہا تم نے بھلا کیسے پہچانا
کہنے لگا ظالم ہے سویٹی وقت بڑا   میں نے کہا چل فلرٹ نہ کر ہو دور کھڑا

ہارٹ اٹیک نہ خود کو تم کروا لینا   بلڈ کا پریشر ہی نہ کہیں بڑھوا لینا
خواہشیں اور جذبے بھی تو اب بڈھے تھے   قدم قدم پہ لگتے سو سو ٹھڈے تھے
واکر سے پھر اس نے میرا پاؤں چھوا   وہ تو سُن تھا مجھے لہٰذا کچھ نہ ہوا
پیسے لینے لائن میں گھنٹوں کھڑے رہے   نینوں میں پر نین ہمارے گڑے رہے
درد سے میرا گھٹنا بالکل کھڑک گیا   وہ سمجھا میرا دل اسے دیکھ کے دھڑک گیا
میں نے کہا سن سجنا اب میں بیوہ ہوں   خشک سہی پر وچوں مٹھا میوہ ہوں
بولا میں نہ سمجھ سکا کیا تم نے کہا   سوری سویٹی اب ہوں ذرا اونچا سنتا
ملا جب اس کو کیش تو اس کا فون بجا   من موہنی سی سمائل سے اس کا فیس سجا
کہا، میرا ڈرائیور آیا سی یو، بائے بائے   میں نے کھڑکی سے جھانکا تو کی ہائے ہائے
پیاری سی اک لڑکی گاڑی سے نکلی   lets go darling کہہ کر اس سے چپک گئی
بٹوہ اس کے ہاتھ سے جھٹ پٹ تھام لیا   دھیرے سے پھر پیار سے اس کا نام لیا
ٹاٹا کیا ظالم نے اور منہ موڑ گیا   ہائے کمینہ بندر مجھ کو چھوڑ گیا
دل میں کیسے کیسے خنجر لگتے ہیں   کل کے عاشق آج کے بندر لگتے ہیں

☆☆☆☆

ڈاکٹر عزیز فیصل

وصل کی نوبت نہ آئی عید پر
ون ٹو ون وہ ہو نہ پائی عید پر

اس کا منگیتر گلے مجھ سے ملا
ہو گئی جس کی سگائی عید پر

پھر سے نومولود کا چکر نہ ہو
پھر وہ لایا گھر میں دائی عید پر

بابا جی سے جپھی ڈالے باغ میں
لڑ رہی تھی اس کی مائی عید پر

لفٹ میں اس وقت دونوں ہم ہی تھے
لفٹ اس نے جب کرائی عید پر

میں نے دو مَن کی بشیراں کی طرف
ڈھائی من بھیجی مٹھائی عید پر

ہیر کو رانجھے نے بھیجی جون میں
تحفتاً وکی رضائی عید پر

خرچ کر ڈالی اناڑی قیس نے
اے ٹی ایم کی پائی پائی عید پر

ہیں تمھاری تاک میں ابا حضور
اس کی یہ ای میل آئی عید پر

☆☆☆☆

محمد عارف

قطعات

ٹھیکے دار

سڑکوں کا جنجال بنا کر چلا گیا
پہلے سے بے حال بنا کر چلا گیا
جی ٹی روڈ کو مال بنانا تھا جس نے
جی ٹی روڈ سے مال بنا کر چلا گیا

ریاضت

ریاضت سے نکھار آتا ہے فن میں
عیاں یہ بات ہم پر ہو گئی ہے
تواتر سے جو لکھتا تھا فسانے
لکھائی اُس کی بہتر ہو گئی ہے

سپروو مین

گرنیڈ ہے اک ہاتھ میں اک ہاتھ میں گن ہے
انداز سے لگتا ہے کہ فلموں کی ولن ہے
معصوم سی صورت ہے نہ نازک سا بدن ہے
یہ عام سی لڑکی نہیں گھسان کی رن ہے

لوڈشیڈنگ کے فائدے

دیکھے جو دانت صاف تو سب پوچھنے لگے
لائے ہیں آپ کون سا منجن حکیم سے
کیسے بتاؤں رات جو بجلی چلی گئی
میں دانت صاف کر گیا شیونگ کریم سے

ایجازِبیاں

یہ پنجابی کا اعجازِ بیاں ہے
بھلے چنگے کو بھی کہتے ہیں ‘‘مُنڈا’’
مِرنڈا لکھ کے چٹ بھیجی دکاں پر
ملازم دے گیا آ کر مرُنڈا

ایمان سے----

دل دھڑکتا ہے اک روانی سے
جسم کو تازہ خون ملتا ہے
میکے ہوتی ہے جن دنوں بیگم
کتنا ذہنی سکون ملتا ہے

☆☆☆☆

ذکاءالرحمٰن

کشف الکتاب

وِچار 1

واپسی کا عمل، کوانٹم میکانکی عمل تھا۔

واپسی کے رَستے کے علاوہ کوئی دوسرا رَستہ، آنکھوں کے جوہری اور زیرِ جوہری ذرّوں میں، جاگتا ہی نہ تھا۔

اُس نے، قبل از تاریخ زمانوں کے کسی خُداوند جیسے طاقتور، عظیم، جلالت مآب، نیلگوں سمندر کو اپنا پُورا بازو اُٹھا کر الوداع کہا، اور اُس باوقار آنکھوں والے روشن چہرا مچھیرے کو جو گہری ہوتی شام میں اپنا جال لپیٹ رہا تھا ـــ الوداع، سُنائی دینے والی آواز میں تھا یا خاموش لفظوں میں، یہ اُسے یاد نہیں رہا تھا۔ اُس نے اپنی پیٹھ سمندر کی طرف موڑی اور چل پڑا ـــ ایک متعیّن ہل جُل اور ایک مقرّر گردان اور ایک صَرفی نَحوی قانون، نہ بدلنے والا ـــ کہ فعلِ لازم وہ فعل ہے جو فقط فاعل پر پُورا ہو جائے جیسے وہ آیا، وہ گیا۔

وُہ زمینی رقبہ جو اُس کے اور شہر کے درمیان تھا، اُس کے سامنے قدیم جغرافیائی نقشے کا ایسا پھیلا ہوا تھا اور اپنی ماحولیات کی مختلف کیفیتیں، لحہ لحہ، دِکھاتا تھا ـــ کبھی خشک، بانجھ عورت کے رحم کی طرح؛ کبھی تلخ رُو، بے گناہ قیدی کے چہرے جیسا؛ کبھی اُونچا نیچا، جیسے انسانی زندگی کی مثال دے رہا ہو؛ کبھی پتھریلا، گویا احساس سے خالی ضمیر سامنے بچھا ہوا؛ کبھی ویران، رُوح سے عاری وجود کی تصویر بناتا ہوا ـــ وُہ، لفظوں کا جولاہا تھا۔ اُس نے اِس جادوئی ساکت علاقے میں بھی ڈھنک ڈھنکا کر اپنی ٹیڑھی میڑھی گذرگاہ تراش لی، اور چنگڑوں کے سَر فخر سے اُونچے کر دیے، صدہا سال سے

زبردستوں کے برستے جُوتوں کے نیچے جُھکے ہوئے پلپلے سَر۔ اِس لیے کہ اُس کا نام متھیلا چنگڑ ہے ـــ وُہ اَگڑ بگڑ ڈنگر ہے، وُہ متھیلا چنگڑ ہے ـــ بھئی کی آکھیا اوہدا ناں ـــ؟

شہر، ایک مُوتری سے شروع ہوتا تھا ـــ کائی کھائی اینٹوں والی، پیشاب کی تیزابی بُو سے بھری، ایک آٹھ ضرب دَس مستطیل جو شہر کے مَرکھپ گئے مسلمان اور پارسی اور عیسائی اور ہندو باپوں نے اپنے شہری بیٹوں کی موجود اور آئندہ نسلوں کے کمزور مثانوں کی آسانی کے لیے، کسی بُھولے بسرے سالِ عیسوی میں تعمیر کروائی تھی ـــ عبداللہ شاہ غازی کے بلند مزار سے دو تین سو گز اِدھر، ساحل کی گیلی ریت پر، جامد چٹانی دہشت والا یہ منطقہ شروع ہونے سے ذرا پہلے۔

سمندر کی نمکین گیلی ہوا، اُس کے مثانے میں مائع ہو چکی تھی اور اُس کا مضبوط مثانہ بھی اِس بھاری مائع کے دباؤ سے رہائی مانگ رہا تھا۔ وُہ شہر کے مَر کھپ گئے باپوں کا ممنون ہوا اور مُوتری میں داخل ہو گیا۔

شہر کی گلیوں میں اور سڑکوں پر شخصی کرداروں والا ناٹک پیش ہو رہا تھا، پرانی دستاویزی مُووِیز کا دھندلایا مُونتاژ—— شہر میں رہنے والے اور شہر میں چلنے والے، گذشتہ صدی کی تیسری دہائی کے مُووی کیمروں کی جھٹکوں سے حرکت کرنے والی مضحک شبیہیں؛ الیونی بھوتوں کا ریوڑ، جس کا چرواہا کوئی بد نشے میں مست ابلیس۔ سارا شہر، نادم شکلوں اور مفعول سوچوں سے لبالب۔ موت کے قریب ڈولتی، دھیرے دھیرے فنا ہوتی ہوئی اُشرافیہ۔ ہر لحہ ایمان بدلتے دانشور اور ادیب اور شاعر اور صحافی؛ ترقّی پسند، اسلام پسند، آزاد خیال، وطن پرست، دائیں بازو والے، بائیں بازو والے، خود ہی سول سوسائٹی اور خود ہی تعلیم یافتہ جاہل سول سوسائٹی کے نیتا۔۔۔ اقتدار کا ٹھرّا چڑھا کر، ریاستی دبدبے والے ایوانوں کی غلام گردشوں میں اور ایکڑوں ایکڑ پھیلے مکانوں کے سنسان برآمدوں میں اپنے شیطانی قہقہے اُچھالتے مقتدر نو دولتیے؛ باہر سے مشہور، اندر سے سوزاک اور آتشک میں مبتلا نسوانی فیشن ماڈلز کے سَودے چُکاتے، کوکین کے عادی چرب زبان دلّال؛ عبرتناک زوال کے کنوئیں میں نیچے جاتی تنگ سیڑھیوں پر تیزی سے اُترتی ہوئی، بچی کھچی تہذیبی اخلاقیات؛ اپنی ذات کی مجہولیت اور اپنی صفات کی شیطنت پر فخر کرنے والے یہ سارے عام و خاص؛ اپنے ہاتھ پیر خود باندھ کر، وقت کے پانیوں کے نیچے، اپنی احمقانہ تیراکیوں کے پھوکے شعبدے دیکھ کر اور دِکھا کر خوش ہونے والے یہ سب لوگ؛ ساحلی بندرگاہی شہر کے یہ تمام کے تمام، باہم آقا و غلام باشندے——اِن کے اُوپر، بے بارش گجتے بادل نادیدہ منجمد حرکت کرتے ہیں اور اِن کی ساکت تقدیروں کے حاکم فرشتوں نے سُورج سماوی نظام کے اِس خاکی آبی ٹکڑے کے اِس ساحلی بندرگاہی منطقے پر، حکمِ خداوندی کے تحت، بے حرکتی کا نظام پھونک دیا ہوا ہے۔۔۔ جب کہ اُس کا نام مٹھیلا چنگڑو ہے، وہ اُنگڑو بنگڑو ڈنگر ہے، وہ مٹھیلا چنگڑو ہے، بھئی کی آکھیا اوہدا ناں؟۔ سچّی سَوں رَبّ دی اُس کا نام؟۔

مٹھیلے چنگڑو نے اپنی رفتار بڑھا دی——وہ، دُکانوں اور دفتروں اور ورکشاپوں اور فیکٹریوں اور کُتب خانوں اور یونیورسٹیوں کے سامنے سے تیز قدم گذر رہا تھا۔ شُکر گذار وجود جب آلائشوں کے سامنے سے گذرتے ہیں تو سَر جُھکا کر، جسم سمٹا کر جلدی جلدی گذرتے ہیں تا مبارک رُوحوں والے علّیین اور فاسد رُوحوں والے سجّین کے خدا سے مناجات کی جا سکے کہ دورِ امتحان میں ڈالے گئے ہم رذیل و حقیر چنگڑو فقیر، جنہیں وقت کے مختلف بُعدوں کے مابین سفر کرنے کی نوکری دی گئی اور ہر وضع کا لباس پہننے کی اجازت مرحمت ہوئی، ہم پر رحم اور رحمت کا سایہ مسلسل برقرار رکھا جائے اور ہمیں یہ جاننے کا قوتیہ عطا ہو کہ کتاب کیا ہے اور کیوں ہے اور کہاں ہے اور کس منطق سے ہے؟

ہم نے، ساحلی بندرگاہی شہر میں اپنی تین بُعدوں والی عاقل و بالغ پیدائش کی خوشی منائی ہے اور یک

چادر لباس پہنا ہے اور اِس کی رنگت، صحرائے مروٹ کے نخلستانوں میں اُگنے والے تربوزوں کی رنگت جیسی ہے۔ ہم، قدیم وقتوں میں رہتے چلے آئے ہیں، حال کے وقتوں میں رہتے چلے جائیں گے، آئندہ کے وقتوں میں رہنا جاری رہے گا۔۔۔ کہکشاں در کہکشاں، عظیم سمندروں سے عروس البلاد ساحلی بندرگاہی شہروں تک، پُرجلال دریاؤں سے اُونچی عمارتوں والی چمکتی دمکتی میدانی آبادیوں تک جہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہے، شانت بہتی نہروں سے رونقوں بھرے مضافاتی قصبوں تک—اِلّا ھُو کہ ہم پر اختیار کی نوازش کی گئی، اور انتخاب کی آزادی کی۔ اِلّا ھُو کہ ہمارے لیے وقت کو وسعت دے دی گئی اور ہمیں زیرِ حکم کر دیا گیا۔۔۔ ہم چلتے پھرتے ہوں یا سوتے جاگتے ہوں، ہمارے ذہن کے باغوں میں سارتر کی ملحد وجودیت کا طُوطی شاخ شاخ ناچ رہا ہو یا اقبال کا مدنی عشق اپنی الہامی لے کی نغمگی ہر پتے کی رگوں میں اُتار رہا ہو، ہماری اُنگلیوں میں ہمارا قلم علمِ نافع کی روشنائی سے لبریز ہو کر منطقیات کی زبور رقم کر رہا ہو یا تشکیک اور سوال سے ہمبستری کی لذت بھری شاستر لکھ رہا ہو، ہمارے لیپ ٹاپ کی سکرین کا برقیاتی صفحہ ہمارے لفظوں سے بھرا ہو یا بالکل خالم خالی سفید ہو، ہم پر القائی مسکنت کی شیرینیاں نزول کر رہی ہوں یا ہمارے جسم میں شہوتی خروش شور مچا رہا ہو۔۔۔ ہم زیرِ حکم ہیں۔ شکر کہ ہم زیرِ حکم ہیں۔ بے شک کہ مبارک تھا وہ لمحہ جب ہمیں حکم کے تحت کیا گیا۔

وہ تیز قدم گزر رہا تھا۔ کبھی کبھی، کہیں کہیں ایسا ہوتا تھا کہ دُکانیں اور دفتر اور ورکشاپ اور کارخانے اچانک اپنی قطار توڑ کر کسی مَرجیو نے درخت کو یا چھپکلی کے پیٹ کی رنگت والی گھاس کے مکھیوں بھرے قطعے کو جگہ دے دیتے تھے یا کسی چوڑی اُتھلی نالی نما کنکریٹ گزرگاہ کو جو ایک دوسرے پر اَغلام باز سؤروں کی طرح چڑھے ہوئے فلیٹوں کی چار دیواری تک پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔ متھیلا چنگو چلتے چلتے ایک ایسی ہی گزرگاہ پر مُڑ گیا۔

چار دیواری کے حصار میں، ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے اِن لُوطی متجّر سؤروں کا اجتماعی نام ''انگلستان'' تھا۔۔۔ شہر کا دوغلا ضمیر ایک حرامی گرامر کو، ایک پلید صَرف ونحو کو پیدائش دے رہا ہے۔۔۔ ایک بدشکل اور مکروہ اور قے آور گرامر جو ہر زبان کے ہر لفظ کے ماتھے پر ''ال'' کا بڈو ونّام زبردستی لٹکا دیتی ہے۔۔۔ اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اُس کا نام متھیلا چنگو ہے، کہ وہ اگو بگو ڈنگر ہے۔ اور وہ یہاں کے ایک لوطی متجّر سؤر کے پیٹ میں رہتا ہے۔ گھومتا زینہ، ہر سؤر کے سینے کو چھوتا چھوتا، سب سے اُوپر والے لُوطی متجّر سؤر کے پیٹ تک جا پہنچتا ہے۔

گھومتا زینہ—احتیاط، آہستہ، قدموں کی چاپ کلیپروں تلے دم بند۔۔۔ متھیلے چنگو نے اور مس نینسی لوبو نے گذشتہ تین چار ماہ سے کرایہ ادا نہیں کیا اور گھومتا زینہ اُس لوطی متجّر سؤر کے سینے کو مَس کرتا گزرتا ہے جس کے پیٹ میں بوڑھی گجراتن رہتی ہے۔ یہ تمام لُوطی متجّر سؤر، اُس بوڑھی گجراتن کی ملکیت کے باڑے میں قید ہیں، اور باڑے کے چاروں طرف قدِ آدم سُرخ اینٹوں والی چار دیواری ہے۔ اگر قدموں کی چاپ کا ایک

چھوٹا سا ٹکڑا بھی اُس کے سماعت کے آس پاس جا گرا تو اپنے مہندی رنگے بالوں کے ساتھ اور طوطا ناک کے ساتھ اور نفرت سے سکوڑے ہوئے مچھلی منہ کے ساتھ اور نا قابلِ برداشت بغل گندھ کے ساتھ اپنے کمرے سے باہر آ کھڑی ہوگی۔ کرایہ ادا نہ کیے جانے کی پُوری تاریخ بیان کرنے کے بعد، اپنی کھرکھراتی آواز میں، متھیلے چنگو اور مس نینسی لوبو کو اور ان کی اگلی پچھلی نسلوں پر، نیم گجراتی، نیم اُردو، فحش تبرّے بھیجے گی۔

بلّی قدم، بے چاپ سانپ چال۔ بے آواز چڑھائی کے باوجود سانس سینے میں ضبط۔ اعصابی گھبراہٹ لمحے، بدن پر اور ذہن پر گرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے شہاب ثاقب — آخرِ کار متھیلا چنگو اپنے سؤر کے پیٹ میں باعافیت پہنچ گیا۔

انسانیت کے ابتدائی زمانوں کے دیوتا جیسے جلیل و جمیل سمندر سے لے کر کوٹھی متحجّر سؤر کے پیٹ تک کا سفر ہمیں تھوڑا بہت سُستانے کی مقدرت بخش رہا ہے — وہ لکھنے کی میز نما تختے پر پڑے ہوئے قلم کے ساتھ پڑی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا کی طرف لپکا۔ ڈبیا میں سالم سگریٹ ایک بھی نہ تھا، صرف دو بجھائے ہوئے ٹوٹے تھے جو صرف چار کش اعصابی استراحت دے سکتے تھے۔ اُس کے گرسنہ منتظر پھیپھڑوں نے چار کش استراحت کھینچ لی اور جب فلٹرز میں مزید سُلگنے کی استطاعت ختم ہو گئی تو اُس نے پچکے ہوئے فلٹر کو دیسی صابن کے اُس خالی ڈبے میں پھینک دیا جس کو وہ کوڑے دان کے طور پر استعمال کرتا تھا۔۔۔ شکر کہ مس نینسی لوبو ابھی تک نہیں آئی۔ مکمل اعصابی سکون حاصل کرنے کے لیے، نینسی کی آمد تک، ایک مثالیہ طویل وقفہ۔

وہ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ پلنگ بھی ضرورت کے مطابق چوڑا نہیں تھا۔ ایک تنگ پلنگ، کسی بھی وقت ٹوٹ کر فرش پر گر جانے والی لکڑی مونجھ خود کی گئی ترکھانی کوشش۔ کسی ہوئی مونجھ میں چُبھتے ہوئے اُبھار جو مباشرت کے سارے دورانیے کو آسنوں کی تبدیلی کا اور اپنی ترکھانی کو دی گئی زیرِ لب گالیوں کا دورانیہ بنا دیتے تھے۔ کبھی کبھی یہ گالیاں وہ بدن زبان بن جاتی تھیں جو شہوتی مرد اپنے نیچے پڑی عورتوں سے بولتے ہیں۔ نینسی لوبو کو یہ بدن زبان بہت پسند تھی۔ نینسی کہتی تھی: ہم کیتھولک عیسائی لوگ اپنے پُرکھوں کے زمانے سے ساحلی بندرگاہی شہروں میں رہتے چلے آئے ہیں۔ میرے بڑے بھی گوا سے اِس ساحلی بندرگاہی شہر تک آئے ہیں۔ ہم ساحلی بندرگاہی عیسائیوں کی عورتوں میں یہ بات مشہور ہے کہ سرشاری کا ذائقہ کبھی شاعری بولتا ہے اور کبھی گالی بکتا ہے، سرشاری کے اِن ذائقہ دار لمحوں میں دونوں اچھے لگتے ہیں، کبھی کبھی گالی زیادہ اچھی لگتی ہے، شہوت کی انتہا شعر ہے اور شہوت کا تشدد گالی ہے۔ ہم نے بھی مس نینسی لوبو کو آگاہ کیا ہے کہ ستلج کنارے کی جانگلیاں چاہے کتنی بھی شہرائی جائیں شہوت کا تشدد پسند کرتی ہیں اور جانگلی لڑکیوں کی پیٹھ میں اُترنے والا شہوت رس صرف غدودوں سے نہیں وجودی روح کی سطحیہ سے اُترتا ہے۔

متھیلے چنگو نے تنگ پلنگ کے سرہانے کی طرف، ذرا بلندی پر، دیوار کے اُس ٹکڑے کو دیکھا جس پر ایک پرانا پِن اَپ پلے بوائے پوسٹر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیلا مدھم پڑ رہا تھا — ٹینیسی دریا کے

کنارے پر ایک آبنو بدن افریقی امریکی لڑکی اپنی رانیں کھولے لیٹی تھی اور اُس کا، لمبے ناخنوں والا ایک ہاتھ اُس کے عُریاں پیٹ پر پڑا تھا۔

پلنگ پر بستر اُتھل پتھل میلا، چادریں خشک پیلے دھبّوں اور ہاتھوں پیروں کی انگلیوں کے کٹے ہوئے ناخنوں کی چھوٹی چھوٹی نیم قوسوں سے بھری ہوئی، مونگ پھلیوں کے ٹوٹے ہوئے خول، بے غلاف تکیوں پر لِپ اسٹک کے سُرخ مدّھم نشان، مردانہ اور زنانہ مادۂ منویہ کی رَچی بَسی ہلکی ہلکی بُو—اُلٹ پُلٹ گنج جہاں دو جسم ایک دوسرے میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں، ہر رات، کبھی کبھی ہر دوپہر۔

اُسے مرطوب گرمی محسوس ہوئی، لیکن چھت کا پنکھا کہیں اپنے اندر جل چکا تھا۔

---تم کم از کم ڈیڑھ سو سال پرانے ہو، تم سر سیّد احمد خان! لہٰذا اپنی پھیلی داڑھی کو سمیٹ لو، لمحۂ موجود میں اپنی داڑھی ہم پر پھیلانے کا فائدہ؟—

اُس نے پِن اَپ پوسٹر کے بالمقابل دیوار پر ایک بوسیدہ فریم میں جکڑے ہوئے سر سیّد احمد خان کا زور زور سے منہ چڑایا---مجھ متھیلے چنگلو سے ظہور میں آنے والا ایک معمائی تلازمہ! جنس اور سر سیّد احمد خان کی رَیش دراز، پِن اَپ پلے بوائے پوسٹر اور تہذیب الاخلاق---اِزاٹ کول نا---؟

کمرے میں نقل و حرکت کرنے کے لیے زیادہ جگہ نہیں: چھت سے ایک فٹ نیچے، لوہے کے ٹیڑھے میڑھے تار کی لمبی دا اُلگنی جس پر نینسی کے زیر جامے اور براز اور قمیصیں اور شلواریں اور جینز لٹکی ہوئی تھیں اور اُن میں سے پانی کے بچے کُھچے قطرے ابھی تک چو رہے تھے۔ متھیلا چنگلو، قبر کی لمبائی چوڑائی والے غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھوتا ہے---ہمسائے فلیٹ کے غسل خانے سے فلش چلنے کی آواز، جیسے پانی کا کوئی ننھا مُنّا طوفان کسی تنگ غار میں غرق ہو رہا ہو۔ حلق میں غُراتی ہوئی بلغمی کھانسی، تھوک فرش سے ٹکرانے کی چھَنا خا—یہ مظفر واہلہ ہے۔

بھٹّے میں زیادہ دیر تک پکّی اینٹ جیسے چہرے والا مظفر واہلہ، ساتھ والے فلیٹ میں ہمارا ہمسایہ ہے۔ قبولے کے ایک بڑے زمیندار کا گھر نکالا، گھر ڈالی طوائف کے بطن سے نکلا تیسرا بیٹا۔ وہ نچلے درجے کی مذہبیات کا مطالعہ کرتا ہے اور ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں کتابی اُردو بولتا ہے۔ اُس کی زندگی کا شہری عرصہ اب دس سال سے اُوپر ہو گیا ہے، لیکن وہ ابھی تک لمبے لَڑوں والی دھوتی باندھتا ہے، سر کے بال چھوٹے رکھتا ہے، مونچھیں کھڑی۔ مثانے کی کسی شکایت کی وجہ سے وہ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد تین چار منٹ تک پیشاب کرنے پر مجبور ہے۔ اُس کی عادتیں، اپنی مجموعیت میں، ابھی تک شہری بدسلیقگی اختیار نہیں کر سکیں۔ وہ ابھی تک اپنے لیے کیکر کی داتنیں فراہم کرتا ہے۔ گرمیوں سردیوں، جب بھی ملتا ہے یوں لگتا ہے جیسا ابھی ابھی نہر میں نہا کر آیا ہو۔ وہ مُلّاں کی اذان کے ساتھ بستر چھوڑ دیتا ہے اور نماز پڑھنے کے بعد بھاری جانگلی آواز میں قرآن کی تلاوت کرتا ہے۔ قرآن پڑھتی ہوئی بھاری جانگلی آواز میری خوابیدگی میں یوں گرتی ہے جیسے فلک بلند پہاڑ سے عظیم آبشار

بھاری بھاری پتھر لے کر گر رہی ہو۔

خامشی کا طویل وقفہ۔

مَتھیلے چنگو کے معدے میں خالی پن کا ٹھّہ گُونگُڑایا۔۔۔خالی پن کے اِس بے آواز عرصے میں آگاہ رہو کہ تم ابھی تک زندہ ہو—وہ زندہ تھا، لیکن……زندگی؟—باہر، ساحلی بندرگاہی شہر کو شام کی مٹ میلی چادر میں لپیٹا جا رہا تھا—مٹ میلی شاموں میں وہی، کہیں دور رہٹ کی رُوں رُوں اور شانت بہتی نہروں کی سَرسراہٹ۔۔۔گھونسلوں کو واپس آتے پرندوں کے تھکے تھکے نغمے۔ کچے پتوں پر تارک الدُنیا رِشیوں کا اَشنان: چھلل چھلل، سَر رَسَر رَسَت سَتیہ—شامیں اُتر پڑی ہیں، یہ نزولِ آیات کا لمحہ، یہ ستیہ قو تیہ اُترنے کا وقت—شیام سانجھ کے پَروں پر۔

مَتھیلے چنگو نے لکھنے کی میز پر پڑا ہوا ننگے بلب والا برقی لیمپ روشن کرنے کے لیے بٹن دبایا۔ لیمپ نے کلِک کے ساتھ ساٹھ واٹ روشنی دی۔ جب کوئی خود ہی ستیہ قو تیہ دیا لُو ہو اور ستیہ قو تیہ لکھاری ہو تو ساٹھ واٹ روشنی کافی ہے۔ یہ ساٹھ واٹ روشنی ستیہ قو تیہ سے وحیہ کشف نچوڑتی ہے، مگر ہمیں کس زمانے میں وحیہ کشف کا سفیر مقرر کیا گیا، کس زمانے میں؟—

وہ ڈھل مل کرسی پر بیٹھ گیا: کشف ناول جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا، توں توں مشکل ہوتا جا رہا تھا، وحیہ کشف اتنا شدید تھا کہ اِس کو آیت آیت مدوّن کرنا اتنا کٹھن تھا کہ بہت کٹھن تھا۔ وحیہ کشف ایک کرب ناک اور مَسَرت آگیں تسلُّط بن چکا تھا— ایک کرب ناک اور مَسَرت آگیں تسلُّط، جس کے تمام خدّ و خال روشن تھے اور جس کی تمام آوازیں واضح تھیں، زمان سمے کی ہر دُھندلاہٹ سے پاک—ہم نے ایک بار اِس سوال کا جواب لکھا تھا کہ وحیہ کشف کیا ہے: کائنات کی ہر اُونچ نیچ میں فطرت کے قوانین موجود ہوتے ہیں، انسان اپنے علم اور مطالعے اور تجربے اور مشاہدے سے اِن قوانین کو دریافت کرتا ہے اور یوں وہ قوانین نامعلوم سے نکل کر معلوم میں آ جاتے ہیں۔

یہ غیب سے شہود میں آنے کا عمل ہے، لیکن وحیہ کشف کی کیفیت یہ نہیں۔ یہ جب کسی انسان کو اپنے تسلُّط میں لیتا ہے تو وہ خود حقیقتِ نہاں سے پردہ نہیں اُٹھاتا بلکہ حقیقتِ نہاں خود کو اُس پر منکشِف کر دیتی ہے اور وہ ایسا حاملِ کشف کے علاوہ اور کسی کے ساتھ نہیں کرتی۔

مَتھیلے چنگو پر وحیہ کشف ایک عورت کے رُوپ میں اُترا تھا، اور اُس کا ذہن اب تک اُس رُوپ کی غیر واضح تصویر لیے پھر رہا تھا۔ وہ تصویر اُس پر ایک کرب ناک نغمے کی صورت اُترتی تھی۔۔۔پارہ پارہ، چمکتی دُروں بینیوں اور لفظوں اور منظروں اور نظّاروں سے ترکیب پائی ہوئی— چمکتی دُروں بینیاں اور لفظ اور منظر اور نظّارے، یہ سب اُس کی ملکیت کے اجزا تھے اور اُس کے جذبی ستیہ قو تیہ سے قلم کی روشنائی میں نزول کر کے خیال ساخت کر رہے تھے، لفظ بنا رہے تھے۔ تو کیا یوں ہے کہ روشنائی والا یہ قلم، اُس کی اُنگلیوں میں متلج

کنارے جنگلوں کی تتلی ہے۔؟۔ اُس کے درد کا رَس چُوسنے والی تتلی، اُس کے کرب پھول پر دُھنک کا اختصار۔؟۔

وحیہ کشف ناول میں وحیہ کشف کی آیات ترتیب دینے سے پہلے میز کی صفائی ضروری ہے۔۔۔ اُس نے تین چار لکھے ہوئے کاغذوں کی گولی بنا کر غسل خانے کے دروازے کی طرف پھینک دی، چائے کی پیالی اُٹھا کر خالی ٹرنک ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔ چائے کی پیالی لَمبوؤں کی نُچڑی ہوئی قاشوں سے بھری ہوئی تھی— تپتپائے ذہن کا ذائقہ اور لَمبو چائے کا ذائقہ ایک جیسا ہوتا ہے۔ یہ مقولہ مرتّب کرنے کے باوجود وہ، وحیہ کشف ناول کی آیتیں ترتیب میں نہ لا سکا، وحیہ کشف کی نزولی شدّت میں بھی کمی نہ آئی۔

اُس نے میز کی دراز کھول کر ایک خاکی کاغذ نکالا جس پر فرنچ لیدر کا پیکٹ پیپر ویٹ کی طرح رکھا ہوا تھا، کچھ دیر تک قلم کی نِب کا معائنہ کیا جو درمیان سے چِری ہوئی اوندھی تکون تھی— مجھے اور دنیا کو مسلسل پیدائش دیتی ہوئی یونی؛ لیکن نہ میں، نہ یونی، نہ دنیا جب تک وہ مرکزی نقطہ بیج نہ ہو— وہ مرکزی نقطہ بیج جو پورے نظام کو ہونے کا اِمکان بخشتا ہے۔ جو ہمیشہ مُضمر ہے لیکن کبھی بھی قابلِ ادراک نہیں، جس کے بغیر شری ینتر کی ساری ترتیب ناممکن۔ وہ مرکزی نقطہ بیج کہاں ہے۔؟

وہ مرکزی نقطہ بیج ہمارے اندر کے شری ینتر میں ہے— تو پھر! مسئلہ یہ ہے کہ اپنے اندر کی کونیات کا نقشہ مرتّب کیا جائے۔ ہم جو معجزے باہر دیکھنا چاہتے ہیں، اُن کو ہم اپنے اندر اُٹھائے پھرتے ہیں۔ کونیات کے سارے بھید ہمارے اندر سانس لیتے ہیں— ہم، ہم، ہم ہی ہم— وحیہ کشف، بیت چکی اور آنے والی محبت جیسا کہ جس کے بھید اور جس کی حیرتیں ترسیل کرنا کائنات کی ساری کہکشاؤں کی مطالعاتی سیاحت جیسا۔

متھیلے چنگو نے آج کے دن کی پہلی آیت ترتیب دی: ہمارے بدن میں کال پڑتا ہے، اور ہم اِس کلجگ میں آنکھیں میٹ کر سو جاتے ہیں، میٹھی آنکھوں میں آنے والی کل کے نزول سُپنے گھونسلوں کی طرف واپس آنے والی چڑیوں کے نازک پَروں پر بیٹھ کر آتے ہیں۔ لیکن ہم نے اپنی کھیتیوں میں زہر بیجا اور جس ندی میں پاؤں لٹکائے، اُسی ندی کو گالی دی۔ پر یاد رکھو سنگیو ساتھیو! تکبّر سے فصلیں نہیں پھلتی پھولتیں اور پودے نہیں اُگتے اور عورتیں بچے نہیں جنتیں۔ پریم پاریوں کی انگور بیل کیکر پر چڑھاؤ تو انگور زخمی ہو جاتے ہیں .....تو پھر یہ ایک اُوطی منجّر سوَر کے پیٹ میں زندگی، قدم قدم بکھرے چھوٹے چھوٹے پھندے گُوٹیاں جن میں لالچ روٹی کا ٹکڑا پھنسا ہے، انسانوں کو چوہوں کی طرح پکڑنے کے لیے۔ یہ ذبح بکروں کی طرح ٹنگے ہوئے منصور اور اُن کی کھالیں کھینچی جاتی ہوئی۔ تلخیاں، جھگڑے، قتل و غارت۔ اِن سب کو ہم اپنے وحیہ کشف ناول کے کون سے باب میں درج کریں— وحیہ کشف ناول، جو کسان کے گیت جیسا اچھوتا ہے اور قدیم یاد جیسا اپنی طرف کھینچنے والا ہے۔ اَنت محبت کی سانولی یاد۔ اپنے اندر کے ہم ہی ہم کا وفور۔

مرزا حامد بیگ

انارکلی

دو رویہ دیوار کے درختوں کے بیچ بل کھاتی سڑک پر قہقہے لنڈھاتی روڈ لائینر کا رخ خانس پور کی جانب تھا۔

ناٹے قد والا ٹیلی وژن اداکار سنی، سب سے الگ تھلگ ڈرائیور کے برابر والی فرنٹ سیٹ پر چپ بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نذیر، ڈاکٹر ستنام اور سفید بالوں والے میر صاحب بیتے زمانوں میں ڈوب، ابھر رہے تھے اور درمیان کی نشستوں پر شہریار مرزا، ہُد ہُد اور دیگر مندوبین کے بیچ مختلف النوع موضوعات زیر بحث تھے۔ سب سے پچھلی سیٹ پر خشک میوے کُٹکتاتی لڑکیوں کا جُھنڈ چہک رہا تھا۔

روشنی کی کمندیں پھینکتی روڈ لائینر کی اِکا دُکا ادھ کھلی کھڑکیوں سے در آتی خنک ہوا نے اندر کی فضا کو سرد کر دیا تھا۔ طویل خاموشی کا وقفہ آیا تو میر صاحب بتانے لگے کہ جب وہ پہلی بار کوہ مری آئے ہیں تو اس وقت کی ان کی محض مسیں بھیگی تھیں اور یہ لہر یے لیتی سڑک، دوطرفہ ٹریفک کے لیے نا کافی ہی نہیں از حد خطرناک بھی تھی۔

”راول پنڈی سے کوہ مری کے لیے تانگے چلتے تھے ان دنوں ......“ میر صاحب نے پائپ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

”تانگے؟“ پچھلی نشست سے جُھر ہا پُھوٹا۔

”کیا واقعی انکل، تانگے چلتے تھے؟ تانگہ آتا کیسے ہوگا اتنی چڑھائی چڑھ کر۔“ انارکلی چٹکی۔

”ہاں بیٹا، تانگے، یہی گھوڑا تانگہ، ٹخ ٹخ چلتا ہوا۔ اکثر گھوڑے کی باگیں تھامے کوچوان آگے آگے پیدل چلتا تھا بے چارہ ......گاڑیاں کہاں تھیں ان دنوں ......خیر، انگریز بہادر تو یہاں 1851ء میں ہی پہنچ گیا تھا، پنجاب کو ہتھیا لینے کے بعد اور یہ سڑک بھی اس نے بنائی۔

راول پنڈی سے کوہ مری ٹھیک پچاس کلومیٹر بنتا ہے۔ چھرا پانی پہنچ کر گھوڑے کو کھول دیا جاتا تھا، آدھ پون گھنٹے کے لیے۔ یوں مختلف مقامات پر پڑاؤ کرتے ہوئے پہنچتے تھے۔“

”پڑاؤ“ ......شہریار مرزا کو جھرجھری لگ گئی۔

”کیا ہوا تمھیں؟ سردی لگ رہی ہے کیا؟“ ......ہُد ہُد بولا۔

”وہ دیکھو، بلخ سے ہرات اور غزنی سے کابل تک پڑاؤ کرتا ہوا جلال آباد سے قافلہ آتا ہے۔ اس قندھار

کی لڑکی نادرہ بیگم کو پہچانا تم نے؟ بھاری فراک اور تنگ موہری والی شلوار میں سب سے نمایاں تو ہے۔" شہریار مرزا نے دور تاریک کھائیوں کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔

"کچھ بھی تو نہیں یار" ہُدہُد نے کھڑکی پوری طرح کھول کر باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی روکے انہیں، نہ آئیں اس طرف۔ اِدھر موت کی ارزانی ہے۔" شہر مرزا کی بڑبڑاہٹ کسی نے سنی، کسی نے نہ سنی۔

"کیا ہوا ینگ ریسرچر؟ تمھیں یقین نہیں آیا کیا؟" میر صاحب نے دھیرج سے گردن گھما کر پوچھا۔

"آئی ایم سوری، میر صاحب۔ میں کہیں دور نکل گیا تھا۔ ایسا اکثر ہوتا ہے میرے ساتھ۔" شہریار مرزا نے معذرت چاہی۔

"عجب گل اے بئی۔ ہمارا ہیرو چلتی ہوئی کوچ میں سے اٹھ کر دور بھی نکل جاتا ہے۔"

راجا رسالو نے پھلجھڑی چھوڑی تو کوچ میں تا دیر قہقہے گونجتے رہے۔ قہقہے تھمے تو میر صاحب گویا ہوئے۔

"پنڈی سے فجر کی نماز پڑھ کر نکلتے تھے اور اللہ اللہ کر کے رات کے دوسرے پہر پہنچ ہی جاتے تھے کوہ مری، تانگے پر، یہ بسیں جب چلنا شروع ہوئی ہیں تو میں اچھا خاصا سیانا تھا۔ ان دنوں موٹر گاڑیوں میں ٹھوس ربڑ کے ٹائر ہوا کرتے تھے۔ موٹر گاڑی کے چلنے سے ایسے جھٹکے لگتے تھے کہ پسلیاں ہل جاتی تھیں۔ میں دو بار بس میں بھی آیا تھا ان دنوں......"

"پھر تو آپ قبل از تاریخ کے آدمی ہوئے نا۔" کوچ کی پچھلی نشست سے ایک بار پھر مترنم جھرنا پھوٹ بہا۔

"بس ایسا ہی سمجھ لو بیٹیا...... آخری بار، خانپور تمھارے مرحوم ڈیڈی کے ساتھ آیا تھا۔ ہائے مودی...... کیا سجیلا جوان تھا، سجیلا اور شرمیلا۔ پوری حیات فیملی میں اس جیسا کوئی نہ تھا۔ اپنے جاگیردار ہونے کا احساس تک نہ تھا اسے۔"

"کیا واقعی میر صاحب؟ کتنی اچھی بات ہے۔ کاش ڈیڈی زندہ ہوتے" انار کی مہک فلائنگ کوچ میں بھر گئی۔

میر صاحب، تا دیر چپ رہے، پھر انھوں نے پائپ میں تازہ تمباکو بھرتے ہوئے دیا سلائی جلائی۔ پائپ کا گہرا کش لیا تو فلائنگ کوچ میں انار کی مہک کے ساتھ بڑھیا تمباکو کی خوشبو گھل مل گئی۔

☆☆☆

وہ اساڑھ کا آخری عشرہ تھا اور ساون پڑا چاہتا تھا

کوچ جب ایوبیہ سے ہوتی ہوئی خان پور کے کرسچین ریسٹ ہاؤس کا آخری موڑ کاٹ کر رکی وتو ملگجے اندھیرے میں گرجا گھر کے اونچے کلس کے اوپر پھنگل دودھیا بدلیاں یکجا ہو رہی تھیں۔

لاہور سے چلی ہوئی دوسری پارٹی ابھی کچھ ہی دیر پہلے وہاں پہنچی تھی۔ سب آپس میں گھل مل گئے۔ شہر یار مرزا کے لیے یہ سب لوگ اجنبی تھے۔ کسی سے ملاقات ہوئی، کسی سے نہ ہوئی۔ خود ہُد ہُد بھی فلم یونٹ کے چند ایک افراد کے لیے اجنبی تھا۔

جب ریسٹ ہاؤس گرانڈیل مرکزی ہال سے ملحقہ تھی، کمروں کو بھی ایک ایک کر کے کھول دیا تو معلوم ہوا کہ مرکزی ہال کی دائیں جانب کے دو بڑے کمرے خواتین کے لیے مخصوص کر دیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر ستنام، فلم یونٹ کی بھاری بھرکم گلوکارہ نجمہ بیگم، اس کی فتنہ روزگار، نیلی آنکھوں والی بیٹی آصفہ اور کراچی سے آئی ہوئی اداکارہ جہاں آراء کے پیچھے پیچھے انارکلی اپنا سامان اٹھائے اس طرف کو مڑ گئی۔ بھاری سوٹر سے لدی پھندی دھان پان سی صُلح کل صفیہ بھی اس کے ساتھ تھی۔

ڈاکٹر نذیر، میر صاحب اور راجا رسالو لان کی گھاس پر آ بیٹھے تھے۔ بڈھا ڈاکٹر لوباخ، اپنے کندھے پر جھولتے ہوئے کیمرے کی فلش لائٹ سے ریسٹ ہاؤس کے تاریکی میں ڈوبے ہوئے کونے کھدروں کو بار بار منور کرتا پھر رہا تھا۔ لان کے ایک تاریک کونے میں ڈاکٹر لوباخ کا ادھیڑ عمر بیٹا رابرٹ اپنی گٹار سمیت گرجا گھر کی سیڑھیوں پر چپ بیٹھا تھا۔ جب کہ دو مرد مندوبین میں سے ہر ایک نے بائیں جانب کے ہال اور اس سے متصل کمروں میں اوپر تلے چنی ہوئی تین تین منزلہ لوہے کی چارپایوں پر اپنے اپنے بستر لگا دیے تھے۔

لڑکیوں نے اپنے مخصوص کمرے میں سے نکل کر بوڑھے چوکیدار کی مدد سے کانفرنس ہال سے ملحقہ ڈائننگ روم اور کچن میں زندگی کے آثار پیدا کر دیے تھے لیکن رات کا کھانا چنے جانے میں ابھی دیر تھی۔

''راجا صاحب، ایک بات سمجھ میں نہیں آئی، آپ نیلی کے سوار کیسے ہوئے؟'' میر صاحب نے پائپ کا گہرا کش لیتے ہوئے راجا رسالو کو چھیڑا۔

''میں یعنی راجا رسالو......... ہاہاہا......... نیلی کا سوار دکھائی نہیں دیتا کیا؟ میر صاحب، آپ کی عینک کا نمبر تبدیل ہونے والا ہو گیا ہے۔''

''ارے بھئی، اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں، پتا جو نہیں۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ شیخوپورہ کے گرد و نواح میں وار برٹن کا علاقہ راجا سرکپ کی دھرتی کہلاتا ہے جب کہ وہ دراصل ٹیکسلا کا تھا۔ اس کی چار بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ شہزادوں کے ساتھ شطرنج کھیلتا تھا، اس شرط پر کہ مد مقابل جیت گیا تو بیٹی بیاہ دوں گا اور اگر ہار گیا تو مد مقابل کا سر اتار لوں گا۔ راجا رسالو سے اس کا مقابلہ ہوا اور راجا رسالو جیت گیا۔''

''بے شک، وہ راجا رسالو میں ہی ہوں۔ سیالکوٹ کے جاٹ راجا کا بیٹا۔ پورن میرا بھائی تھا، جس کے نام سے سیالکوٹ اور کالووال کے بیچ ایک کنواں ہے، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کنویں کا پانی بانجھ عورت پی لے تو بیٹا جنے۔ صدیوں پہلے راجا سرکپ سے ٹکر لی ہے۔ تب راجا رسالو کہلایا ہوں......... کوئی مذاق ہے......... میں تو بہ یک وقت راجا سرکپ کی چاروں بیٹیوں کا عاشق زار رہا ہوں۔ ہائے کاپی، کلپی،

ماں دئی اور منڈی۔ یہ نام تھے ان کے۔ ہائے ہائے۔" راجا رسالو نے دونوں ہاتھوں سے سینہ کوبی شروع کر دی۔ سب ہنس دیے۔

ڈاکٹر نذیر نے ہنستے اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا: "راجا صاحب، جانے بھی دیجیے، شطرنج تو آپ کو آتی نہیں سرکپ سے مقابلہ کیوں کر کیا ہو گا۔"

"نہیں پروفیسر نہیں۔ آپ کو پتا ہی نہیں۔ میں نے راجا سرکپ کی چالاکی پکڑ لی تھی۔ وہ کوئی ماہر شاطر نہیں تھا، ایک ٹھگ تھا۔ اس نے شطرنج کی بازی ہمیشہ اپنے پالتو چوہے کی مدد سے جیتی۔ میں نے اس کا بندوبست اپنی پالتو بلی سے کر لیا تھا۔ مجھے بلیوں سے عشق ہے۔ میں نے ان دنوں میں بھی ایک بلی پال رکھی ہے۔"

"بلی؟ کہاں چھپا رکھی ہے راجا صاحب؟" ڈاکٹر نذیر نے مذاق میں، استعجابیہ انداز سے عینک اتار کر چاروں اور نگاہ دوڑائی۔

"یہ رہی۔" راجا رسالو نے قریب ہی لیکن سب سے الگ تھلگ بیٹھے سنی کے کندھے پر اچھل کر تھپکی دی۔

سنی بے چارہ ابھی مرحبا ریستوران میں ہونے والے شہریار مرزا کے حملے سے جانبر نہیں ہو پایا تھا کہ یہ دوسرا بھرپور وار راجا رسالو نے کر دیا۔ وہ بھنا کر اٹھا اور "نان سینس"، "نان سینس" کہتا ریسٹ ہاؤس کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

میر صاحب بولے: "لڑکا ناراض ہو گیا، راجا صاحب۔ اب اسے منا لیجیے گا"۔

"منا لیں گے، منا لیں گے، لیکن خدا کے لیے اب کھانا لگوا دیں۔" راجا رسالو، گھاس پر بیٹھے بیٹھے لیٹ گئے۔"

"بھئی۔ آج رات کا کھانا تھا لاہور سے ہم ساتھ لائے تھے، بس گرم کرنا تھا۔"

میر صاحب اٹھا چاہتے تھے کہ عین اسی لمحے نیم تاریک برآمدے میں انارکلی بجلی کی طرح کوندی، اس کے ایک ہاتھ میں تام چینی کا تھال تھا اور دوسرے ہاتھ میں بڑا سا چمچ۔

"لیڈیز اینڈ جینٹلمین، آپ کے لیے خوش خبری۔ ڈائننگ ہال میں گرم گرم کھانا آپ سب کا منتظر ہے۔" اس اعلان کے ساتھ ہی تھال پر چمچ بجنا شروع ہو گیا۔"

CHEER، مرحبا اور زندہ باد کا شور اٹھا۔

"کاکی، اسے فرسٹ کال سمجھا جائے یا حملہ کر دیا جائے؟" راجا رسالو نے اسی طرح لان میں نیم دراز پڑے پڑے استفسار کیا۔

ادھر، چمچ کے ساتھ تام چینی کا تھال بجاتے ہوئے انارکلی کی نظریں سنی کی متلاشی تھیں اور وہ دو روز دیک

کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ متجسس نگاہوں کے ساتھ برآمدے میں ہر طرف گھوم گئی۔ راجا صاحب کا استفسار اس تک پہنچا ہی نہیں۔

”جواب نہیں آیا۔ اس کا مطلب ہے حملہ۔“ راجا رسالو، کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے جب تک اپنے گھٹنوں پر ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھتے، ڈاکٹر نذیر، میر صاحب اور ڈاکٹر لوباخ سمیت اکثر خواتین و حضرات ڈائننگ ہال کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔

ڈائننگ ٹیبل پر ہُدہُد کے برابر میں بیٹھے ہوئے شہریار مرزا نے دیکھا کہ باہر نیم تاریک برآمدے میں دو سائے تیزی سے لان کی سیڑھیاں اتر گئے۔ اس وقت ڈائننگ ٹیبل پر تین کرسیاں خالی تھیں اور ہُدہُد سمیت سب کے سب جیسے کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ایسے میں کسے فرصت تھی کہ ادھر توجہ کرتا۔

تین کرسیاں خالی ہونے کا مطلب، تین افراد باہر ہیں ....

ایک تو ہوئی انارکلی، دوسرا سنی .... تیسرا کون ہے؟ یہ سوچتے ہوئے شہریار مرزا بڑے آرام سے اٹھا اور سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھانے کے بہانے برآمدے میں نکل آیا، اس نے دیکھا کہ وادی کی سمت اتر جانے والی سیڑھیوں کے قریب ناڑ کے جڑواں درختوں تلے دو متحرک دھبے تھے، جو تاریکی میں تحلیل ہو گئے۔ برآمدے کی ریلنگ پر جھکا ہوا تیسرا سایہ انارکلی کا تھا۔ وہ تنہا کھڑی تھی اور اس کی نظریں وادی کی سمت اتر جانے والی ترائی پر جمی تھیں۔ اس وقت اس نے اپنے کندھوں پر سیاہ رنگ کی شال لے رکھی تھی اور اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں تام چینی کا تھال اور چمچ دھیرے دھیرے آپس میں ٹکرا رہے تھے۔

شہریار مرزا، معاملے کو پوری طرح بھانپ کر کچھ دیر لاتعلق سا کھڑا رہا تاوقتیکہ شہ شمشادقداں، انارکلی نے اس کے قریب سے ہو کر ڈائننگ ہال کی سمت نکل جانا چاہا۔ شہریار مرزا نے اسی طرح کھڑے کھڑے اپنا بازو پھیلا کر اس کا راستہ روکتے ہوئے صرف اتنا کہا:

”دو گھڑی ہمارے پاس بھی رک جاؤ انارکلی۔“

”کیا؟ میرا نام انارکلی نہیں، شازیہ ہے۔“ اس وقت وہ جیسے نیند میں چل رہی تھی اور شہریار مرزا نے اسے جھنجوڑ کر جگا دیا تھا۔

”IF YOU DONT MIND شازی میں صرف یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ تم ڈائننگ ہال میں آنے کی بجائے سنی کے لیے باہر رک گئیں، لیکن وہ تو ....۔“

”ہاں سنی کے لیے ..... نہیں تو ..... مجھے اندر جانے دو۔“

”صرف دو گھڑی رک جاؤ ..... اندر کسی کو کسی کی پروا نہیں، انہیں سخت بھوک لگی ہے اور اگلے پانچ سات منٹ کسی کو ہوش نہیں آتا۔“

”آپ نے کھانا نہیں لینا؟“

’’نہیں ...... اندر اس وقت چار کرسیاں خالی ہیں۔ چوتھی کرسی میرے اٹھ کر آنے سے خالی ہوئی۔ ہم دونوں تو ادھر ہیں، یہ سنی کے ساتھ کون ہے جو تاریک وادی میں اتر گیا؟‘‘

’’آصفہ ...... نجمہ آنٹی کی بیٹی۔‘‘ شازی کی آواز جیسے گہرے کنویں سے اوپر اٹھنے کا جتن کر رہی تھی۔

’’شازیہ ...... شازی بیٹا کہاں ہو۔‘‘ ڈائننگ ہال سے ڈاکٹر ستنام نے پکارا تو شازی چونک کر جیسے نیند سے جاگی اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ شہریار مرزا ایک ہاتھ سے ریلنگ کو تھامے وہیں کھڑا رہا۔

اس وقت سوچ میں الجھا ہوا تھا کہ ڈائننگ ہال میں چار کرسیاں خالی دیکھ کر نجمہ بیگم کو اپنی بیٹی کا خیال کیوں نہ آیا۔ کیا یہ سب اس کے علم میں ہے؟۔

اندر ڈائننگ ٹیبل پر گھمسان کا رن پڑا تھا۔ چمچ اور پلیٹوں کی آواز کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور سامنے تاریک ترائی میں تاڑ کے جھنڈ ہلکی ہوا میں ہلکورے لے رہے تھے۔ پھر جیسے صدیاں گزر گئیں۔ شہریار مرزا، آہنی ریلنگ کا سہارا لیے نیم تاریک برآمدے میں ٹھہرا رہا۔

یکا یک ڈائننگ ہال سے ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اندر چائے کا دور چل رہا تھا۔ پھر جب ڈاکٹر نذیر کے ہمراہ، ڈاکٹر ستنام، میر صاحب اور نجمہ بیگم چائے کی پیالیاں ہاتھوں میں تھامے برآمدے سے ہو کر لان میں اترے ہیں تو اس سے ذرا پہلے وادی کی ترائی میں سے نیلی آنکھوں والی آصفہ برآمد ہوئی اور ذرا فاصلے پر سے لان میں داخل ہوتے ہوئے سنی دکھائی دیا۔

’’بہت رات ہو گئی۔ سب لڑکے لڑکیاں اب اپنے اپنے کمروں میں چلیں۔ صبح ٹھیک دس بجے افتتاحی سیشن ہے۔‘‘ ڈاکٹر ستنام نے لان میں ہدایت جاری کی تو برآمدے کی بھیڑ چھٹ گئی۔

☆☆☆

نیم تاریک ہال میں قطار اندر قطار بچھے ہوئے تین منزلہ اسپرنگوں والے بیڈز کی پہلی رو میں، دوسری منزل پر شہریار مرزا ابھی ٹھیک طرح لیٹنے نہ پایا تھا کہ اوپر کی منزل سے راجا رسالو نے سیلوفین کا بھاری لفافہ اس کی جانب لٹکاتے ہوئے سرگوشی کی: ’’ہم اپنے ہیرو کو خالی پیٹ تو سونے نہیں دیں گے۔ جب مرزا، تخت ہزارے سے جھنگ کے لیے نکلا ہے تو اس کی بھابیوں نے چوری ساتھ کر دی تھی۔ میری جان، یہ بھابی کی چوری ہے، قبول کرو۔‘‘

’’اوہ، راجا صاحب ...... آنتیں قُل پڑھ رہی ہیں، آج یہ غیبی مدد نہ ملتی تو یقین مانیں بھوکے پیٹ نیند نہیں آنا تھی۔‘‘ شہریار مرزا نے اُچک کر ڈائننگ ہال سے محفوظ کروائے گئے پلاؤ کباب کا لفافہ وصول کر لیا۔

اس وقت نیچے کی منزل میں ہُدہُد گہری نیند سونے کے لیے کروٹ لے چکا تھا۔ قرب و جوار سے اٹھنے والے مہیب خراٹوں میں کھسر پھسر رفتہ رفتہ دم توڑ رہی تھی۔

’’راجا صاحب، ایک منزل نیچے نہیں اتر آتے آپ۔ کھانا بہت زیادہ ہے، میرے ساتھ مل کر کھانے کا

کورس ہی دوہرالیں۔ ''

''بسمہ اللہ کرواور ٹوٹ پڑو...... بچ کر نہ جائے یہ لفافہ۔ میں تمھاری مدد کو آتا ہوں ...... یار، ایک تو یہ اسپرنگ نک چڑھی زنانی کی طرح جھک جھک بہت کرتے ہیں۔ '' راجا صاحب، قدم جما کر رکھتے ہوئے ایک منزل نیچے آگئے۔

''ہاں، کھانا بھی کھاتے جاؤ اور واردات کا بیان بھی جاری رہے، کہو مرزا، جھنگ میں ہیر کی بھینس ہی چراتا رہا یا کچھ ہاتھ بھی آیا؟ لگتا ہے یہ سالا کیدو کی اولاد، سنی ...... دائیں بائیں سب چوکنے ہو گئے ہیں ...... ذرا احتیاط سے۔ '' راجا صاحب نے سرگوشی کی۔

''ہاتھ ہو گیا راجا صاحب۔ ''

''پسلیاں نہیں توڑ دیں گے اس کی، جو ہمارے ہیرو کے ساتھ ہاتھ کرے گا۔ ''

''اوُنہیں، راجا صاحب...... بات یہ نہیں ہے ...... وہ زنخا ڈبل گیم کھیل رہا ہے۔ ''

''کیا مطلب؟ ''

''راجا صاحب...... اُس کی پرانی گٹ مٹ لگتی ہے، انار کلی کے ساتھ''

''کیا مطلب ...... شازی کے ساتھ۔ ''

''ہاں راجا صاحب ...... اور وہ بھی بیراگن ہو رہی ہے اس کے لیے ...... لیکن اس وقت سنی کا سلسلہ نیلی آنکھوں والی آصفہ کے ساتھ چل رہا ہے۔ ''

''ہیں، وہ کیسے؟ ''

''بس بتاؤں گا آپ کو...... ''

''اُو یار، بتاؤ بھی ...... خدا کی قسم اب مجھے نیند نہیں آنے کی۔ '' راجا صاحب، سادھو سنتوں کی طرح شہریار مرزا کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ عین اس لمحے، سنی چور قدموں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ تاریکی میں کچھ دیر ٹھہر کر اس نے اپنی سمت کا تعین کیا اور آگے نکل گیا۔

''راجا صاحب، خدا کا خوف کریں ...... دن بھر کے تھکے ہوئے ہیں ...... اب سو بھی جائیں۔ ''

ہُدہُد نے چارپائی کی نچلی منزل پر کروٹ لیتے ہوئے التجا کی۔

''پیاریو ...... کیا ہو گیا ...... سوجاتے ہیں، سوجاتے ہیں۔ '' راجا صاحب نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

''ٹھیک ہے راجا صاحب۔ باقی باتیں کل۔ ''

''لیکن یرا ...... آج تو تم نے ہمیں مخمصے میں ڈال دیا ...... خیر دیکھا جائے گا ...... اللہ بیلی۔ ''

''شب بخیر۔ ''

''راجا رسالو، اوپر کی منزل پر منتقل ہو گئے تو شہریار مرزا نے خالی سیلوفین کا لفافہ وادی کی سمت کھلنے والی

کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔"

☆☆☆

اس وقت خان پور میں صبح کے آٹھ بجے رہے تھے۔ جب برآمدے سے تام چینی کے تھال پر چمچ کے بجنے کی آواز سنائی دی۔ شہر یار مرزا گہری نیند میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نچلے بیڈ پر ہُدہُد نے چہرے پر سے کمبل سرکایا۔ عین اسی لمحے راجا رسالو کندھے پر تولیہ ڈالے باہر کی سمت کھلنے والے دروازے کے بیچ اسپنج کی طرح اچھلتے دکھائی دیے۔

"ا کھاڑے۔ تے لڑائی جاچپ کر کے۔"

راجا صاحب جُھوم جُھوم کر گنگنا رہے تھے۔ پھر انھوں نے آگے کو جست بھری اور ہُدہُد پر سے کمبل کھینچتے ہوئے، رازداری سے آنکھ ماری۔

"شہزادے، سنا نہیں؟ فرسٹ کال فار بریک فاسٹ۔"

ہُدہُد اٹھ کر بیٹھ گیا اور مغلئی آنکھوں والا، راجا صاحب کے کندھے سے تولیہ اُچک کر غسل خانے کی طرف نکل گیا۔ اس وقت اکثر بنے سنورے مندوبین، برآمدے کی ریلنگ سے ٹیک لگائے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

غسل خانے میں گرم پانی کی دستیابی ایک نعمت سے کم نہ تھی۔ شہر یار مرزا جب کنگھی سے بال سنوارتے ہوئے پلٹا تو اس نے دیکھا کہ اس وقت بھی چند ایک مندوبین اوندھے مونہہ پڑے بے خبر سو رہے تھے اور ہُدہُد تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا تو تھا، پر اس کی آنکھیں مندھی ہوئی تھیں۔

شہر یار مرزا نے آگے بڑھ کر ہُدہُد کی ننھی سی توند سہلائی اور اس کے پھولے ہوئے گالوں پر بھینچ کر دو طرفہ پیار لیا تو اس نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں۔

"پیارے ہُدہُد۔"

"یار بکواس نہیں۔ باہر سب کھڑے سن رہے ہیں۔" ہُدہُد جھنجھلا کر بولا۔

"اچھا، ٹھیک ہے۔ نہیں کہتے ہُدہُد۔ سب کے سامنے مسعود صاحب کہیں گے۔ لیکن یار اس وقت ہم دونوں کو ضرورت ہے ایک سیفٹی ریزر کی۔ وہ سالی وہیں رہ گئی۔ تم نے مال روڈ سے مجھے اچک لیا۔ یہ بندوبست تو کرنا ہوگا بہ صورت دیگر ہم دونوں کے تھوپڑے مندوبین کو دکھانے کے قابل ہرگز نہیں۔ یہ بندوبست کہاں سے ہوگا؟"

اس وقت شہر یار مرزا نے ہُدہُد کو اپنے دونوں بازوؤں میں بھینچ رکھا تھا۔

"خیر مجھے تو کوئی خاص ضرورت نہیں۔ پر تمہارا مونہہ دیکھنے کے لیے تو اتنی ساری ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک ......اوہ، ہاں یاد آیا ......وہ کم بخت شاید ساری رات سوئی نہیں۔"

شہر یار مرزا اپنے بھینچے ہوئے بازو ڈھیلے چھوڑ ہُد ہُد کے گلے میں جھول گیا۔ ”وہی ...... جس کی خاطر تم نے رات کھانا نہیں کھایا۔“ ہُد ہُد نے بے ہنگم سی انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

کیا مطلب؟ وہ انار کی کلی؟“

”ہاں وہی۔ رات کو جب تم سو گئے اور راجا صاحب نے اپنے خراٹوں سے مجھ سمیت اس ہال کے دیگر باسیوں کو ساری رات جگائے رکھنے کی ٹھان لی تو میں نیند نہ آنے کے سبب باہر، نیم تاریک برآمدے کی طرف نکل گیا۔“

”پھر؟“

”بتا تو رہا ہوں، برآمدے میں نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مستورات والے حصے میں روشنی ہے۔ کھڑکی سے لگ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ میڈم ستنام اور میر صاحب جاگ رہے ہیں۔ شاید پی رہے تھے اور سُدھ بُدھ کھوئے ہوئے تھے۔ میں اندر تو گیا نہیں۔ ان دونوں کا معاملہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا یار۔“

”تم پھر بکواسیات میں پڑ گئے۔ تمھاری Continuty book جانے کہاں کھو جاتی ہے۔ ہم نے کیا نکالنا ہے، میڈم اور میر صاحب کے معاملے میں سے بھلا ......“

شہر یار مرزا تلملا اٹھا۔

”ہاں، تو میں بتا رہا تھا۔ اس وقت رات گئے لان کے آخری سرے پر ڈاکٹر لوباغ کا موسیقار بیٹا رابرٹ اس قہر کی سردی میں بیٹھا گٹار بجا رہا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر میڈم نجمہ اور چنچل سی لمبے لمبے بالوں والی ....“

”جہاں آراء نام ہے اس کا۔ تم کراچی میں بنی فلمیں سرے سے دیکھتے نہیں شاید۔ مشہور اداکارہ ہے یار۔“

”ہاں، وہی میڈم نجمہ کی بیٹی آصفہ رات کے آخری پہر گٹار بجاتے ہوئے رابرٹ کے قدموں میں بیٹھی داد دے رہی تھیں۔“

”ہُد ہُد تم صرف ہُد ہُد ہی نہیں، حرام خور، میں اس کا پوچھ رہا ہوں۔ اس سرمئی شال والی انار کی کلی کا۔“

”ہاں، وہی تو بتا رہا ہوں۔ اسے اور سنی کو میں نے چرچ کی داہنی دیوار سے لگ کر کھڑے دیکھا۔“

”تم نے اور کیا دیکھا؟“

”دیکھنا کیا تھا۔ میں تو اس طرف یونہی نکل گیا تھا کہ ان دونوں پر اتفاقاً نظر پڑ گئی۔ وہ دنیا و مافیا سے بے خبر دیوار کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ میں بے خیالی میں ان کے بالکل قریب پہنچ گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی سرمئی شال سے آنسو پونچھتی، ہچکیاں لے کر رو رہی ہے اور سنی اسے تسلی دیتے اور دونوں ہاتھوں سے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے قسمیں کھا رہا تھا کہ اس کا آصفہ کے ساتھ کوئی چکر نہیں۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا تو

انہیں میری موجودگی کا احساس ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی سنی تو جھٹ پٹ وہاں سے سٹک گیا، لیکن وہ کچھ دیر یونہی چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کے بعد ہچکیاں لے کر روتی اور تیز تیز قدم اٹھاتی مستورات والے بلاک کی طرف نکل گئی۔ سنی اس وقت برآمدے ہی میں کھڑا تھا شاید۔ اس نے اسے ہاتھ بڑھا کر روکنا بھی چاہا، لیکن وہ رکی نہیں۔"

"پھر؟" شہریار مرزا کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں میں سے آئی۔

"میں نے سنی سے پوچھا بھی کہ کیا ہو گیا بھئی، لڑکی رو رہی ہے۔ تو جواب میں اس نے کندھے اُچکائے اور کہنے لگا: تاریکی میں باہر نکلی تھی، کانٹے دار جھاڑیوں میں گر گئی بے چاری...... اب یار مرزا تو ہی بتا، میں ناک میں نوالے ڈالتا ہوں؟ وہ حرامی مجھے غچہ دے گیا۔"

یہ سن کر مغلئی آنکھوں والا کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا، پھر بولا: "آج یا کل میں فیصلہ ہو جائے گا۔ زیادہ گزر گئی اور تھوڑی رہ گئی اس فیصلے کی گھڑی میں دائیں بائیں نہ ہو جانا، مجھے تیری ضرورت پڑے گی۔"

"ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک۔" یہ کہتے ہوئے ہُد ہُد غسل خانے کی طرف نکل لیا اور شہر یار مرزا، راجا صاحب کے سفری تھیلے میں سے شیونگ کِٹ ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایسے میں راجا صاحب نے کمرے کے اندر جھانکا۔

"ویر جی، مَرن بَرت کا اِرادہ ہے کیا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تم دونوں کی خاطر ناشتے کی میز سے گرم گرم پراٹھے اور فرائی کردہ انڈے چراتے ہوئے پکڑا جاؤں۔ میری جان، جگر ناشتہ کر لیں۔ اس وقت سب لوگ ناشتہ کر لینے کے بعد ہال میں افتتاحی اجلاس کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ کہاں ہے تمہارا یار؟"

"غسل خانے میں ہے۔ بس چلتے ہیں راجا صاحب۔ آپ کے کند ریزر سے چہرے چھیل کر دو سیکنڈ لگاؤں گا نہانے میں۔ آخری گیت محبت کا سنا لوں تو چلوں۔"

"پیاریو! خفیہ کے ایک حوالدار کے ریزر میں نیا بلیڈ کہاں سے آئے گا بھلا"۔

"کوئی نہیں راجا صاحب۔ آج کر لیتے ہیں بندوبست۔ ایوبیہ میں دو ایک دوکانیں تو ہوں گی ہی۔ آج جانا ہے اُدھر...... نیا بلیڈ لگا دیتے ہیں آپ کے اس کُند بلیڈ کی جگہ۔"

"اللہ بھاگ لگائے رکھے۔ اپنا کیا ہے، نہ پہلے کبھی کسی کو مونہہ دکھانے لائق تھے، نہ اب ہیں"...... راجا صاحب نے اپنے چہرے کی جھاڑ جھکاڑ پر دونوں ہاتھ پھیرے۔

"ارے نہیں راجا صاحب، ان پلاسٹک کے چہروں میں سے ایک آپ ہی تو بھائے ہیں ہمیں۔"

"بھاگ لگے رہیں، ایک سکرپٹ رائٹر کو خفیہ کا حوالدار بھی تو اس ویر نے ہی بنایا ہے...... اک ذرا توجہ مطلوب ہے شہزادے کی۔"

راجا صاحب نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر شہریار مرزا کو دعوتِ نظارہ دی۔ باہر، کھڑی ترائی کے سرے پر تاڑ

کے جھنڈ میں وہ کھڑی تھی۔ تن تنہا سرمئی شال میں لپٹی لپٹائی بید مجنوں کی لچکتی ہوئی ڈال .....اور اس کی نظریں اسی کھڑکی پر جمی تھیں یا شاید ایسا محسوس ہو رہا تھا۔

"راجا صاحب! وہ ادھر ہی دیکھ رہی ہے یا نظر کا دھوکہ ہے؟"

"پیاریو! ابھی مل کر آ رہا ہوں تیری جند جان سے۔ بے شک ادھر ہی دیکھ رہی ہے لیکن وہ روشنی میں ہے اور نیم تاریکی میں۔ ہم دکھائی نہیں دے رہا ہے۔"

"آپ اس سے مل کر آئے ہیں، وہ کیسے؟ آپ کی گپ شپ ہے اس سے۔ پہلے تو نہیں بتایا آپ نے۔" شہریار مرزا نے شیو بنا لینے کے بعد تولیے سے اپنا چہرہ ڈھانپتے ہوئے پوچھا۔

"گپ شپ کیا ہونی ہے جگر۔ میں ستنام جی کا مداح ہوں اور یہ اس کی بیٹی ہے۔ یہ بات وہ بھی جانتی ہے، چھوٹی سی تھی جب میں ان کے گھر آیا جایا کرتا تھا ماں جی کو سلام کرنے۔ جب سے فلم لائن میں آیا۔ ان کے گھر آنا جانا موقوف ہو گیا۔ آج ناشتے کی میز پر میرے برابر آن بیٹھی، باتوں ہی باتوں میں مجھے ایک کی بجائے تین پراٹھے کھلا دیئے اس نے۔ پوچھ رہی تھی تیرا۔ کہنے لگی یہ آپ کے دوست کھائے پیئے بغیر کیسے زندہ ہیں؟ میں انجان بنا رہا۔ پھر کہنے لگی وہ ناشتہ کرنے نہیں آتے۔ ڈائننگ ہال میں۔ میں نے کہا کس کا پوچھ رہی ہے شہزادی؟ سَنی کا پوچھ رہی ہو تو وہ میری بلی ہے۔ کھائے گی بھی، پیئے گی بھی، لیکن ہم کھلائیں گے۔ تب میں نے یہ بات ذرا بلند آواز میں کہی تھی، جسے سن کر سب ہنس دیئے۔ اس وقت سَنی ڈائننگ ہال میں داخل ہوا ہی تھا، جب قہقہہ پڑا۔"

"یہ تو آپ نے کمال کر دیا راجا صاحب۔" شہریار مرزا کھل اٹھا۔

"سَنی کا گڈا تو بندھا ہی، وہ بھی اکھڑ گئی ایک بار۔ برا سا منہ بنایا اس نے اور سرگوشی کے انداز میں بولی، میں تو آپ کے کوہمری والے دوست کا پوچھ رہی تھی۔ رات، کھانا نہیں کھایا انھوں نے اور اب تک ناشتہ کرنے بھی نہیں آئے۔"

اب ہُد ہُد غسل خانے سے باہر نکل آیا تھا۔ سر پر الٹی سیدھی کنگھی پھیرتے ہوئے بولا: چلیں؟"۔

"نہا کر کیا پراٹھے جیسا چہرہ نکل آیا ہے، میرے ویر کا۔" راجا صاحب نے ہُد ہُد سے چہل کی۔

باہر، تاڑ کے جھنڈ میں وہ ابھی تک کھڑی تھی۔

☆☆☆☆

ظفر سید

لہو کی بُو ہوا میں ہے

پاؤجان جب سخت چڑھائی چڑھ کر تورا یبز ررغزہ پہنچا تو مشرقی افق پر صبح کی سفیدی نمودار ہو رہی تھی۔ یہاں ہوا میں خنکی تھی۔ مشکل راستے اور مشقت کی وجہ سے اس کا بدن پسینے سے شرابور ہو گیا تھا، اس لیے بلندی کی خنک ہوا اسے بہت خوشگوار محسوس ہوئی۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ نیچے وادی ابھی تک اندھیرے اور خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ البتہ کہیں کہیں سے کسی چڑیا کی چہکار خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔

پاؤجان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اس لیے وہ چند منٹ ستانے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا اور رغزہ پر نگاہ ڈالی۔ اس کی شکل لمبوتری افغانی روٹی کی طرح تھی۔ اس کی چوڑائی ایک میل کے قریب ہوگی، جب کہ لمبائی میں یہ پہاڑ سے لپٹی ہوئی دور تک چلی گئی تھی۔ پہاڑ نیچے جھاڑیوں اور اوپر درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ خاردار جھاڑیوں اور اونچی گھاس سے اٹی ہوئی وادی کے بیچوں بیچ ایک الگلڈ تھا جس کے کناروں پر شرول کے درختوں کے جھنڈ تھے۔

پاؤجان الگلڈ کے کنارے پر جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا اور پہاڑ کے مشرقی پہلو پر آنکھیں جما دیں۔ یہیں پہاڑ کے پیچھے سے چنکارہ رات کو چرنے کے لیے نیچے اترتے تھے، اور پو پھٹنے کے بعد واپس چلے جاتے تھے۔ ابھی آدھا گھنٹہ نہیں گزرا ہو گا کہ اس نے ایک ڈار ڈھلوان کی طرف سے خاصی لاپروائی سے ٹہلتے ہوئے آتے ہوئے دیکھی۔ ڈار میں چھ یا سات جانور تھے، جن کے بدن بھورے اور پیٹ سفید تھے اور دمیں چھوٹی چھوٹی تھیں جو مشکل سے ایک بالشت لمبی ہوں گی۔ بعض جانوروں کے سفید پیٹ اور بھوری کمر کے بیچ میں کالے رنگ کی موٹی آڑی لکیر تھی جو نہایت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ ان کی جسامت بکری کے تین چار ماہ کے بچے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ پاؤجان نے اندازہ لگایا کہ اس میں ایک نر تھا جو چلتے چلتے رکتا تھا اور جھاڑیوں میں منھ مار کر پھر اپنے راستے پر چل پڑتا تھا۔ چھ یا سات مادائیں اس کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھیں۔

دور مغرب کی طرف نصف میل کے فاصلے پر پاؤجان کو چنکارہ کی ایک اور ڈار ست قدموں سے چلتے ہوئے نظر آئی، لیکن وہ اس کے نشانے کی زد سے باہر تھی اس لیے اس نے دوبارہ اپنی توجہ پہلی ڈار پر مرکوز کر لی۔ نر خاصا پلا پلایا تھا، جب کہ مادائیں سب سوکھی ساکھی سی تھیں۔ 'لگتا ہے یہاں بھی نر سب کچھ چٹ کر جاتا ہے اور عورتوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑتا'، پاؤجان زیرِ لب مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے پہلے فربہ نر کو نشانہ بنانے

کا ارادہ کیا لیکن پھر سوچا کہ ایسا نہ ہو کہ پورا کنبہ لاوارث ہو جائے۔ اس نے ایک مادہ منتخب کی جو سعادت مندی سے نر کے پیچھے پیچھے کنوتیاں ہلاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا پاؤجان سے فاصلہ چار سو گز کے قریب ہوگا، پاؤجان کو کسی حد تک اعتماد تو تھا کہ وہ اپنی تھری ناٹ تھری سے اس فاصلے سے مادہ کو مار گرا سکتا ہے لیکن پھر اس نے سوچا کہ خطرہ مول لینے سے بہتر ہے کہ اس کے دو سو گز پر آنے کا انتظار کیا جائے تا کہ نشانہ خطا جانے کا امکان کم سے کم رہے۔ اس نے بندوق کی نال ایک پتھر پر ٹکا دی اور ایک آنکھ بند کر کے بندوق کی شست برابر کی اور لبلبی پر انگلی رکھ کر مناسب موقعے کی تلاش کرنے لگا۔

پاؤجان شاہی گرام میں اپنے دوست مسعود کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ اپنے قبیلے سے بیدخلی کے بعد اس نے کئی مہینے ادھر ادھر بھٹک کر گزارے۔ کبھی ہندوستان پر دھاوا بولنے کے لیے کوئی جتھا تیار ہوتا تھا تو وہ اس کا حصہ بن کر چلا جاتا تھا۔ اس سے اتنا کچھ وصول ہو جاتا تھا کہ ایک دو ماہ آرام سے گزر بسر ہو جاتی تھی۔ آخر اس کے بچپن کے ساتھی مسعود نے اسے اپنے حجرے میں ٹھہرنے کی دعوت دی تو اس نے خوشی خوشی قبول کر لی۔ لیکن چند دن سے اس نے محسوس کیا تھا کہ مسعود کے والد اپنے بیٹے کا اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ آج کے شکار کا منصوبہ دونوں نے مل کر تیار کیا تھا لیکن رات کو اچانک مسعود نے پیٹ میں درد کی شکایت کر کے معذرت کر لی اور پاؤجان کو اکیلے ہی آنا پڑا۔ لیکن خیر، جب وہ چنکارہ کاندھے پر لاد کر لے جائے گا تو اس کے لذیذ تکے کھا کر شاید مسعود کے والد کی شکایت دور ہو جائے۔

مشرقی ڈھلوان سے ایک تیز اور کرخت آواز بلند ہوئی جسے سن کر ہرن ایک لحظے کو ٹھٹک گئے۔ انھوں نے ہراسانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے لمبی لمبی قلانچیں بھر کر اس قدر تیزی اور پھرتی سے واپس پہاڑ کی سمت بھاگنا شروع کیا کہ پاؤجان کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس نے شست کو ہرنوں کے ساتھ گھمانے کی کوشش کی لیکن ہر قلانچ اس کے ہدف کو پانچ گز دور لے جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام ڈار پہاڑ کے پہلو میں غائب ہو گئی۔

پاؤجان نے با آواز بلند بہن کی گالی دی اور آواز کے ماخذ کی طرف دیکھنے لگا جو اب بلند تر ہو گئی تھی۔ جلد ہی یہ اس کے سر تک پہنچ گئی۔ یہ برطانوی فوج کا جہاز تھا جو وانہ کے ہوائی اڈے سے اڑا تھا اور شاید لوئی خرہ کنڈاؤ سے ہو کر کازی گرام پر بمباری کرنے جا رہا تھا۔

جہاز دیکھ کر پاؤجان ہمیشہ انگریز کی عقل پر حیرت زدہ رہ جاتا تھا کہ وہ کیسے نہ صرف ہوا میں اڑتا ہے بلکہ وہاں سے موت بھی برساتا ہے۔ بندوقوں کی جنگ کے زمانے میں آسانی تھی کہ دونوں طرف ایک ہی قسم کا یا کم از کم ملتا جلتا اسلحہ استعمال ہوتا تھا اور چوٹ برابر کی پڑتی تھی۔ پھر انگریز مشین گنیں لے آیا جو ایک میل دور سے بھی گولیوں کی بوچھاڑ کرنے پر قادر تھیں۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو اس نے میدانِ جنگ میں توپیں استعمال کرنا شروع کر دیں جو نہ صرف کئی میل سے بل کہ پہاڑ کے دوسری طرف بھی گولہ پھینک سکتی تھیں۔ البتہ

یہ ضرور تھا کہ علاقے کا جغرافیہ اس قسم کا تھا کہ یہ مشین گنیں توپیں ہر جگہ نہیں پہنچائی جا سکتی تھیں۔ پاؤ جان سوچتا تھا کہ جنگی حربے بیشک بدلتے رہیں، انگریز نئی مشینیں لاتا ہے، وہ چیز جسے انگریز بدل نہیں سکتا وہ اس علاقے کا جغرافیہ ہے، جو ہمیشہ سے انگریزوں کی ایجادات کا جواب رہا ہے اور رہے گا۔ لیکن اب پچھلے ایک دو سال میں یہ نئی مصیبت شروع ہو گئی تھی کہ اب انگریزوں نے آسمان سے بھی حملے کرنا شروع کر دیے تھے۔ پاؤ جان ہمیشہ سے جنگ میں مشین گن اور توپ استعمال کرنے کو بے غیرتی کی انتہا سمجھتا تھا کہ ڈرپوک دشمن سامنے آنے سے کتراتا ہے، اور چھپ کر دور سے وار کرتا ہے، لیکن اس شیطانی چرخے نے تو بے شرمی کا نیا باب رقم کر دیا تھا کہ انگریزی جہاز اکثر صبح کے اندھیرے میں بدترین چوروں کی طرح چپکے سے آتے تھے اور گاؤں پر بم پھینکنے کے بعد دم دبا کر بھاگ جاتے تھے۔ یہی نہیں بل کہ قبائلیوں کو سبق سکھانے کے لیے مویشیوں پر گولیاں برسا کر انھیں بھگا دینے سے بھی انھیں عار نہیں تھا۔ بعض اوقات وہ کسی قبیلے کو سبق سکھانے کے لیے تیار فصلوں پر آتش گیر بم برسا کر انھیں بھسم کر دیتے تھے۔ تاہم یہ سارے کام وہ تہذیب اور انسانیت کے دائرے میں رہ کر کرنے کی کوشش کرتے تھے جن پر قبائلی خوب ٹھٹھا اڑایا کرتے تھے۔ ایک بار جب پاؤ جان مکین میں تھا تو ایک جہاز نے کاغذ کے ٹکڑے پھینکے جن پر پشتو اور اردو زبان میں تحریر تھا:

اس گاؤں پر بمباری ہونے والی ہے۔ اپنی عورتوں اور بچوں کو گاؤں سے دور لے جائیں۔ اگر آپ انھیں کسی محفوظ مقام پر نہیں لے جا سکتے تو انھیں حکومت کی تحویل میں دے دیں۔ ان کا خیال رکھا جائے گا اور جب آپ حکومت کی اطاعت کی ہامی بھر لیں گے تو انھیں آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔

قبائلی اس لطیفے پر خوب ہنسے کہ ہم پہلے تو اپنی عورتیں اور بچے جانی دشمن کے حوالے کر دیں اور پھر اطمینان سے انھی کے خلاف جنگ لڑیں۔ تاہم دس بارہ دن سردی کے موسم میں غاروں میں رہنے کے بعد عورتوں، بیماروں اور بوڑھوں کی تکلیف دیکھتے ہوئے قبیلے نے فیصلہ کیا کہ فی الحال مصلحتاً صلح کر لی جائے۔ اس فیصلے کے دو تین دن کے بعد ایک اور جہاز آیا اور اب کے اس نے جو پرچیاں گرائیں ان پر لکھا تھا:

ہر آنکہ حکومت نے اطمینان کر لیا ہے کہ قبیلہ امن کا خواستگار ہے، اور اس نے حکومت کی عداوت اور مخالفت سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اب آپ اپنے گھروں کو سلامتی کے ساتھ لوٹ سکتے ہیں۔ ازراہِ کرم یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ کسی ان پھٹے بم کو کسی صورت میں ہاتھ نہ لگایا جائے ورنہ حکومت نتائج کی ہرگز ذمہ دار نہ ہوگی۔'

پاؤ جان کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ یہ جہاز کس قدر تباہی مچا سکتے ہیں۔ یہ صرف مشین گن سے گولیاں نہیں برساتے تھے بل کہ ان میں تباہ کن بم برسانے کی صلاحیت بھی تھی۔ انھوں نے کانڑی گرام کے ملک کا تین منزلہ عالی شان برج ایسا ملیامیٹ کیا تھا کہ جہاں برج کھڑا تھا اب وہاں زمین پر کئی گز گہرا گڑھا بن گیا تھا۔

اور آج تو اس خانہ خراب نے پاؤجان کو ذاتی نقصان بھی پہنچایا تھا کہ اس کے چنکاروں کو بھگا کر کئی گھنٹوں کی مشقت خاک میں ملا دی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ چاہے جہاز اسے گولیوں سے بھون دے یا بم پھینک کر راکھ کر دے، وہ اسے مزہ چکھائے بغیر نہیں رہے گا۔

جب یہ دشمن طیارہ گھاٹی میں سے برآمد ہو کر تیز، کانوں کو پھاڑنے والی پھٹ پھٹ کے ساتھ پاؤجان کے اوپر سے گزرنے لگا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور وہی بندوق جو مادہ چنکارہ پر تان رکھی تھی، جہاز کی طرف کر لی۔ موسیٰ نیکہ کے بازار میں سبز خان اسلحہ فروش تھری ناٹ تھری کی ایک گولی آٹھ آنے کی بیچتا تھا، اور پاؤجان جانتا تھا کہ اس نے کیا کیا پاپڑ بیل کر دس گولیاں حاصل کی تھیں لیکن اب اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنی گردنی اس شیطان کے چرخے پر خالی کر دے۔ یہ جہاز دو چوڑے لوہے کے تختوں جیسے اوپر نیچے نصب پروں پر مشتمل تھا، جو کئی پتلے پتلے شہتیروں کے علاوہ درجنوں آڑی ترچھی تاروں کی مدد سے جہاز کے لمبوترے مرکزی حصے سے جڑا ہوا تھا جس میں دو انگریز آگے اور پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ پاؤجان کو معلوم تھا کہ اگلا انگریز جہاز چلاتا تھا جب کہ اس کے پیچھے والے کا کام مشین گن گھما گھما کر گولیاں برسانا ہوتا تھا۔

پہلے تو پاؤجان کو لگا کہ اس کی گولیاں ضائع گئی ہیں کیوں کہ جہاز اس کے سر کے اوپر سے زوں کر کے بندوق کی زد سے باہر چلا گیا۔ لیکن پھر اس نے دیکھا کہ اس کی پرواز ناہموار ہو گئی ہے، اور وہ دائیں طرف کو ڈولنے لگا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی آواز بھی تیز اور مہین پھٹ پھٹ سے بھاری گھر گھر میں بدل گئی۔ وہ تیزی سے الگلڈ کے اندر اندر جہاز کے پیچھے بھاگنے لگا، ویسے ہی جیسے وہ اڑتے ہوئے تیتر کو نشانہ بنانے کے بعد اس کے پیچھے یوں بھاگتا تھا کہ ایک نظر آسمان سے گرتے ہوئے شکار پر ہوتی تھی اور دوسری زمین پر تاکہ گڑھوں اور جھاڑیوں سے بچا جا سکے۔ بھاگتے بھاگتے وہ اپنی کمر سے لٹکا خنجر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیتا تھا تاکہ پرندہ مردار ہونے سے پہلے پہلے حلال کر لیا جائے۔

دوڑتے دوڑتے الگلڈ کے کنارے اونچے ہونے لگے اور جہاز اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ تیزی سے الگلڈ کے دائیں کنارے پر چڑھا اور جہاں آخری بار جہاز نظر آیا تھا اس طرف دوڑنے لگا، لیکن جہاز کا کہیں اتہ پتہ نہ چلا۔ اس کا دل مایوسی سے بھر گیا، کہیں وہ ڈولتے ڈولتے سنبھل تو نہیں گیا؟ کیا پتہ اسے گولی لگی ہی نہ ہو اور پائلٹ ویسے ہی کوئی کرتب دکھا رہا ہو۔ لیکن پھر اسے وادی کے مشرقی کنارے پر ڈھلوان کے قریب سے دھواں اٹھتا نظر آیا۔ وہ فوراً بھاگم بھاگ وہاں پہنچ گیا۔ چند لمحے قبل وہی جہاز جو کانوں کو پھاڑ دینے والا بے ہنگم شور مچا رہا تھا اور جو گولیاں اور بم برسا کو گاؤں کے گاؤں کو نیست و نابود کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، اب خاموشی سے پہیے آسمان کی طرف اٹھائے الٹے پڑے ہوئے سیاہ لال بیگ کی طرح بے یار و مددگار اور لاوارث دکھائی دے رہا تھا۔

پاؤجان بندوق تانے ہوئے جہاز کے ملبے کا جائزہ لینے لگا۔ پر ٹوٹ چکے تھے اور تاریں مڑ تڑ کر ادھر

ادھر جھول رہی تھیں۔ جہاز کے اوپر کو اٹھے ہوئے پہیے ابھی تک ہولے ہولے گھوم رہے تھے، جیسے انھیں یقین نہ آ رہا ہو کہ ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ دونوں انگریز خون میں لت پت بے حس و حرکت تھے۔ ایک ابھی تک جہاز کے ملبے کے اندر ہاروت ماروت کی طرح الٹا لٹکا ہوا تھا جب کہ جہاز سے دوسرا کچھ دور جا گرا تھا۔ پاؤ جان نے جہاز کو ٹوٹے ہوئے پر سے پکڑ کر ہلایا جلایا تو اسے حیرت ہوئی کہ یہ اس کے اندازے سے کہیں ہلکا تھا۔ اس نے زور لگا کر جہاز کو سیدھا کرنے کی کوشش کی تو اس کے اندر پھنسے ہوئے انگریز کے کھانسنے اور کراہنے کی آواز آئی۔ پاؤ جان نے جہاز کا پر چھوڑ کر دوبارہ بندوق تان لی۔ انگریز کا موٹا چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا اور ایک ٹانگ ٹوٹ کر بڑے عجیب زاویے پر مڑی ہوئی تھی۔ پاؤ جان نے گالی دے کر نال اس کے ماتھے کی طرف کر لی اور انگلی لبلبی پر رکھ لی۔

'اودریگا، اودریگا، اودریگا!' جہاز میں الٹا لٹکا ہوا انگریز چلایا تو اس کے منھ سے خون کی کلی نکل گئی۔ پاؤ جان نے نفرت سے زمین پر تھوکا اور نال اس کی آنکھوں کے درمیان ماتھے پر چبھو دی۔ 'اودریگا،' انگریز نے دوبارہ کہا۔ اب پاؤ جان کو شک ہوا کہ شاید وہ پشتو کا لفظ بولنے کی کوشش کر رہا ہے جس کا مطلب ہے، کھڑے ہو جاؤ یا رک جاؤ۔ 'کیا کہہ رہے ہو خنزیر کے تخم؟' پاؤ جان نے کہا۔ 'شکر کرو کہ میں ان محسودوں کی طرح نہیں ہوں جو تم حرام کے پلوں کے بدن میں ہزار چھید کر کے ان میں گھاس اور مٹی بھر دیتے ہیں، میں تو بس ایک وار میں تمھیں جہنم پہنچا دوں گا۔'

انگریز زور زور سے سر ہلانے اور انگلی سے اپنی قمیص کی اوپری جیب کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ 'کیا ہے تمھاری جیب میں؟ کوئی نیا تماشا کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟ مرتے مرتے بھی کرتب دکھانے سے باز نہیں آتے، باندر کی اولاد؟' انگریز زور زور سے سانس لے کر کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا لیکن پاؤ جان کو صرف 'انعام انعام' کا لفظ سمجھ میں آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر انگریز کی وردی کی جیب ٹٹولی۔ اس کے سینے پر طرح طرح کے فیتے اور تمغے جڑے ہوئے تھے۔ جیب میں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ پاؤ جان نے بندوق کندھے پر ڈال لی اور خون سے لتھڑا ہوا کاغذ کھولا تو اس کی انگلیاں بھی گیلی ہو گئیں۔ اس نے گالی دے کر ہاتھ اپنی قمیص کے دامن پر رگڑ کر خشک کیا۔ کاغذ پر پشتو اور اردو میں لکھا ہوا تھا:

آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ایک سرکاری افسر کی جان بچا کر سرکارِ انگلیشیہ کی مدد کی۔ آپ کی اس بے مثال خدمت کا صلہ دینا ممکن نہیں ہے لیکن اگر آپ اس سرکاری افسر کو بحفاظت حکومت تک پہنچا دیں تو آپ کی وفاداری کی قدر کرتے ہوئے حکومت آپ کے قبیلے کو تعریفی سند کے علاوہ نو ہزار روپے نقد انعام عطا کرے گی۔

نو ہزار روپے؟ پاؤ جان کی تو آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ نو ہزار روپے؟ انگریزی تھری ناٹ تھری ڈیڑھ سو روپے کی آتی ہے، گائے پچاس روپے کی اور پچاس ہی میں بیوی آ جاتی ہے۔ بیس ہزار میں تو پورا قبیلہ خریدا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں انگریز کی کوئی چال نہ ہو، آخر انگریز اپنی مکاری اور عیاری کے بل ہی

پرتو سارے ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے، ورنہ اوران کے پاس ہے کیا۔ بہادری اور شجاعت میں تو یہ ہمارے ادنیٰ سے ادنیٰ قبائلی کے پاسنگ بھی نہیں۔ پاؤ جان نے سوچا کہ انعام ونعام پر لعنت بھیج کر ماتھے میں دہکتا ہوا سیسہ اتار کر اس بھدے اور کریہہ صورت انگریز سے بمباری کر کے قبائل کے گاؤں کے گاؤں تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہرن بھگانے کا بدلہ بھی لے لے۔ لیکن اگر اس پرچی پر لکھی بات سچی نکلی تو پھر کیا ہوگا؟

وہ خاصی دیر شش و پنج کے عالم میں بندوق ہاتھوں میں لیے کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اسی دوران تیز تیز بولنے کی آوازیں آئیں اور چند لمحوں کے اندر اندر پانچ محسود وہاں پہنچ گئے۔ 'ہٹ جاؤ یہاں سے منحوس وزیر، یہ جہاز ہم نے گرایا ہے، اس پر ہمارا حق ہے،' ان میں سے ایک نے کہا۔

پاؤ جان کا تو جیسے دماغ ہی گھوم کر رہ گیا۔ اس نے بندوق بولنے والے کی طرف تان لی۔ اس کا چہرہ بھاگ کر آنے کی وجہ سے تمتمایا ہوا اور سانس چڑھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں رخسار پر چاقو کا گہرا زخم تھا جو ہونٹوں کے اوپر تک آیا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کم از پانچ فٹ لمبی سرخ پھندنوں سے سجی ہوئی جزیل تھی جو اس کے قد سے اگر لمبی نہیں تو کچھ زیادہ چھوٹی بھی نہیں ہوگی، جب کہ کمر سے ایک لمبا چھرا لٹک رہا تھا۔

'جہاز تم نے گرایا ہے؟ شکل دیکھی ہے تم نے اپنی؟ کبھی زندگی میں چڑیا بھی گرائی ہے تم نے؟ بے ایمان، زیادتی خور کہیں کے، شرم نہیں آتی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بولتے ہوئے؟' پاؤ جان نے کہا۔

محسود نے اپنی جزیل اٹھا کر پاؤ جان کی طرف کر لی۔ 'تم مسعود کے ساتھی ہو اس لیے لحاظ کر رہا ہوں۔ زیادہ بک بک کی بجائے سیدھے سیدھے دم دبا کر جہاں سے آئے ہو وہیں واپس چلے جاؤ، ورنہ مار کر یہیں دفنا دوں گا،' محسود نے کہا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی بندوقیں پاؤ جان کی جانب تان لیں۔

پاؤ جان نے سوچا کہ وہ ٹھگنے محسود کو تو آسانی سے ٹھکانے لگا سکتا ہے، لیکن اس دوران خود اس کے بدن میں چار گولیاں اتر جائیں گی۔ لیکن دوسری طرف اگر وہ میدان چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو پھر زندگی بھر اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکے گا۔ وہ کچھ دیر اسی حالت میں رہے کہ پاؤ جان کی بندوق ٹھگنے محسود کے سینے کی طرف اور ان کی پانچ نالیں اس کے جسم پر تنی رہیں۔ پھر پاؤ جان نے اپنی بندوق اوپر اٹھا لی۔ 'اچھا بھئی تم جیتے، ہم ہارے، میں چلتا ہوں،' یہ کہہ کر پاؤ جان پیچھے ہٹا اور بجلی کی سی پھرتی سے چمک کر تھری ناٹ تھری کی نال ابھی تک جہاز میں الٹے لٹکے ہوئے انگریز کے گال پر رکھ دی۔

'تمہیں یہ انگریز چاہیے نا؟ اسی کے لیے اپنا تم ایمان بیچ رہے ہو؟ لو میں اسی کو اڑا دیتا ہوں، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔'

☆ ☆

جرگہ ایک کھلے میدان میں منعقد ہوا۔ سفید ریش اور جوان دو چوڑی قوسوں کی شکل میں زمین پر بیٹھ گئے۔ ایک طرف پاؤ جان کے قبیلے کے طوری خیل وزیر، اور دوسری طرف محسود۔ دونوں طرف سے بیس بیس

لوگ شریک تھے۔ جن کو زمین پر خشک گھاس ملی وہ وہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ بعضوں کے حصے میں مٹی آئی۔ جنھیں کپڑے خراب ہونے کا ڈر تھا، وہ تو اکڑوں ہی بیٹھے رہے، دوسرے مٹی ہی میں پھسکڑا مار کر براجمان ہو گئے۔ محسود اور وزیر ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان میں سے کئیوں کی آپس میں رشتے داریاں اور دوستیاں تھیں۔ بیچ بیچ میں لطیفوں خبروں اور تازہ افواہوں کا تبادلہ بھی جاری تھا۔ جب بھی کوئی چٹ پٹا چٹکلہ چھوڑتا تو پورا جرگہ لوٹ پوٹ ہو جاتا۔

طوری خیلوں کی جانب سے ملک صابر وزیر نے مقدمہ پیش کیا:

'جیسا کہ آپ سب معزز ساتھی جانتے ہیں، ہم سب اپنی صدیوں پرانی روایات کے مطابق ایک تنازعے پر غور کرنے اور اس کا حل ڈھونڈنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ پاؤ جان، جو آپ کے سامنے موجود ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اس مہینے کی بارہ تاریخ کو تو رایغز رغزہ میں انگریز کا ایک جہاز تنِ تنہا بغیر کسی کی مدد کے اپنی بندوق سے فائر کر کے مار گرایا ہے۔ جہاز میں دو انگریز موجود تھے جن میں سے ایک جہاز گرنے سے مر گیا، جب کہ دوسرا زندہ بچ گیا تھا اور ہماری تحویل میں اب بھی موجود ہے۔'

ملک صابر نے سنہرے رنگ کی تلے کی مخروطی ٹوپی پر سیاہ رنگ کی بہت بڑی پگڑی باندھ رکھی تھی جس کا شملہ بار بار گر جاتا تھا اور اسے بار بار اسے درست کرنا پڑتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کاہو کی لکڑی کا مضبوط عصا تھا جس کے سرے پر لوہے کا پترا چڑھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

'دوسری جانب یار محمد محسود، جو میرے بائیں طرف موجود ہے، اس کا کہنا ہے کہ جہاز کو اس نے اور اس کے چار دوسرے ساتھیوں نے گرایا ہے، اس لیے جہاز اور اس کے انگریز پر ان کا حق ہے۔ موقعے پر کوئی گواہ موجود نہیں تھا جس نے فریقین کو گولیاں چلاتے یا جہاز کو گرتے دیکھا ہو، اس لیے اب اس معزز جرگے پر یہ ذمہ داری آن پڑی ہے کہ وہ دونوں کے بیانات کی روشنی میں حالات و واقعات کا جائزہ لے اور فیصلہ کرے کہ اس واقعے میں بچ جانے والے انگریز پر کس کا حق بنتا ہے۔ دونوں فریقوں کو جرگے کا فیصلہ منظور ہوگا۔'

اس کے بعد شام تک بحث ہوتی رہی، پاؤ جان اور یار محمد نے اپنا موقف اور دعویٰ پیش کیا، لیکن جرگہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اگلے دن جرگے کے آٹھ نسبتا تندرست ارکان، چار وزیر اور چار محسود، پاؤ جان اور یار محمد کے ساتھ چڑھائی چڑھ کر جائے وقوعہ کے معائنے کے لیے گئے۔ پاؤ جان نے واقعے کی جزئیات ان کے پیش آنے کے وقت اور محلِ وقوع کی مناسبت سے پیش کیں۔ اس نے لیٹ کر، بیٹھ کر، کھڑے ہو کر اور دوڑ کر بتایا کہ کب کیا ہوا تھا۔ جہاز کس طرف سے نمودار ہوا، پہلی گولی کہاں سے چلائی گئی، الگنڈ کے اندر وہ کہاں تک دوڑا، کس جگہ سے الگنڈ کے کناروں سے چڑھ کر باہر آیا۔ جرگے نے الگنڈ کی ریت میں اور ادھر ادھر جھاڑیوں میں اس کے چلائے ہوئے تھری ناٹ تھری کے کچھ کھوکھے بھی اکٹھے کر لیے۔ جہاز کے ملبے میں سے بھی تھری ناٹ تھری کا ایک کھوکھا برآمد ہو گیا۔

دوسری جانب یار محمد نے بتایا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک شادی میں شرکت کرنے شاہی گرام جا رہا تھا کہ اس نے جہاز اڑتے ہوئے دیکھا اور اس پر فائر کھول دیا۔ تاہم وہ نہ تو جرگے کو تفصیلات کے بارے میں مطمئن کر سکا اور نہ ہی اس کی جزئیل کے کارتوسوں کے کھوکھے کہیں پائے گئے۔

اگلے دن جرگے کا متفقہ فیصلہ آ گیا۔ جہاز پاؤ جان نے اکیلے مار گرایا ہے۔ پاؤ جان اور اس کے دوست اٹھ کر اتن ناچنے لگے۔ گاؤں کا ڈھولکی بھی آ گیا اور اس نے اس قدر زور سے اتن کی دھن پر ڈھول پیٹنا شروع کر دیا کہ تمام وادی گونجنے لگی۔ رفتہ رفتہ نصف موسیٰ نیکہ اتن میں شامل ہو گیا۔ محسود اٹھ کر آہستہ آہستہ اپنے علاقوں کو جانے لگے۔

انگریز کا نام مارٹن ہیسٹنگ تھا۔ حادثے میں اس کی ٹانگ پنڈلی کے قریب سے ٹوٹ گئی تھی اور کندھے پر بھی گہرا زخم آیا تھا۔ قبائلیوں نے اس کے علاج اور آرام میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اسے جس حجرے میں رکھا گیا تھا وہاں ایک لڑکا ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا جو اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا۔ اسے ’ڈیرہ مننہ،‘ ’خدائے پہ امان‘ اور اس جیسے چند معمولی الفاظ کے علاوہ پشتو نہیں آتی تھی اور نہ ہی پورے موسیٰ نیکہ میں کوئی انگریزی جانتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے ساتھ ابلاغ میں کسی قسم کا مسئلہ پیش نہیں آیا۔ اسے شروع ہی میں اشاروں میں سمجھا دیا گیا تھا کہ اگر وہ تعاون کرے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ وہ مقامی کھانے کچھ زیادہ رغبت سے نہیں کھاتا تھا، جس کا قبائلیوں کو بڑا دکھ تھا۔ آخر پتہ چلا کہ بزنزئی میں ایک شخص کے پاس کہیں سے لوٹے گئے کھانوں کے ڈبے تھے جس کو اس نے حرام ہونے کے خدشے کے پیش نظر کھولا تک نہیں تھا۔ وہ سارے ڈبے لا کر ہیسٹنگ کو دے دیے گئے، جو انھیں ایک ایک کر کے بڑے شوق سے چٹ کر گیا۔

دو ہفتوں میں اس کی اچھی خاصی داڑھی بڑھ آئی تھی۔ گاؤں کے نائی نے آ کر استرے سے اس کی داڑھی مونڈی تو اچھا خاصا پراٹھے جیسا لال منہ نکل آیا۔

جرگے کے فیصلے کے اگلے ہی دن منشی محبت کو بلا کر اردو زبان میں ایک چٹھی تیار کر لی گئی، جس میں سب سے پہلے مطلوب الیہ کی خیریت دریافت کی گئی، اس کے بعد ہیسٹنگ کی خیریت کی اطلاع دی گئی، ساتھ میں اس کی جیب سے برآمد ہونے والی انعام والی پرچی نتھی کر کے اسے تین آدمیوں کے حوالے کر کے بنوں روانہ کر دیا گیا۔

کسی نے کہا کہ رزمک اور میرام شاہ کے علاقوں میں رواج ہے کہ لوگ انگریز اسیروں کو آختہ کر کے حکومت کے حوالے کرتے ہیں اس لیے ہیسٹنگ کے ساتھ بھی یہی عمل کیا جائے۔ ابھی اس پر غور و فکر جاری تھا کہ ٹانک سے ملنے والے ایک وزیر کی زبانی معلوم ہوا کہ انگریز پورا تاوان صرف اسی صورت میں ادا کرتے ہیں اگر قیدی کے تمام اعضا سلامت ہوں۔ کوئی بھی عضو کم ہونے کی صورت میں تاوان کی رقم آدھی ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ اب بھی ہیسٹنگ کو آختہ کرنے کے حق میں تھے لیکن پاؤ جان سختی سے آڑے آ گیا۔ اس نے حساب لگا لیا تھا کہ اگر ہیسٹنگ کو آختہ کیا گیا تو اس کا ہر خصیہ قبیلے کو ساڑھے بائیس سو روپے میں پڑے گا۔

اختر رضا سلیمی

جَندر

(۱)

مجھے یقین ہے کہ جب پو پھٹے گی اور روشنی کی کرنیں دروازے کی درزوں سے اندر جھانکیں گی تو پانی سر سے گزر چکا ہوگا اور میری سانسوں کا زیر و بم، جو اس وقت جندر کی کوک اور ندی کے شور سے مل کر ایک کرب آمیز سماں باندھ رہا ہے، کائنات کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو چکا ہوگا اور پیچھے صرف بہتے پانی کا شور اور جندر کی اداس کوک ہی رہ جائے گی؛ جو اس وقت تک سنائی دیتی رہے گی جب تک جندر کے پچھواڑے موجود، معدوم ہوتے راستے پر سے گزرتے ہوئے، کسی شخص کو اچانک میرا خیال نہ آجائے اور وہ یوں ہی بغیر کسی پیشگی منصوبے کے، محض میرا اتا پتا کرنے، جندر کے صحن کو اس اجاڑ راستے سے ملانے والے، سات قدمی زینے پر سے اترتے ہوئے جندر کے دروازے تک نہ آجائے۔ یہ دروازہ، جسے میں رات کو سونے سے پہلے ہمیشہ اندر سے کنڈی لگا دیا کرتا تھا؛ آج اسے بند کرتے ہوئے میں نے احتیاطاً کنڈی نہیں لگائی؛ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ آج میری زندگی کی آخری رات ہے اور میرے بعد اسے، کسی مانوس یا ان جانی دستک پر، اندر سے کھولنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

میرے بعد یہاں آنے والا پہلا شخص کون ہوگا؟

یہ سوال میرے ذہن میں پہلی بار آج سے پینتالیس دن پہلے اس وقت ابھرا تھا، جب میں نے اپنی اور جندر دونوں کی زندگی کی آخری چونگ پیس کر، گھومتے پاٹ کے ساتھ لگی لکڑی کی وہ کیل اٹھائی تھی، جس کے اٹھانے سے جندر کا اوپر والا پاٹ تھوڑا سا اوپر اٹھ کر معمول سے دوگنی رفتار میں گھومنا شروع کر دیتا ہے اور اس کی سریلی گونج یک دم ایک اداس کوک میں بدل جاتی ہے۔ اگرچہ پچھلے سات آٹھ ماہ سے جندر پر آنے والی چونگیں کم ہو گئیں تھیں اور اس دوران میں کچھ دن تو ایسے بھی آئے کہ سارا سارا دن کوئی چونگ نہیں آئی اور جندر کا اوپر والا پاٹ اپنی معمول سے دوگنی رفتار میں گھومتا رہتا اور اپنے پاٹ گھساتا اور میرے وجود میں لگی کرب کی دیمک کو مزید رزق فراہم کرتا رہتا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے اندر کے سناٹے سے ایک ایسی آواز، جسے میں کانوں سے نہیں دل کے وسیلے سے سنتا تھا، مسلسل آتی رہتی تھی کہ چونگوں کا یہ تعطل عارضی ہے۔ اب اسے اتفاق کہیے یا میری پیش بینی کی صلاحیت کہ میں جیسا سوچتا، ویسا ہی ہوتا؛ ایک دو دن بعد ایک مرتبہ پھر کوئی نہ کوئی چونگ آجاتی اور میں اسے جندر کے کھارے میں انڈیل کر جوں ہی لکڑی کی کیل گراتا؛ جندر کی اداس کوک، سریلی گونج میں تبدیل ہو جاتی اور میرے مضمحل بدن میں سیروں خون دوڑ جاتا۔ ابھی میں اسے پیس ہی رہا

ہوتا کہ کوئی نہ کوئی اور چونگ بھی آ جاتی اور ایک مرتبہ پھر یہ سلسلہ بحال ہو جاتا ۔

لیکن پینتالیس دن پہلے کی ،جس اداس شام کا میں ذکر کر رہا ہوں ،اس دن آخری چونگ پیس کر ،پسا ہوا آٹا سمیٹ کر بوری میں ڈالنے کے لیے، میں نے بوری کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنی اور جندر دونوں کی زندگی کی آخری چونگ پیس چکا ہوں؛ پھر جوں ہی میں نے لکڑی کی کیل اٹھائی اور جندر کی سریلی گونج اداس کوک میں تبدیل ہوئی مجھے اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ موت، جسے میری پیدائش کے ساتھ ہی میرے وجود میں رکھ دیا گیا تھا ،اور جو کچھ روز پہلے تک مجھے بہت دور سے آنے والی آواز جیسی لگتی تھی،عنقریب میرا کام تمام کرنے والی ہے۔ تب یہ خیال کہ میرے بعد یہاں آنے والا پہلا شخص کون ہوگا،بجلی کے ایک کوندے کی طرح میرے دماغ میں لپکا تھا اور اگلے ہی لمحے میری آنکھوں کے سامنے کئی انسانی چہروں کے خدوخال آپس میں یوں گڈمڈ ہوئے تھے کہ میں کسی بھی چہرے کو اپنے دماغ میں تصویر نہیں کر پایا تھا۔ اگر میں اپنے گزشتہ تجربے کو مدنظر رکھتے ہوئے منطق کا سہارا لیتا تو میرے پاس ایسا سوچنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی لیکن اس روز جب میرے اندر کے سناٹے کو کسی آواز نے نہیں پاٹا تو میں سمجھ گیا کہ میں اپنی اور جندر کی زندگی کی آخری چونگ پیس چکا ہوں ۔ اس دن زندگی میں پہلی بار مجھ پر منکشف ہوا کہ ذہن میں آنے والے کسی خیال کو نہ تو روکا جا سکتا ہے اور نہ ہی بدلا ۔ البتہ میں،اس بارے میں، کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا میری سوچ نے چونگیں لے کر آنے والوں کے رخ تبدیل کر دیے تھے یا ان کے تبدیل شدہ رخوں کو میری پیش بینی کی صلاحیت نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔

میں نے اپنے بچپن میں سنا تھا اور اب گزشتہ پینتالیس دنوں سے خود بھی اس تجربے سے گزر رہا ہوں کہ جب آدمی مرنے کے قریب ہوتا ہے تو اس کے وہ خفتہ حواس جنھیں اس نے ساری زندگی کام میں نہیں لایا ہوتا،موت کی آہٹ سے جاگ اُٹھتے ہیں اور اسے اپنی موت کے حوالے سے پیش آمدہ حالات کی خبر پہلے ہی سے ہو جاتی ہے لیکن موت کے بعد رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں وہ صرف قیاس آرائیاں ہی کر سکتا ہے ۔ یہی وجہ ہے گزشتہ پینتالیس دنوں میں ، جب سے میں اپنی ماں اور موت دونوں کا ہاتھ اپنے شانوں پر محسوس کر رہا ہوں، میں نے اپنی موت کے بارے میں اتنا نہیں سوچا جتنا کہ اس آدمی کے بارے میں، جو میرے بعد یہاں آنے والا پہلا شخص ہوگا۔ وہ کون ہوگا؟ اتنے دنوں کی سوچ بچار کے بعد بھی میں،اس بارے میں، کچھ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ ہاں یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرا بیٹا جمشید نہیں ہوگا کہ گزشتہ قاعدے کے مطابق اب اس کی واپسی جون میں ہونا تھی؛ یعنی تقریباً چار ماہ بعد ۔

ابھی دو ماہ پہلے دسمبر کے تیسرے میں جب وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گاؤں آیا تھا تو کچھ دیر کے لیے میرے ہاں بھی چلا آیا تھا اور یہاں اسی تھلے پر، جہاں میں ابھی لیٹا ہوا دھیرے دھیرے موت کی کھائی میں اتر رہا ہوں، یوں سر جھکائے بیٹھا رہا تھا جیسے اسے ایک جندروئی کے بیٹا ہونے پر شرمندگی ہو۔ جب وہ اٹھنے لگا تھا تو اس نے حسبِ روایت میری جیب میں کچھ روپے بھی ٹھونس دیے تھے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے ان کی

ضرورت نہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جندر کی دہلیز پار کرتے ہوئے، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا تھا کہ اگر میں اس کے ساتھ شہر چلنا چاہوں تو اسے خوشی ہوگی؛ حالاں کہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ میری خوشی یہیں رہنے میں ہے۔

وہ سال میں دو ہی مرتبہ گاؤں آتا تھا؛ جون اور دسمبر میں: جب اس کے بچوں کے سکول بند ہوتے اور وہ خود دفتر سے چند دنوں کی رخصت لے لیتا۔ رخصت منظور ہوتے ہی وہ بیوی بچوں کو ساتھ لیتا اور آب و ہوا تبدیل کرنے یہاں آ جاتا۔ گاؤں آنے سے پہلے وہ گاؤں کی مرکزی مسجد کے خادم کو اطلاع کر دیتا، جو اس گھر کی، جس کے صحن میں اس کی ماں کی ڈولی اتری تھی اور جہاں اس نے بچپن کے دن گزارے تھے، صفائی ستھرائی کر دیتا تھا۔ گرمیوں میں تو وہ دو تین ہفتے گاؤں میں گزارتا کہ معتدل موسم کے باعث اس کے بیوی بچے اپنا وقت یہاں گزارنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے، لیکن سردیوں میں وہ محض دو تین ہی دن یہاں رکتا ہے کہ اس کے بیوی بچے یہاں کی شدید سردی زیادہ دن برداشت نہیں کر سکتے اور اس کے سر پر، ان کے بیمار ہونے کا خدشہ، ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا۔ ہاں اگر ان دنوں برف پڑی ہوتی تو وہ اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک دو دن مزید بھی ٹھہر جاتے کہ جب تک برف باری کے بعد آسمان صاف نہ ہو اور فضا سے راتوں کو اترنے والی اوس، مری اور گلیات کے پہاڑوں کی چوٹیوں سے آنے والی یخ بستہ ہوا سے مل کر برف پر کہرے کی وہ موٹی تہہ نہ جما دے، جو اسے سخت کر دیتی ہے سردی کا احساس نہیں ہوتا؛ لیکن اب یہاں برف بھی تو اتنی ہی پڑتی ہے کہ تیسرے چوتھے روز پگھل کر کچھ تو زمین ہی میں جذب ہو جاتی ہے اور کچھ جھرنوں، چشموں، آبشاروں اور چھوٹی چھوٹی نالیوں سے ہوتی ہوئی اس ندی کے پانی میں آملتی ہے، جس میں میرا یہ جندر اس وقت کوک رہا ہے۔ ستر سال سے اوپر کا ہونے کے باوجود میں کبھی اس بات کا ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا پایا کہ ایسے دنوں میں جندر کے بھاری پاٹ کو گرمانے میں پگھلی ہوئی برف کا کتنا حصہ ہوتا ہے لیکن بہر حال ہوتا ضرور ہے۔

اس بار، چوں کہ برف باری دسمبر کے پہلے ہی ہفتے میں ہو گئی تھی اور اس کے بچوں کو سردیوں کی چھٹیاں پندرہ دسمبر کے بعد ہوئیں اس لیے وہ برف سے لطف اندوز نہ ہو سکے اور گاؤں آنے کے بعد تیسرے ہی روز صبح سویرے واپس شہر چلے گئے کہ ان کے نازک بدن، برف ڈھلنے کے بعد پڑنے والی اس کہر کی شدت برداشت نہیں کر سکتے تھے، جو ٹھہرے ہوئے پانی پر شیشے کی ایک ایسی مضبوط تہہ جما دیتی ہے، جس پر پاؤں رکھ کر، میں اپنے بچپنے میں، اس کے نیچے موجود چھوٹی چھوٹی مچھلیاں دیکھا کرتا تھا۔

اب قاعدے کے مطابق اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی آمد جون ہی میں ہونا تھی۔ یہاں سے واپسی پر، دونوں میاں بیوی نے یقیناً یہی منصوبہ بنایا ہوگا لیکن اب کی بار، ان کا یہ منصوبہ اس وقت دھرے کا دھرا رہ جائے گا؛ جب انھیں اطلاع ملے گی کہ میری موت واقع ہو چکی ہے۔ جب بذریعہ فون میرے بیٹے کو اس کے دفتر میں، میری موت کی اطلاع دی جائے گی تو وہ یقیناً دفتر کے ضروری معاملات نمٹا رہا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس وقت کسی اہم میٹنگ میں ہو اور اس کے ذاتی اسٹاف میں سے کوئی شخص اسے یہ اطلاع کاغذ پر لکھ

کر بھجوائے اور اسے میٹنگ سے اٹھ کر آنا پڑے۔ بہر حال جیسے ہی اسے یہ اطلاع ملے گی وہ یک دم سکتے میں آ جائے گا، اس لیے نہیں کہ اس کے باپ کی موت واقع ہو چکی ہے بل کہ اس لیے کہ اسے کفنانے دفنانے کے لیے اسے ہر حال میں یہاں آنا پڑے گا اور وہ بھی اپنے بیوی بچوں سمیت۔ سب سے پہلے وہ اس کی اطلاع اپنے باس کو دے گا، جو اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے، اس سے رسمی تعزیتی الفاظ کہے گا۔ پھر وہ فوراً اپنی بیوی کو فون کرے گا، جس پر یہ خبر بجلی بن کر گرے گی کہ ابھی تو دو ماہ پہلے گاؤں سے ہو کر آئے ہیں اب پھر جانا پڑے گا۔ اس کے گھر میں ایک ہنگامی حالت نافذ ہو جائے گی۔ بچوں کی اسکول سے غیر حاضری ایک الگ مسئلہ ہو گی کہ ان کے امتحانات بھی سر پر ہوں گے اور ایسے دنوں میں انھیں اسکول سے چھٹی کرانا کسی صورت بھی ان کے مستقبل کے لیے اچھا نہیں ہو گا۔ پھر اس دشوار گزار پہاڑی راستے کے سفر کا تردد اور وہ بھی بغیر کسی پیشگی منصوبے کے۔ اس پر مستزاد یہ کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر وقت غمگین رہنے کی اداکاری کرنا۔

اس کی بیوی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ گاؤں کی وہ عورتیں ہوں گی جن سے ملتے ہوئے اسے ہمیشہ گھن آتی تھی لیکن اب تو اسے، ان سے بغل گیر ہو کر بین بھی کرنے ہوں گے اور ان کے جسموں سے آنے والی گوبر اور نسوار کی بساند اسے کئی دن تک چین سے سونے نہیں دے گی۔ ان کے بچے جو یہاں آ کر انسانوں سے زیادہ پڑوسیوں کے ڈھور ڈنگروں سے گھل مل جاتے ہیں، اور بلی اور بکری وغیرہ کے بچوں کو تو پکڑ کر گود میں اٹھا لیتے ہیں، ان کے لیے الگ سے دردسر ہوں گے کہ اس مصنوعی سوگوار ماحول میں، جب کہ ان کے پاس کئی دنوں تک تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہے گا، ان پر کڑی نظر رکھنا ان کے لیے ناممکنات میں سے ہو گا۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہو گی کہ اس کے دفتر کے وہ سنگی ساتھی، جنھیں مرعوب کرنے کے لیے اس نے اپنے باپ دادا کی داداگیری کے دلچسپ قصے سنائے ہوں گے اور وہ اس کی عزت اور توقیر ایک اعلیٰ افسر سے زیادہ ایک اعلیٰ حسب نسب رکھنے والی شخصیت کے طور پر کرتے رہے ہوں گے، اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی تعزیت کے لیے یہاں آ جائیں گے اور وہ گاؤں والوں کی باتوں سے کسی نہ کسی طرح تو جان ہی جائیں گے کہ اس کا باپ ایک جندروئی تھا اور اس کی موت یہاں بہنے والی ایک ندی کے ویران جندر میں انتہائی کس مپرسی کی حالت میں ہوئی۔ ممکن ہے ان میں سے کچھ لوگ تو جندر دیکھنے کی خواہش کریں اور اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی جائے مرگ پر پہنچ جائیں۔

اس صورت حال کا سامنا اسے کب کرنا پڑے گا، اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ کب وہ پہلا شخص، جس نے گاؤں والوں کو میری سرد ہو چکی لاش کے بارے میں بتانا ہے، یہاں سے گزرتے ہوئے بغیر کسی پیشگی منصوبے کے، یوں ہی اتفاقاً میرا اتا پتا کرنے، جندر کے صحن کو، اس کے پچھواڑے سے گزرتے ہوئے اجاڑ راستے سے ملانے والے سات قدمی زینے پر سے اترتا ہوا، یہ دروازہ، جسے میں نے آج اندر سے کنڈی نہیں لگائی، کھولتا ہے اور مجھے مردہ حالت میں پاتا ہے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میری لاش کی صورت حال کیا ہو گی؟

ممکن ہے کل ہی یہاں سے گزرنے والے کسی شخص کو اچانک میرا خیال آجائے اور وہ جندر کے صحن میں اتر کر، دروازے سے اندر جھانکے اور میری لاش کو صحیح حالت میں پائے، اگر وہ پرسوں آیا تو بھی میری لاش صحیح سلامت ہی ہوگی کہ یہ آگ جو ابھی آتش دان میں بھڑک رہی ہے اور جس کے شعلوں سے نکلنے والی سپید و سرخ روشنی نے، میرے وجود سمیت، اس کمرے میں موجود ہر شے کو سائے کا اعتبار بخش رکھا ہے، میری موت واقع ہونے تک مکمل طور پر بجھ جائے گی اور یہ سردی، جو اس وقت ندی کے کونے کھدروں میں ٹھہرے پانی پر آہستہ آہستہ کہرے کی ایک موٹی تہہ جما رہی ہے، میری لاش کو کم از کم پچاس گھنٹے خراب ہونے سے بچائے رکھے گی۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ اگلے دس دنوں میں بھی کوئی ایسا شخص یہاں سے نہ گزرے، جو اتفاقاً میرا اتا پتا کرنے جندر کے کمرے کی طرف آئے۔

پہلے تو میں نے کبھی غور نہیں کیا کہ ان لوگوں کو چھوڑ کر جو میرے ہاں دانے پسوانے آیا کرتے تھے، یہاں سے اور کون کون گزرتا ہے، لیکن گزشتہ پینتالیس دنوں سے چوں کہ میں اس ممکنہ آدمی کی تلاش میں ہوں، جس نے سب سے پہلے مجھے مردہ حالت میں پانا اور گاؤں والوں کو میری موت کے بارے میں بتانا ہے، اس لیے میں یہاں سے گزرنے والوں پر برابر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ اس مشاہدے کی روشنی میں، مَیں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس اجاڑ رستے سے اب دن میں بہ مشکل تین چار آدمی ہی گزرتے ہیں، جن میں سے کچھ تو بالکل ہی اجنبی ہوتے ہیں اور صحن میں میری موجودگی کے باوجود دعا سلام کیے بغیر ہی گزر جاتے ہیں؛ اور جو چہرے مہرے سے میرے شناسا ہوتے ہیں ان میں سے اکثر مجھے پاگل سمجھتے ہیں اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے میں ابھی انھیں کاٹنے دوڑوں گا اور جو ایسا نہیں سمجھتے ان کے ساتھ میرا کوئی ایسا گہرا تعلق نہیں کہ فروری کی دھوپ میں جندر کے صحن میں میری عدم موجودگی انھیں کھٹکے اور وہ میرا اتا پتا کرنے جندر کے دروازے تک چلے آئیں۔ ایسا آدمی جو صحن میں میری عدم موجودگی محسوس کر کے جندر کے دروازے تک آئے، ہفتے میں بہ مشکل ایک آدھ ہی یہاں سے گزرتا ہے۔ آخری شخص چار دن پہلے جندر کے صحن میں اترا تھا اور وہ بھی میرا اتا پتا کرنے نہیں اپنی کھوئی ہوئی بکری کے بارے میں پوچھنے آیا تھا۔

اس لیے یہ بات بھی ممکنات میں سے ہے کہ مطلوبہ شخص اگلے دس بل کہ پندرہ دنوں میں بھی یہاں سے نہ گزرے۔ ایسی صورت میں میری لاش یقیناً گل سڑ چکی ہوگی اور کیڑے مکوڑے اور چونٹیاں، جن کا رزق کی تلاش میں آنا جانا ویسے بھی یہاں لگا رہتا تھا، میری ہڈیوں پر موجود ماس، جو گزشتہ پینتالیس دنوں میں، خالی گھومتے جندر کی کوک کی شدت نے، ان کی آسانی کے لیے، میری ہڈیوں سے علاحدہ کر دیا ہے، اپنا رزق بنا چکی ہوں گی۔

میں اگرچہ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا مگر زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ اس کام کا آغاز میرے چہرے سے کریں گی کہ سردی کی وجہ سے مرتے ہوئے بھی میرا باقی جسم اسی طرح رضائی میں لپٹا ہوگا اور یہ نقاہت؛ جس کا آغاز تو کئی دن پہلے ہی ہو چکا تھا مگر گزشتہ شام سے اس میں کچھ زیادہ ہی تیزی آ گئی

ہے، مجھے اس قابل نہیں چھوڑے گی کہ آخری وقت میں، مَیں ٹانگوں یا جسم کے کسی دوسرے حصے پر سے رضائی کھسکا سکوں۔ زیادہ قرین قیاس بات تو یہ ہے کہ وہ مجھے نوچ کر لے جانے کا آغاز میری آنکھوں کی سفید پتلیوں سے کریں گی ____ جو اس وقت تک مزید سفید ہو چکی ہوں گی ____ اور جن سے میں انھیں ٹولیوں کی شکل میں یہاں آتے اور اپنا رزق لے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ پہلے مرحلے میں آنے والی چیونٹیوں کی ٹولی، رضائی میں لپٹے میرے دھڑ پر سے سفر کرتی ہوئی جب زرد ہو چکے میرے چہرے تک پہنچے گی تو اسے میری سفید پتلیاں، آٹے کے مانند لگیں گی اور وہ انھیں اکھاڑ کر ساتھ لے جانے کی کوشش کرے گی۔ پھر انھیں میرے ماس کا چسکا لگ جائے گا اور وہ واپس زیرِزمین موجود، اپنے گھروں میں جا کر باقی ساتھیوں کو بھی آگاہ کریں گی اور وہاں سے بے شمار ٹولیاں چل پڑیں گی اور ان کا یہاں آنا جانا اس وقت تک لگا رہے گا جب تک میرے چہرے پر ماس کا ایک بھی ریشہ باقی ہے۔

سانپ، چھپکلیاں، لال بیگ اور دوسرے کیڑے مکوڑے بھی اس سلسلے میں ان کا ہاتھ بٹائیں گے، لیکن ان میں سے بیشتر ایسے ہوں گے جنھیں میرے باسی گوشت سے زیادہ ان زندہ چیونٹیوں سے دلچسپی ہوگی۔ ہاں جب کوئی کیڑا مکوڑا کسی اجنبی جنس کے کیڑے مکوڑے کو جا دبوچے گا تو چیونٹیوں کے ہاتھ بھی کچھ تازہ گوشت لگ ہی جائے گا اور وہ میرے جسم کو چھوڑ کر اس کی لاش پر پل پڑیں گی۔ ان میں سے کچھ چیونٹیاں میرے کھلے ہوئے منہ کے رستے پیٹ کی طرف اور کچھ نتھنوں کے ذریعے دماغ کی طرف سفر کریں گی اور میرے دماغ کے پیچیدہ تانے بانے کو، جنھیں بابا جمال دین کی سنائی ہوئی لوک داستانوں اور کتابوں میں پڑھی ہوئی کہانیوں نے اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے، یوں ادھیڑ کر رکھ دیں گی جیسے ہاتھوں سے بُنی سویٹر کو ایک دھاگا کھینچ کر آسانی سے ادھیڑ لیا جاتا ہے۔ میری یادداشت کو محفوظ رکھنے والے خلیے تو یقیناً ان کا رزق بن جائیں گے لیکن ان ہزاروں کرداروں کے انجام کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا، جنھوں نے کہانیوں سے نکل کر میری یادداشت میں پناہ لی تھی؛ اور نہ ان خوابوں کے بارے میں جنھیں اس کائنات میں صرف میں نے دیکھا۔

چہرے کو چھوڑ کر جسم کا نچلا حصہ، جو رضائی میں لپٹا ہوگا، اسے ان چیونٹیوں اور کیڑے مکوڑوں کا رزق بننے کی نوبت ہی نہیں آئے گی کہ روئی کی گرمائش سے، اس میں آہستہ آہستہ خود بخود کیڑے پیدا ہونا شروع ہو جائیں گے جو اس وقت تک کلبلاتے رہیں گے جب تک انھیں، میرے تن کا گل سڑ چکا ماس، دستیاب رہے گا، جوں ہی یہ ماس ختم ہوگا ان کی زندگی کا بھی اختتام شروع ہو جائے گا اور پھر ان کی گرتی لاشیں بھی باہر سے آئے ہوئے، کیڑوں مکوڑوں اور چیونٹیوں کے کام آئیں گی۔ یوں کچھ ہی دنوں میں یہاں، اس رضائی کے نیچے ہڈیوں کا ویسا ہی ڈھانچا رہ جائے گا، جیسا یہاں سے سات میل دور قصبے کے سرکاری اسپتال کے کمروں میں لٹکے انسانی ڈھانچوں کی تصویروں میں ہوتا ہے۔

میرے وجود کو ڈھانچے میں تبدیل ہونے سے صرف اسی صورت روکا جا سکتا ہے کہ وہ ممکنہ آدمی پرسوں تک یہاں سے ضرور گزرے۔ ہاں ایک دوسری صورت، میری موت کے فوراً بعد بجو کی آمد سے بھی وابستہ ہے

لیکن مجھ جیسا آدمی بھی، جس نے ساری زندگی کہانیوں میں بسر کی اور جو ہمیشہ ان ہونیوں اور مافوق الفطر واقعات کو حقیقت کے روپ میں دیکھتا چلا آیا ہے، اس کی صحت کے بارے میں آج بھی تذبذب کا شکار ہے۔

بجو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کائنات کی واحد مخلوق ہے جسے انسانی ٹخنوں میں دھڑکتی اس رگ کا پتا ہوتا ہے جسے پکڑنے سے مردہ اُٹھ کر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ بابا جمال دین کے بقول اگر مردے کو دفنانے کے بعد قبر پر کانٹے دار پھننگیں نہ رکھی جائیں تو آدھی رات کے وقت بجو انسانی لاش کی بو پا کر قبرستان میں داخل ہوتا ہے اور اپنے پنجوں سے قبر کھود کر اس میں اترتا جاتا ہے اور لاش کو اسی تنگ سوراخ میں سے گھسیٹ کر باہر نکالتا ہے اور پھر پاؤں کی طرف سے کفن پھاڑ کر ٹخنوں میں موجود اس رگ کو پکڑ کر مردے کو اپنے ساتھ بھگا کر اپنے بل میں لے جاتا اور اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اگلے تین چار دنوں میں اسے چٹ کر جاتا ہے۔

میرے علاقے کے بہت سے لوگ اب بھی اس کہانی کی صحت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو نہیں بھی رکھتے وہ بھی صدیوں سے چلے آئے رواج کے مطابق اپنے عزیزوں کی قبروں کو اس کی دست برد سے بچانے کے لیے ان پر کانٹے دار درختوں، خاص کر جنڈی کی، پھننگیں رکھتے ہیں۔ اگر میں بھی اس کہانی کے صداقت پر ایمان رکھنے والوں میں شامل ہوتا تو مجھے اپنی موت کے بعد یہاں آنے والے، اس آدمی کے بارے میں کسی قسم کا کوئی تجسس نہ ہوتا جس کے بارے میں، میں گزشتہ پینتالیس دنوں سے مسلسل سوچ رہا ہوں۔ ایسی صورت میں، جوں ہی موت میری زندگی پر فتح پاتی میری تازہ لاش کی مخصوص بو، جسے سونگھنے کی صلاحیت صرف بجوؤں کو حاصل ہے، ندی کے پانیوں پر تیرتی ہوئی، ان کے بلوں میں جا گھستی اور وہاں سے ایک ساتھ اتنے بجو نکل آتے کہ انھیں نہ تو میری قبر کھودنے کا تردد کرنا پڑتا اور نہ ہی مجھے ساتھ لے جانے کے لیے اس رگ کو بھی تلاش نہیں کرنا پڑتا، جس کے بغیر وہ عام حالات میں لاش کو ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ اول تو وہ سب مل کر مجھے یہیں چٹ کر جاتے اور اگر وہ مجھے ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے تو بھی آسانی سے گھسیٹ کر لے جاتے۔

لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں ایک پر تخیل آدمی ہونے کے باوجود بھی اس پر یقین نہیں کر پا رہا اور میرا ایمان ہے کہ آدمی جیسا سوچتا ہے، اس کے ساتھ ویسا ہی پیش آتا ہے۔ سوھڑیوں کا خوفناک ڈھانچہ بننا شاید میرا مقدر بن چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ میرے دماغ کی سوئی اب بھی اسی آدمی پر اٹکی ہوئی ہے، جس نے سب سے پہلے مجھے مردہ حالت میں پایا اور گاؤں والوں کو میری موت کی اطلاع بہم پہنچانا ہے۔

۲

اگر یہاں آنے والے پہلے شخص نے آنے میں واقعی اتنی دیر کر دی تو اسے، اس کی سزا خوف اور دہشت کی صورت بھگتنا پڑے گی۔ وہ جوں ہی مجھے ملنے کے ارادے سے سات قدمی زینے پر قدم رکھے گا میرے گل سڑ چکے بدن سے اٹھنے والی بدبو کا ہلکا سا بھبھوکا اس کا استقبال کرے گا۔ یہ بدبو مرے ہوئے چوہے کی بدبو سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوگی۔ جیسے ہی بدبو کا بھبھوکا اس کے نتھنوں میں داخل ہوگا وہ اردگرد نظریں دوڑائے گا کہ مبادا اس کا پاؤں ان جانے میں کسی مردہ چوہے کی لاش پر پڑ جائے۔ اتنے میں وہ آخری زینے پر پاؤں رکھ

کر صحن میں داخل ہو چکا ہوگا اور بدبو اتنی تیز ہو چکی ہوگی کہ وہ بے اختیار اپنا کوئی سا بھی ایک ہاتھ اٹھا کر اپنے منہ کے قریب لے جائے گا اور شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے اپنے دونوں نتھنے یوں بند کر دے گا جیسے وہ جندر کے صحن کے بجائے، ندی کے گہرے پانی میں اتر رہا ہو اور پانی اس کے منہ اور ناک تک پہنچ چکا ہو۔ وہ غوطہ لگانے کے سے انداز میں یونہی اپنے ہاتھ سے منہ اور ناک ڈھانپے آگے بڑھے گا اور بائیں مڑ کر جیسے ہی دروازہ کھولے گا، بدبو کا ایک زوردار بھبھوکا اس کے ڈھانپے ہوئے منہ اور ناک کے باوجود اس کے دماغ میں سرایت کر جائے گا۔ میرے خوف ناک ڈھانچے پر پہلی نظر پڑتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار ایک خوفناک چیخ نکل جائے گی؛ جو اتنی زوردار ہوگی کہ اس کے نتھنوں اور منہ کو ڈھانپا ہوا اس کا ہاتھ سانس کی نالی سے آتی ہوئی ہوا کے زور سے خودبخود ہٹ جائے گا؛ اور جب یہ چیخ جندر کے بالکل سامنے، بہتی ندی کے دوسری جانب موجود، اونچے ٹیلے سے، جس پر کھڑے ہو کر گاؤں والے عموماً مجھے گاؤں میں ہونے والے کسی واقعے کی اطلاع، ایک بلند آوازے کی صورت دیا کرتے تھے، ٹکرا کر پلٹے گی اور اس کے کانوں میں گونجے گی تو وہ مزید خوف زدہ ہو جائے گا۔ اس گونج کی شدت اتنی تیز ہوگی کہ کچھ لمحوں کے لیے تو اس کا دماغ گھومتا رہے گا۔ جب وہ تھوڑا سنبھلے گا تو کمرے میں داخل ہونے کے بجائے، ایک زوردار جھٹکے سے، جیسے میرے ڈھانچے نے اس دھکا دے دیا ہو، واپس صحن کی طرف پلٹے گا اور صحن میں موجود اس تھلے سے ٹکرائے گا، جس پر میں گرمیوں کی راتوں میں لیٹ کر جندر کے گھومتے پاٹوں کی سریلی گونج اور شفاف آسمان پر جگمگ جگمگ کرتے ستاروں سے بہ یک وقت لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ تھلے سے ٹکراتے ہوئے وہ کچھ دیر وہیں کاہو کے گھنے درخت کے تنے کا سہارا لے کر رکا رہے گا، کچھ سوچے گا اور پھر بغیر کسی تاخیر کے، میرے گاؤں کی راہ لے گا، جو سامنے والے چھوٹے ٹیلے کے پیچھے موجود، اونچی پہاڑی کے دوسری طرف واقع ہے۔ ندی عبور کرتے ہوئے وہ ان بڑے پتھروں پر پاؤں نہیں دھرے گا جو بہتی ندی کے بیچوں بیچ گزرنے کے لیے بطور خاص رکھے گئے ہیں بلکہ وہ پانی ہی میں چھلانگیں مارتا ہوا سامنے والے ٹیلے کی طرف بھاگے گا اور ایسا کرتے ہوئے اس کے کپڑے مکمل طور پر بھیگ جائیں گے، مگر وہ اس کی پروا کیے بغیر بھاگتا چلا جائے گا اور چڑھائی میں بھی یوں بھاگتا جائے گا جیسے وہ کسی میدان میں بھاگ رہا ہو۔ ٹیلے کی چوٹی پر پہنچنے تک، اس یخ بستہ موسم میں بھی اس کا جسم پسینے میں نہا چکا ہوگا۔ جوں ہی وہ اس بڑی چٹان پر پہنچے گا، جس پر کھڑے ہو کر گاؤں والے مجھے متوجہ کرنے کے لیے آوازہ بلند کیا کرتے تھے، اس کا خوف قدرے کم ہو جائے گا، وہ وہاں کچھ دیر رک کر اطمینان کا سانس لے گا، پیچھے مڑ کر ایک نظر جندر کے کمرے پر ڈالے گا اور ندی سے اوجھل ہو جائے گا۔

☆☆☆☆

نیلم احمد بشیر

اکیلی

''ڈونٹ ٹیل می۔ '' شیرن کے ہاتھ سے ہیئر سپرے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

''سچ کہہ رہی ہوں شیرن! بی لیو اِٹ۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ '' روز میری نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا مام کو بھی بتاؤ''۔ ''مام ذرا سنو تو، بڑے مزے کی بات ہے۔ '' شیرن نے اپنی ماں کو مخاطب کیا جو ساتھ والے کمرے سے آ کر اب ایک دوسری کسٹمر کی ہیئر کٹنگ کر رہی تھی۔

ہم سب ایک خوبصورتی سے سجے سجائے بیوٹی پارلر میں بیٹھی تھیں۔ میں اپنے بال پرم کروانے کے لیے آئی تھی، جو کہ ایک بڑا لمبا چوڑا مرحلہ ہوتا ہے اور اس کے لیے خاصا وقت نکالنا پڑتا ہے۔ میری اپائنٹمنٹ دو بجے دوپہر کی تھی اور اب دو بج چکے تھے۔ میں شیرن کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے مجھ سے چند منٹ انتظار کرنے کو کہا تھا کیوں کہ ابھی ابھی چیئر پہ مسز نامسن کو کچھ منٹ اور لگنے تھے۔

مسز نامسن ان کی ریگولر کسٹمر تھی یعنی جو ہر ہفتے باقاعدگی سے ایک خاص دن ایک خاص وقت مقرر کر کے بال بنوانے آتی تھی۔ اس کی عمر پینسٹھ یا ستر کے قریب رہی ہوگی۔ چھوٹے چھوٹے بال جو کبھی چمکیلے بلانڈ گولڈن ہوں گے، اب میلے میلے خاکستری سے رنگ کے ہو چکے تھے۔ وہ اپنے بال بڑے اہتمام سے سیٹ کروا رہی تھی۔ شیرن نے ہیئر سپرے کر کے اس کے بالوں کو فنشنگ ٹچ دیا۔ مسز نامسن فارغ ہو گئی تو میری باری آ گئی۔

مسز نامسن ایک طرف پڑی خالی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ میں نے سمجھا شاید روز میری کی دوست ہونے کی وجہ سے اس کا انتظار کر رہی ہے اور شاید وہ اکٹھی ہی جائیں گی۔ اب دوسری چیئر پر روز میری کے بال شیرن کی ماں سیلی نے سیٹ کرنے شروع کر دیے تھے۔

گفتگو روز میری کے گرد گھوم رہی تھی۔ روز میری بھی ایک بوڑھی بیوہ عورت تھی۔ ستر سے کم کسی صورت نہیں لگتی تھی مگر اس کی طبیعت میں زندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بات بات پہ کھلکھلا اٹھتی تھی۔ اس وقت وہ اپنے ساتھ پیش آنے والا ایک واقعہ سنا رہی تھی جو بیوٹی پارلر میں بیٹھی ہوئی سب عورتوں کی دلچسپی کا باعث بنا ہوا تھا۔ ''ہاں روز میری ہم بھی تو سنیں ورنہ آج کی آفٹر نون کی بہترین گوسپ کس کو قرار دیا جا سکے گا؟ ''۔ سیلی نے اس کے بالوں میں پانی سپرے کر کے مساج کرتے ہوئے کہا۔

’’جناب یہ گوسپ نہیں سچ ہے ......‘‘ روزمیری نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

’’تم کو یہ تو پتہ ہے کہ میرے میاں جیرالڈ کو انتقال کیے ہوئے اب چھ سات ماہ گزر چکے ہیں۔ ویل، ان کا ایک عزیز دوست مائیکل تھا، دونوں گالف پارٹنر تھے اور ہم اکثر مل جل کر ڈنر کیا کرتے تھے یعنی ان کی بیوی اور ہم۔ دونوں جوڑے کئی بار کیمپنگ بھی کیا کرتے تھے۔ جیرالڈ کی وفات کے بعد میں کافی اداس ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے ہم دونوں کی ایک اچھی لائف گزری تھی۔ میں اس کی کمی کو کیسے محسوس نہ کرتی۔ چند ہفتے تو گھر سے بھی نہ نکل سکی اور مائیکل مجھے سودا وغیرہ لا کر دیتا رہا اور پوچھتا رہا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ میں اس کی مہربانی سے بہت متاثر ہوئی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی مہربانیوں کا رخ بدلتا گیا اور ایک دن تو اس نے مجھے صاف لفظوں میں پوچھا کہ کیا وہ میری کوئی اور ’نیڈ‘ بھی پوری کر سکتا ہے؟ اس نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا کہ وہ میری پریشانی سمجھ سکتا ہے جو مجھے ’ٹینشن‘ کی وجہ سے ہوتی ہو گی اور وہ میری ’فرسٹریشن‘ دور کرنے میں مدد کرنا چاہتا ہے۔

روزمیری ایک لمحے کو رکی۔ سیلی نے اب اس کے گھونگھر سیٹ کر کے اسے ایک بڑے سے ٹوپی نما ہیئر ڈرائیر کے نیچے بٹھا دیا۔ اس کے کرل ہوئے بال لو ہیٹ سیٹنگ پہ سوکھنے لگے۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے گھر میں بچوں کے پاس آئی بے بی سٹر کو یہ تو بتایا نہیں کہ چھوٹی سمی کو چار بجے دودھ دینا تھا، اب چار بج چکے تھے۔ میری پرم کا کام ابھی آدھا ہوا تھا اور میرا خیال تھا کہ مجھے شاید دو گھنٹے اور لگ جائیں گے۔ میں ابھی بچوں اور بے بی سٹر کے متعلق سوچ ہی رہی تھی کہ کرسی پہ بیٹھی مسز نامسن نے بھی گاڑی دیکھی۔ میں نے سوچا شاید بے چاری کو دیر ہو رہی ہے کیوں کہ وہ تو کب کی بال سیٹ کروا کر فارغ ہو چکی تھی۔

’’اچھا تو پھر کیا ہوا؟‘‘ شیرن نے مجھے بھی ہیئر ڈرائیر کے نیچے بیٹھنے کو کہہ کر روزمیری سے پوچھا۔

’’ہاں! سنو کیا ہوا۔ ایک دن جب میں کپڑے وغیرہ بدل کر میک اپ جیولری پہن کر سنڈے مارننگ چرچ سروس سے واپس آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ جیرالڈ گھر کے باہر میرے لان میں گھاس کاٹنے والی مشین سے گھاس کاٹ رہا ہے۔ میں بڑی متاثر ہوئی اور اسے لان صاف کرنے کے بعد لنچ کے لیے مدعو کر لیا۔ اس نے لنچ کے بعد میری تعریفیں کرنا شروع کر دیں کہ میں کتنی خوبصورت لگ رہی ہوں اور نیلا رنگ مجھ پر کتنا جچتا ہے۔ میرا فگر اس عمر میں بھی کتنا پر کشش ہے وغیرہ۔ اب میں اس کے ارادے سمجھ چکی تھی لیکن سچی بات ہے کہ مجھے اس کے ساتھ کسی قریبی تعلق کی کوئی خواہش نہیں تھی۔‘‘

’’او وہ واقعی روز؟‘‘ شیرن کی ماں نے شرارت سے مسکرا کر پوچھا۔

’’سچ کہہ رہی ہوں۔ میں اب ’’ٹیک اٹ ایزی‘ لائف گزارنا چاہتی ہوں۔ کوئی نیا ریلیشن شپ استوار کرنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔‘‘

مسز نامسن کرسی پر بیٹھے بیٹھے خاموشی سے پہلو بدل رہی تھی، وہ اپنے نئے نئے سیٹ بالوں کو سامنے لگے

شیشے میں کبھی کبھار تعریفی نظروں سے بھی دیکھ لیتی تھی۔ شام کے پانچ بج چکے تھے اور میں چاہ رہی تھی کہ جلدی سے میرے بال پرم ہو جائیں اور میں گھر پہنچوں۔ جا کر شام کا کھانا بھی تیار کرنا تھا اور بے بی سٹر نے بھی شام چھ بجے کے بعد اپنے بوائے فرینڈ کی ماں کو دیکھنے ہسپتال جانا تھا۔ اس سے زیادہ وہ رک نہیں سکتی تھی۔ شیرن کا بیٹا سکول سے آ گیا تھا، بستہ پھینک کر باہر گلی میں سنو بالز بنا کر کھیلنے چلا گیا تھا۔ یہ گھر شیرن کی ماں سیلی کا تھا، جہاں دونوں ماں بیٹی نے مل کر بیوٹی پارلر کھول رکھا تھا۔

شیرن نے میرے بالوں میں پڑے ہوئے نئے نئے چھلے چھوتے ہوئے پھر روز میری کو اپنی بات سنانے کو کہا۔

”بس ہونا کیا تھا۔ مجھے جیرالڈ سے جان چھڑانا تھی۔ میں نے سوچا سچ سے بہتر کوئی طاقت نہیں۔ کیوں نہ اسے سچ کا سامنا کرا دوں!“

”یعنی تم نے اسے سچ کہہ دیا کہ تمھیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں؟“ سیلی نے پوچھا۔

”نہیں، میں نے اسے سچ دکھا دیا۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ سیلی نے ہیئر ڈرائیر کا بٹن بند کر دیا۔

”میں نے جیرالڈ کو اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور چند منٹ انتظار کرنے کو کہا۔ جیرالڈ تو خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں اپنے بیڈ روم میں گئی، اپنے کپڑے بدلے، ایک نیم عریاں نائٹی پہنی۔ اپنی پیڈنگ جسم سے اتار دی۔ اپنے سیٹ کیے بال دھو کر سیدھے فلیٹ کر لیے، اپنے نقلی دانت نکال کر بیڈ کے ساتھ پڑی ٹیبل پر پانی کے گلاس میں رکھ دیے۔ منہ پر چکنی نائٹ کریم لگا لی۔ میک اپ صاف کر لیا۔ اپنی کمر کو سپورٹ کرنے والی بیک بریس بیلٹ بھی اتار کر پاس ہی رکھ دی۔ اس وقت میں اچھی خاصی بدصورت بڑھیا لگ رہی تھی۔ اب میں نے بیڈ روم کی لائٹیں دھیمی کر دیں۔ کمرے میں رومانوی ماحول کر کے جیرالڈ کو پکارا۔ پیار سے سرگوشیاں کیں۔“

”پھر کیا، پھر کیا ہوا؟“ شیرن بے چینی سے بولی۔ روز میری ہنسنے لگی اور بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پہ قابو پا کر بولی۔

”جب جیرالڈ میرے کمرے میں شیر بن کر آیا تو مجھے اس حلیے میں دیکھ کر چوہا ہی تو بن گیا۔ یو نو، وہ ایسا کنفیوژ ہوا کہ اس سے تو وہاں چند منٹ سے زیادہ رکا ہی نہیں گیا۔ دم دبا کر بھاگا۔ پھر مجھے اس نے کبھی تنگ نہیں کیا۔“

سب عورتیں ہنس رہی تھیں۔ بیوٹی پارلر میں قہقہوں کا طوفان برپا تھا۔ تبصرے ہونے لگے۔ کوئی روز میری کو ایوارڈ دینے کا کہہ رہی تھی اور کوئی بیچارے جیرالڈ پر ترس کھا رہی تھی۔

میرے بالوں کا کام اب ختم ہونے والا تھا۔ آخری واش ہونا باقی تھا۔ میں سوچ ہی رہی تھی، شاید اب تک بچوں کے ابو واپس آ گئے ہوں گے اور بچوں کی بے بی سٹر کو پیسے دے کر رخصت کر دیا ہو گا۔ پونے چھ بج چکے تھے۔ ونڈو میں سے لٹکتے ہوئے آتشی رنگ کے فیوشا ہینگنگ پلانٹ نے ساری کھڑکی کے اوپری حصے کو

لپیٹ رکھا تھا مگر میں پھر بھی باہر دیکھ کر اندازہ لگا چکی تھی کہ سردی بڑھ گئی ہے کیوں کہ تیز ہوائیں جب چلتی ہیں تو تازہ گری ہوئی برف کے ذرات ان کے ساتھ پاؤڈر کی طرح اڑنے لگ جاتے ہیں اور اس صبح تازہ برف باری ہو چکی تھی۔ باہر جا کر ٹھنڈی گاڑی سٹارٹ کرنے اور نئے پرم شدہ بالوں پہ ہیٹ پہننے، دستانے کوٹ اور لمبے اونچے سنو شوز پہننے کے خیال سے مجھے کوفت ہو رہی تھی۔ اندر گرم بیوٹی پارلر میں اتنے گھنٹے گزار کر اب نقطہ انجماد سے نیچے منفی دو ڈگری سردی میں نکلنے سے دل گھبرا رہا تھا۔ نہ جانے مسز نامسن اب تک کیوں بیٹھی تھی۔ روز میری بھی بال بنوا کر جا چکی تھی اور گفتگو کا موضوع اب فروری میں نظر آنے والے گراؤنڈ ہوگ بن گیا تھا۔ روایت کے مطابق گراؤنڈ ہوگ جو ایک نیولا نما جانور ہوتا ہے جب موسم سرما میں زیر زمین چھپ جانے کے بعد اپنے بل سے باہر نکلتا ہے تو اس کے بعد سردی کے مزید چھ ہفتے گن لیے جاتے ہیں اور موسم بہار کا غیر سرکاری طور پر انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ سب امریکی گراؤنڈ ہوگ کے باہر نکلنے کے ایک خاص دن کا انتظار کرتے ہیں اور اگر فروری کا دن گراؤنڈ ہوگ کے نمودار ہوئے بغیر بیت جائے تو اداس ہو جاتے ہیں کیوں کہ اس کا مطلب سردی کے موسم کا مزید طویل ہونا سمجھا جاتا ہے۔ سردی کی شدت اپنے ساتھ ایک عجیب سا دکھ لیے ہوتی ہے جو ماحول میں ڈپریشن بکھیر دیتا ہے۔ سب لوگ بیزار اور اداس اداس سے گھروں کے اندر گھسے ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں۔ سرمئی بادلوں کے پیچھے چمکتی دھوپیں یوں چھپی رہتی ہیں جیسے انہیں بھی کسی نے منجمد کر دیا ہو۔ زندگی سست اور چپ چپ سی رہنے لگتی ہے۔

یہ فروری کا مہینہ تھا اور گراؤنڈ ہوگ ڈے آنے والا تھا۔ میرے بال اب پرم ہو چکے تھے۔ پارلر میں میرے، شیرن، سیلی اور مسز نامسن کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ میں آخری کسٹمر تھی اور اس کے بعد انھوں نے پارلر بند کر دینا تھا۔ میں نے جب پیسے دیئے تو تینوں خواتین نے میرے کالے بالوں کی تعریف کی۔ میری مشرقی لک کی وہ بہت مدح سرائی کر رہی تھیں۔ میں بھی اپنے بالوں سے مطمئن ہو کر چلنے کو تیار ہو گئی اور دستانے کوٹ وغیرہ پہننے شروع کر دیے۔ مجھے اب آئے ہوئے چار گھنٹے ہو چکے تھے۔

مسز نامسن بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بھی تب ہی سے آئی ہوئی تھی۔ نہ جانے وہ کیوں اب تک بیٹھی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''کیا میں آپ کو کہیں ڈراپ کر دوں؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا۔ یہ سوچ کر شاید اسے لفٹ درکار ہو۔ شاید اسی وجہ سے وہ وہاں اب تک بیٹھی ہو۔

''اوہ نو! میرے پاس گاڑی ہے۔'' پھر وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔

''دراصل میں تو یونہی بیٹھی تھی۔ اس لیے کہ گھر جا کر بھی کیا کرنا ہے۔ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ یہاں لوگوں کی باتیں سن کر اچھا لگتا ہے۔ میرا ایک دن اچھا گزر گیا ہے۔ اچھا چلتی ہوں، سی یو۔ تھینک یو شیرن اینڈ سیلی۔ اچھا اگلے ہفتے ملیں گے۔ بائے بائے۔''

حنیف باوا

آس کی لرزتی لو

اس کی میت ابھی تک کچے مکان کے اس صحن میں پڑی ہوئی تھی جو ہمہ وقت دھوڑ سے اٹا رہتا، یوں تو یہ دھوڑ دن رات صحن کے سینے سے چمٹ کر سوئی رہتی لیکن جب کبھی کوئی شخص اس صحن میں داخل ہوتا تو اس کے پاؤں کی ٹھوکر سے فوراً جاگ اٹھتی اور کسی میلی کچیلی چادر کی طرح اس شخص کے پاؤں کے گرد لپٹنے کی کوشش کرتی یا پھر جب کبھی ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتا تو یہ ہنستی مسکراتی ادھر ادھر چکر لگانے لگتی۔ وہ چاردیواری جس نے اسے صحن کی شکل دے رکھی تھی وہ بھی کچی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ اس کی تمام دیواریں مٹی کی لپائی سے مبرا تھیں اس لیے ان دیواروں میں جا بجا چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑے ہوئے تھے جو ہر وقت الوؤں کی طرح جھانکتے رہتے تھے۔ اس کی چارپائی کے پاس چند عورتیں بیٹھی ہوئی تھی ان کے چہروں پر رونق نام کی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید یہ عورتیں مرنے والے کی رشتہ دار تھیں یا پھر اڑوس پڑوس سے ایسے ہی گھروں سے باہر آئی تھیں جیسا کہ اس کا اپنا گھر تھا۔ کچا خستہ حال جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا۔

شام کے دھندلکے آہستہ آہستہ رات کی گود میں اتر رہے تھے۔ گرمی اس قدر شدت اختیار کر چکی تھی کہ وہ عورتیں جو اس میت کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں۔ پسینے میں اس قدر شرابور تھیں کہ ان کے میلے کچیلے لباس ان کے جسموں سے چپکے ہوئے تھے۔ گرمی کی شدت کو کم کرنے کے لیے وہ کبھی کبھار اپنی اپنی قمیض کے پلو سے پنکھوں کا کام لے رہی تھیں لیکن اس ہوا سے ان کے لباس خشک نہیں ہو پا رہے تھے اسی لیے وہ بدستور ان کے جسموں سے چپکے ہوئے تھے۔

وہ چارپائی جس پر اس کا مردہ جسم پڑا ہوا تھا وہ موٹے بان سے بنی ہوئی چوٹی تھی جس پر میل کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ وہ بان سوت کے دھاگوں سے تیار کیا ہوا تھا اسی لیے پرانا ہونے کی وجہ سے اس میں سے مسلسل بدبو آرہی تھی۔ اس کی چارپائی پر جو چادر بچھی ہوئی تھی وہ بھی اس چارپائی کی طرح کافی پرانی تھی جو اپنی کہنگی کے بوجھ کو برداشت نہ کرتے ہوئے کئی جگہوں سے پھٹ چکی تھی۔ کہنے کو تو وہ سفید تھی لیکن دیکھنے والوں کو اس کی سفیدی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ جس کوٹھے کے سامنے وہ پڑی ہوئی موت کی نیند سو رہی تھی اس کا دروازہ پرانا ہونے کی وجہ سے اس کے پھٹوں نے اپنی اپنی جگہ کو چھوڑ دیا ہوا تھا۔ جس سے اس دروازہ میں لمبی

لمبی دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ جو اس گھر کے پردے کو فاش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ اس کوٹھے کے اندر بدہیئتی کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے یہ کوڑا کرور یہ کچا مکان دونوں جڑواں بھائی ہوں۔ ان دونوں کی عمروں میں کوئی تفاوت نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ دونوں ماضی بعید سے گرتے پڑتے بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچے تھے۔ اس کوٹھے کے اندر والی کنس پر جو چند برتن پڑے ہوئے تھے انہیں بھی ماضی کی دھول نے پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ ان برتنوں میں سے جو برتن استعمال کے لیے تھے وہ کافی عمر رسیدہ دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے چہروں پر کچھ ایسے اَن مٹ داغ تھے جو نہ جانے کتنے عرصے سے ان کے چہروں پر سجے ہوئے تھے۔

اس گھر کے بائیں جانب ایک چھپرا ایسا تھا جس کی چھت سرکنڈوں کی بنی ہوئی تھی۔ یہ چھپرا ایسے کھلے منہ کھڑا تھا جیسے اُسے کوئی بڑی پریشانی کھائے جا رہی ہو۔ اس چھپر کے نیچے ایک کمزور سی بکری بندھی ہوئی تھی جس کی ہڈیاں یوں باہر کو جھانک رہی تھیں جیسے باہر سے کچھ تلاش کر رہی ہوں۔ اسکے ارد گرد سوکھے چارے کے تنکے بکھرے پڑے تھے جن کے اوپر بکری لمبی تانے لیٹی ہوئی تھی اس نے اپنا منہ بائیں ٹانگ پر ٹکا رکھا تھا۔ وہ ٹانگ اس نے آگے کو پھیلا رکھی تھی۔ وہ بھی لگاتار سامنے تکے چلی جا رہی تھی۔ اس کے کمزور جبڑے اس کی جگالی کے آڑے آ رہے تھے یا پھر اس کے پیٹ میں کچھ نہیں تھا جسے وہ چبانے کے لیے باہر نکالتی۔

جیسے جیسے رات آگے بڑھتی جا رہی تھی گرمی میں کمی آنے کے بجائے اس میں مزید شدت آتی جا رہی تھی۔

یہ لوگ بدستور پسینے سے شرابور تھے۔ ہوا بند تھی صحن میں جو اکلوتا بیری کا پیڑ تھا وہ بھی گرمی کا مارا ہوا چپ سادھے کھڑا تھا۔ اس کے پتے سراسیمگی کی حالت میں ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ یہ پیڑ اتنا ہی بوڑھا دکھائی دے رہا تھا جتنی کہ وہ عورت جو زندگی کی کٹھن راہوں پر بھٹکتی ہوئی موت کی وادی میں جا بسی تھی لیکن حیرت اس بات کی تھی کہ اس قدر افتادگی کے باوجود یہ پیڑ زندگی کا دامن نہیں چھوڑ رہا تھا۔

یہ میت ابھی تک بے گور و کفن کیوں پڑی ہوئی تھی یہ سوال ہر شخص کے ذہن میں اُبھرنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ لوگ بس سوال کی پرچھائیں تک کو اپنے قریب بھٹکنے نہیں دے رہے تھے شاید وہ اس سوال کی سنگینی سے خوف زدہ تھے یا پھر جان بوجھ کر اس سے کنی کترا رہے تھے۔

ان عورتوں میں جو جوان لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں وہ مرنے والی کی بیٹیاں تھیں۔ کہنے کو وہ وہ جوان تھیں لیکن وقت کی لرزا دینے والی یکسانیت نے اُن کی پیشانی پر کچھ ایسی بدنما لکیریں کھینچ رکھی تھیں جنھوں نے ان کے چہروں کو بے رنگ کر دیا تھا۔

موسم کی سنگینی میں ہولے ہولے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آسمان چاند کی غیر موجودگی میں تاروں سے

بھرتا جا رہا تھا۔ تارے جو روشنی زمین پر بھیج رہے تھے وہ اتنی طاقتور نہیں تھی کہ صحن کا ذرہ ذرہ عیاں ہو جاتا۔ ہاں صحن سے اندھیرے کو کھرچنے کی مقدور بھر کوشش کر رہی تھیں۔ تاروں کی ہلکی روشنی میت کے اس لباس کو پہچاننے کی سعی کر رہی تھی جو برسوں سے اس کے لاغر بدن کو ڈھانپے ہوئے تھا۔

اس گھر سے متصل ایک وسیع و عریض بلڈنگ تھی جس کا قوی ہیکل بیرونی دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے۔ اگر وہ کبھی کھلتا بھی ہے تو وہ اس وقت جب اس کا کوئی مکیں رات کی تاریکی میں چھپتا چھپاتا ہوا ڈگمگاتے قدموں سے آتا اور باہر سے اس بڑے دروازے پر دستک دیتا۔ جب یہ دروازہ کھلتا تو وہ مکیں اندر جا کر سکھ کا سانس لیتا تو یہ دروازہ پھر سے بند ہو جاتا۔ آج بھی یہ دروازہ حسبِ دستور بند تھا۔ میت والے گھر میں چاروں اور پھیلی ہوئی افسردگی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔

یہاں پر جو چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے گرمی نے ان کا بھی برا حال کر رکھا تھا۔ جیسے جیسے انھیں پیاس کا شدت سے احساس ہونے لگتا تو وہ ایک ایک کر کے اٹھتے اور سامنے پڑے ہوئے گھڑے کی جانب بڑھتے اور اپنے اندر پانی کا ایک گلاس انڈیل کر واپس آ جاتے۔ وہ گھڑا سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک شکستہ سی گھڑونجی پر پڑا تھا۔ گھڑونجی کا لاغر بدن نہ جانے اس گھڑے کا بوجھ کیسے اٹھائے ہوئے ہے۔ پانی بڑی تیزی سے گھڑے کا ساتھ چھوڑ رہا تھا لیکن ان لوگوں کی پیاس بجھنے میں نہیں آ رہی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا وہاں پر موجود لوگوں میں کمی آتی جا رہی تھی۔ آخر چند ایک لوگ جو باقی بچے تھے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سوال اُن کے سامنے سانپ کی طرح پھن پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ یہی وہ سوالات تھے پہلے جن کی پرچھائیوں کو بھی اپنے قریب بھٹکنے نہیں دے رہے تھے لیکن بھاگتے لمحوں کی تیز رفتاری سے گھبرا کر اب یہی سوال ایک ایک کر کے ان کے ہونٹوں سے خود بخود پھسلنے لگے تھے۔

"اسے اس حالت میں رکھنے میں کیا حکمت ہے؟" ---۔ ایک کہتا

"گرمی کے موسم میں اسے اس طرح زیادہ دیر تک رکھنا مناسب نہیں۔" دوسرا بولتا

"عورتوں کو تو اس بات کا احساس ہی نہیں۔" کوئی اور دوسرے شخص کے سوال کو آگے بڑھاتا۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی ہیں۔ اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔ میت کو نہلانے کے لیے۔" پاس ہی سے تیسرا بولتا۔

ان باتوں کی گونج مرنے والی کی بیٹیوں کے کانوں تک پہنچ رہی تھی لیکن وہ بھلا ان باتوں کا کیا جواب دیتیں۔ وہ تو بس خاموشی سے تنکوں سے زمین کو کریدے جا رہی تھیں۔ نہ جانے وہ یہاں کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔ بھیگی ہوئی آنکھیں ان کی بے بسی کی غماز تھیں۔ وہ عورتیں جو ابھی تک ان لڑکیوں کا ساتھ نبھائے جا رہی تھیں۔ وہ بھی ان کی کم مائیگی سے اچھی طرح آشنا تھیں۔ اسی لیے وہ بھی ان لڑکیوں کی مانند نیچی نظریں کیے بیٹھی تھیں۔

میت کو ابھی تک کیوں نہیں نہلایا گیا تھا۔ اسے کفن پہنانے سے کیوں گریز کیا جا رہا تھا۔ وہ عورتیں ان سوالوں سے بہ خوبی واقف تھیں لیکن وہ اس کا کھلے عام اظہار کیسے کرتیں شاید اسی لیے وہ بھی زمین کریدنے میں لگی ہوئی تھیں۔

گرمی کی شدت جُوں کی تُوں تھی۔ گھڑونجی پر پڑا ہوا گھڑا اب خالی ہو چکا تھا۔ اسی لیے وہاں پر موجود لوگ پیاس بجھانے کے لیے کہاں کا رُخ کرتے۔ کمیٹی کی ٹوٹی بھی کب کی بند ہو چکی تھی۔ اب کہیں سے پانی کی ایک بوند بھی دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک تو پیاس نے لوگوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا، دوسرے ہوا کے بند ہو جانے سے حبس پیدا ہو رہا تھا۔ وہاں لوگوں کے ہونٹوں کو خشک کیے دے رہے تھے۔

رات آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی لیے وہاں پر موجود لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانا چاہ رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میت کا کیا بنے گا یہ سوال ان کے اندر سے ابھرتا ضرور لیکن گرمی کی شدت نے اس سوال کی اہمیت کو ختم کر دیا تھا۔ شاید وہ لوگ اب کل پر بھروسہ کر رہے تھے۔ کل صبح پر جو جلد آنے والی تھی۔

تاروں بھری رات میں اب میت کے پاس وہی چند لوگ اور عورتیں رہ گئی تھیں جو شام ڈھلتے ہی مرنے والی کی بیٹیوں کے غم میں شریک ہونے کے لیے آ گئی تھیں۔ یہی وقت اس بڑھیا کے فوت ہونے کا بھی تھا۔ زیادہ تر لوگ جا چکے تھے۔ اس کڑی گرمی میں میت کا کیا حال ہوگا کون جانے۔

اب چاروں اور سناٹا تھا۔ چھپر کے نیچے بیٹھی ہوئی وہ مردہ سی بکری بھی اب اونگھنے لگی تھی۔ گھڑونجی پر پڑے ہوئے گھڑے کے لب بھی سُوکھ کر کھردرے سے ہونے لگے تھے۔ صحن کے اندر کی دُھول بھی اب پوری طرح سو چکی تھی اور صحن کے سامنے والے بڑے بڑے گھروں نے بھی اب چُپ سادھ رکھی تھی۔ ادھر میت کے پاس مرنے والی کی بیٹیوں نے دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر جاگنا تھا۔

جب میت کے نہلانے کی تمام امیدیں دم توڑ چکی تھیں تو اچانک ایک ادھیڑ عمر کا ایک شخص صحن میں داخل ہوا جس کی داڑھی تھوڑی سی بڑھی ہوئی تھی اور اس میں کہیں کہیں سے چاندی نظر آ رہی تھی۔ لباس بہت ہی سادہ زیب تن کیا ہوا تھا لیکن اس پر کہیں کہیں میل کی تہہ جمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بلا کی چمک اور سکون تھا۔ اُس نے ہلکی اور باریک چادر کی بُکل سے ایک پوٹلی نکالی اور پاس بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی عورت کو تھما دی۔ “اماں جی اب میت اٹھ جانی چاہیے۔” اتنا کہتے ہوئے وہ شخص واپس پلٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

☆☆☆☆

نگہت یاسمین

ادب شناس

دفتری کاموں کو نمٹا کر ضروری کاغذات کی فائل بغل میں دابے طویل راہداری طے کر کے جیسے ہی میں باہر آیا وہ آفتِ جاں برآمدے کے ستون کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

ارے! آپ ابھی تک یہیں ہیں، پانچ بج رہے ہیں، گھر کیوں نہیں گئیں؟

وہ سمیر بھائی! آں، ہاں بس جانے ہی لگے ہیں۔ گلابی سوٹ والی بولی۔

ہاں، دراصل آج میرے بھائی گاڑی لے کر آ رہے ہیں نا، انہی کا انتظار ہے۔ بلیک سوٹ والی نے جلدی سے بات بنائی۔

سمیر بھائی! آپ کو وعدہ یاد ہے نا؟

کونسا وعدہ؟

ٹریٹ دینے کا۔

کچھ دن انتظار کریں۔

نہیں ہم آج ہی لیں گے۔

میں سٹپٹا گیا، جانے آج کل یہ کیا ٹرینڈ چل نکلا ہے، ذرا ہنس کے کسی سے بات کر لی، فوراً رشتے داریاں قائم کرنا شروع کر دیں۔

ابھی کچھ ہی دن پہلے ہم ایک ہی ہال میں انٹرویو کے لیے بیٹھے تھے۔ امیدواروں میں پچیس لڑکے تھے، لڑکیاں صرف دو ہی تھیں۔

میں انٹرویو دے کر لوٹا تو دونوں نے بیک زبان پوچھا۔

کیسا رہا انٹرویو؟

اچھا رہا۔ بل کہ بہت ہی اچھا

پھر تو اپائنٹمنٹ کے بعد ٹریٹ ڈیو رہا۔

بس اتنی سی بات تھی۔

آپ خاموش کیوں ہو گئے۔ آج موسم بھی اچھا ہے، مزا آئے گا۔ وہ ایک ساتھ بولیں۔

مگر میری جیب کا موسم اچھا نہیں ہے۔ میں ہنسا۔

اچھا چلیں، آئس کریم ہی کھلا دیں۔

ٹیبل پر بیٹھتے ہی وہ دونوں یوں مجھ سے بے تکلف ہو گئیں۔ جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ بات سے بات نکالنے کا فن جیسے انہی کے حصے میں آیا تھا۔ میں پہلے ہی ایک گھنٹہ لیٹ ہو گیا تھا۔ یوں بھی خواتین سے اس حد تک گھلنا ملنا مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔ مگر کیا کروں مروت کے مارے دوٹوک بات بھی نہیں کر سکتا۔

خیر! بڑی مشکل سے جان چھڑا کر جیسے ہی میں روڈ پر آیا، موسم کے بدلتے تیور دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے اور آسمان سیاہ کالے بادلوں سے بھرا تھا۔ اور اگلے چند لمحوں میں موسلا دھار بارش ہونے کا امکان تھا۔ گاڑی دو دن سے مکینک کے پاس پڑی تھی اگر وہ وعدے کے مطابق ٹھیک کر دیتا تو یہ صورت حال پیش نہ آتی۔ اماں کو ایس ایم ایس کر دیا تھا مگر کیا کیا جائے جب تک میں گھر کی دہلیز پر قدم نہ رکھ لوں، اماں کو چین ہی نہیں آتا۔

جتنی قرآنی دعائیں مجھے یاد تھیں، میں ہولے ہولے ان کا ورد کرتا رہا، خدا خدا کر کے دور سے مجھے رکشے کی جھلک نظر آئی۔ میری جان میں جان آئی، رکشہ رکا میں جلدی سے سوار ہو گیا۔

رکشے والے نے میرے ہاتھ میں فائل دیکھ کر حیرت سے مجھے دیکھا، کیا بات ہے سر! آج اتنی لیٹ کیوں ہو گئے؟

ہاں! آج کام زیادہ تھا ورنہ چار بجے میں گھر پہنچ جاتا ہوں۔

اوہو! آج تو رات کو سونا بھی نصیب نہیں ہو گا، ’’جہانِ ادب‘‘ کے نام سے جو رسالہ میں نکالتا ہوں اس کی سرکولیشن کا کام بھی میں خود ہی کرتا ہوں۔ قارئین میرے رسالے کا بے تابی سے انتظار کرتے ہیں۔ وقت پہ نہ ملے تو فون پہ فون آنے لگتے ہیں۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا مگر رکشے والا باتیں کرنے کے موڈ میں تھا۔

کہنے لگا سر! آج عجیب بات ہوئی میں عجلت میں رکشہ دوڑاتا گھر آ رہا تھا کہ دو لڑکیاں سٹاپ پر کھڑی نظر آئیں میں نے ازراہِ ہمدردی رکشہ روکا۔ اس خراب موسم میں بھی وہ پرسکون انداز میں باتوں میں جتی تھیں۔

رکشے میں بیٹھ کر وہ دونوں کسی بات پر الجھ پڑیں۔

ایک بولی، سارہ کے گھر پھر کسی دن چلیں گے آج دیر ہو گئی ہے۔ اماں بے چاری پریشان ہو رہی ہوں گی۔

دوسری بولی، تم تو یوں ہی ٹینس ہو جاتی ہو، ایس ایم ایس جو کر دیا ہے، کیا کیا جائے ان ماؤں کا، انہیں تو خواہ مخواہ پریشان ہونے کی عادت ہے۔ واہ، موبائل فون کے دور میں جینے والی اس نئی نسل کے کیا کہنے۔ گھر میں ایس ایم ایس کر دیا اور پھر اطمینان ہی اطمینان۔

میں سوچنے لگا جب موبائل فون کی سہولت نہیں تھی تب اتنا خطرناک ماحول نہیں تھا۔ ہر جگہ امن تھا، سکون

تھا۔ اب ان دہشت گردوں نے فضا کو غیر یقینی بنا دیا ہے۔ ایس ایم ایس کر بھی دو تو گھر والے پریشان رہتے ہیں۔

ہاں! ایسا ہی ہے، اچھا یہ بتاؤ تم صبح کتنے بجے رکشہ لے کر گھر سے نکلتے ہو؟

سر! میں جاب کرتا ہوں، دو بجے چھٹی ہوتی ہے، کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرتا ہوں۔

جب میری جاب نہیں تھی تو صبح سات بجے گھر سے رکشہ لے کر نکلتا تھا۔ اب میری تنخواہ اچھی خاصی ہے۔ بڑے اچھے طریقے سے گزارا ہو جاتا ہے، میں کئی بار سوچتا ہوں کہ رکشہ چلانا چھوڑ دوں مگر اب رکشہ مجھے نہیں چھوڑتا، ایک تو مجھے عادت سی ہو گئی ہے، دوسرے میرے اندر جو کہانی کار چھپا بیٹھا ہے وہ بھی اسی میں خوش ہے، روزانہ مجھے نئے نئے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، میں لوگوں کے چہرے پڑھتا ہوں، ان کی باتیں، ان کے مسائل، ان کے لباس، انداز گفتگو میرے اندر سوچ کی لہروں کو ابھارتے رہتے ہیں۔ مجھے ہر سو کہانیاں ہی کہانیاں نظر آتی ہیں۔ طرح طرح کے انوکھے، نرالے واقعات میرے سامنے آتے رہتے ہیں۔

ابھی پچھلے دنوں میں رکشہ لے کر گھر سے نکل رہا تھا کہ ایک نوجوان نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا، وہ اپنی ضعیف العمر کمزور سی والدہ کو رکشے میں سوار کرنے آیا تھا۔ ایک ٹوٹا پھوٹا لوہے کا ٹرنک اس کے ساتھ تھا، وہ بری طرح رو رہی تھی۔

میں گاؤں میں اتنے بڑے بھائیں بھائیں کرتے گھر میں اکیلی کیسے رہوں گی، ننھے کے بغیر کیسے جیئوں گی۔

بے جی! میں مجبور ہوں، آپ ہی اس کو چاؤ چونچلوں کے ساتھ بہو بنا کر لائیں تھیں، اب وہ آپ کو ساتھ نہیں رکھنا چاہتی، اب رو رو کے خود کو ہلکان نہ کرو، میں ہر ہفتے تجھے ملنے آ جایا کروں گا۔ نوجوان چلا گیا، وہ بے چاری سارا راستہ روتی اور قسمت کو کوستی رہی۔ اس طرح بے شمار کہانیاں میرے اندر کلبلاتی رہتی ہیں، کھلبلی مچائے رکھتی ہیں۔ میرا ذہن ان کہانیوں کو سمیٹتا رہتا ہے۔

گھر پہنچ کر مجھے دستک دینے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اماں جی مجھے دروازے کے پاس ہی مل جاتی ہیں وہ میرا منہ سر چومنے لگتی ہیں۔ سامنے صحن میں میرے دونوں بیٹے مجھے دیکھتے ہی کھیل چھوڑ کر پاپا آ گئے، پاپا آ گئے کا شور مچاتے اچھلتے کودتے میری ٹانگوں سے لپٹ جاتے ہیں۔ ڈائننگ روم میں میرے انتظار میں بیٹھی بیگم مجھے دیکھ کر کھل اٹھتی ہے اور مائیکرو ویو اوون کا سوئچ آن کر کے کھانا گرم کرنے لگتی ہے۔ کھانے کے دوران اچھی گپ شپ ہوتی ہے۔ میں دن بھر کی دلچسپ باتیں ان سے شیئر کرتا ہوں۔ بچے اپنی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں کرتے ہیں۔ ایک بولا! پاپا میرے لیے ڈرائنگ بک لے کے آنا۔ دوسرا کہتا ہے میرے لیے رنگین پنسلوں کا ڈبہ۔ بیگم کہتی ہے، عید آ رہی ہے، بچوں کے جوتے اور کپڑے کب لانے ہیں۔

کوئی مسئلہ نہیں۔ میں کل ہی آپ سب کو شاپنگ کے لیے لے چلوں گا، ٹھیک ہے۔

اصل میں مجھے اس وقت تنہائی کی اشد ضرورت ہے۔ میں لپک کر اپنے سٹڈی روم میں آجاتا ہوں۔ قلم کاغذ سنبھالتے ہی خیالات کی ایک یلغار مجھے دبوچ لیتی ہے۔ کہانی لکھتے وقت ایک شدید قسم کا تخلیقی کرب مجھے اپنی گرفت میں لیے رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مکمل کہانی تشکیل پا جاتی ہے۔ سکون وطمانیت کے ایک خوش کن احساس سے میرے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگتے ہیں۔ اسی طرح ہر روز ایک اور کہانی میرے تعاقب میں ہوتی ہے اور میں یونہی ایک اضطراری کیفیت کی زد میں رہتا ہوں۔

کون سے رسائل میں کہانیاں بھیجتے ہو؟ میرے اندر اک تجسس کی لہر اٹھی۔ سر! میں گزشتہ چار سال سے لکھ رہا ہوں، بہت سے ادبی رسائل میں میرے افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ مگر میں نے محسوس کیا ہے کہ ان میں سے بیشتر ادبی رسائل میں افسانوں کا کوئی معیار نہیں۔ کوئی نیا پن کوئی اچھوتی سوچ نہیں، بعض ادیب عامیانہ سے خیالات کو افسانوی رنگ دے کر عریانیت اور جنسیت کا کڑکا لگا کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے تیر مار لیا۔ کوئی شہ پارہ تخلیق کر لیا۔ میں تو افسانہ لکھنے کے بعد اس کی نوک پلک درست کرتے ہوئے بیسوں مرتبہ خود کو باور کراتا ہوں کہ کوئی ایسی بات یا جملہ یا لفظ میری تحریر میں شامل نہ ہو جو منفی سوچ کا حامل ہو۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ انسان اپنے آپ کو خوبصورت بنانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا مگر اپنے اندر کے انسان کو خوبصورت بنانے کی کوشش نہیں کرتا۔

اصل میں وہ فطرت سے دور ہو گیا ہے۔ لگژری کے پیچھے بھاگتا ہے، گلیمر پر جان دیتا ہے، فطرت سے دوری انسان کو مادیت کی طرف دھکیلتی ہے، روحانیت سے دور لے جاتی ہے۔

رب نے کائنات کو کتنا حسین بنایا ہے، ہر نئی صبح مناظر کا اک سلسلہ لے کر طلوع ہوتی ہے۔ سورج اپنی نئی نویلی سنہری کرنیں زمیں پر بچھاتا ہے۔ اچانک ایک بدلی سورج کے چہرے کو ڈھانپ دیتی ہے، پھر دفعتاً ہوا بدلی کو دور آسمان پر پھیلا دیتی ہے۔ دھوپ اور چھاؤں کا کھیل جاری ہو جاتا ہے۔ کوئی پرندہ اڑتا ہوا آتا ہے، تھوڑی دیر پیڑ کی لچکیلی شاخ پر جھولتا ہے، پھر پر پھیلائے دور فضاؤں میں گم ہو جاتا ہے۔ شبنم کے قطرے پھول کی پتیوں پر سورج کی شعاؤں میں چند لمحے ہی سہی جگمگا کر اک عجب سا فن جگاتے ہیں۔ تسلسل کے ساتھ آسمان سے گرتی بارش کی بوندیں جلترنگ بجاتی ہیں، غرض کائنات کی ہر شے میں معانی کی اک دنیا آباد ہے۔ اللہ کریم بھی ہمیں کائنات پر غور وفکر کرنے کو کہتا ہے، فطرت انسان کو رب کے قریب کرتی ہے، اس کے خوبصورت کلام سے محبت کرنا سکھاتی ہے۔ ایک اچھا ادب پارہ تب ہی تخلیق پاتا ہے جب ادیب کا دل قرآن کی سچائی سے روشن ہو۔ اس کی تحریر میں دل ہی دل میں اس کے خیالات کو سراہا رہا تھا۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔

سر! آج کل میں جس رسالے میں لکھ رہا ہوں اس سے میرا دل بے حد مطمئن ہے۔

یہ دیکھیں سر! اس نے رکشے کی چھت سے لٹکے ہوئے بیگ سے رسالہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ یہ

کل ہی آیا اور اس میں میرا افسانہ بھی شامل ہے ''جاگتی آنکھوں کے خواب'' اس کا چہرہ مسرت بھرے احساس سے تابندہ تھا۔ میں جب سواری کے انتظار میں کھڑا ہوتا ہوں تو اس فارغ وقت میں رسالے کا مطالعہ کرتا ہوں۔

رسالے کے ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی میں چونکا، ''جہانِ ادب''۔

''ارے یہ تو میرا رسالہ ہے، میں اس کا ایڈیٹر ہوں'' قریب تھا کہ میں بول اٹھتا مگر میں نے مصلحتاً ایسا کہنے سے خود کو روکے رکھا۔

سر! یہ میرا فیورٹ رسالہ ہے۔ اس کے ایڈیٹر کے کیا کہنے، نہایت انٹلکچوئیل اور جینئیس انسان ہے۔ جدید ادب اور حالات حاضرہ پر اس کی گہری نظر ہے۔ اداریہ اتنا معلوماتی اور دلچسپ کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے اس رسالے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ رسالے کا اسٹائل بھی سب سے الگ ہے۔ عالمی اور کلاسیکل ادب سے انتخاب کے لیے بھی کچھ صفحات مختص ہیں اور ایک اور اچھی بات یہ کہ قلمی معاونین کو معقول اعزازیہ سے بھی نوازا جاتا ہے۔ اس کی باتیں سن کر میں بحرطلسمات میں غوطہ زن تھا۔ مجھے حیرت زدہ دیکھ کر وہ بولا۔ سر آپ مطالعہ کریں گے تو میری باتوں کی حقیقت جان جائیں گے۔ ارے! تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔ مارے تجسس کے میں یکبارگی بول اٹھا۔ مجھے اشعر عباس کہتے ہیں۔

اوہ۔ اشعر عباس، میرا بہترین قلمی معاون۔ کتنے ڈرامائی انداز سے اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی خوبصورت تخلیقات نے میرے رسالے کو چار چاند لگا دیئے تھے اور یہ رسالہ بین الاقوامی لحاظ سے بھی میری وجہ شہرت بنا تھا۔

وہ رسالے اور اس کے ایڈیٹر کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ اور میں جو پچاس سے زائد افسانے تخلیق کر چکا تھا اور جس کے پانچ افسانوں کے مجموعے منظر عام پر آ چکے تھے، اس وقت یہ اندازہ کرنے کے جتن کر رہا تھا کہ ہم دونوں میں سے کون کتنا ادب شناس ہے۔

☆☆☆☆

ممتاز راشد لاہوری

اُکھان بی بی

ماسی زینب کو جب بھی بات کرتے دیکھا، کوئی نہ کوئی اُکھان یعنی محاورہ اس میں ضرور شامل ہوتا تھا۔ تعلیم اس کی واجبی سے بھی کم تھی مگر بڑی بوڑھیوں میں پلی بڑھی تھی۔ ان ترنجن نما محفلوں کی زبان پنجابی ہوتی تھی اور اُس دور میں عام گفتگو میں اُکھانوں کا کثرت سے استعمال ہوتا تھا۔ عورتوں ہی کی تو محفل ہوتی تھی۔ ذومعنی باتیں بھی عام ہوتی تھیں اور بالغانہ اُکھانوں کا استعمال بھی معمول تھا۔ ماسی زینب کے بڑھاپے تک بھی ان محفلوں کا رنگ نمایاں رہا، ایسے بالغ بلیغ اُکھان بول جاتیں کہ خدا پناہ۔

عہد ساز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے لکھا تھا کہ ”علم الابدان کا شعور تو، ہمیں محلے کے بزرگوں کی ننگی گالیاں سن کر بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔“ یہی حال ماسی زینب کے پاس بیٹھنے والی عورتوں اور بڑی بچیوں کا تھا۔ انھیں بہت کچھ ماسی زینب کے اُکھانوں ہی نے سکھا دیا تھا۔ ان میں سیدھے سادا اور حکمت بھرے اُکھان بھی کم نہیں تھے۔ ہائی سکول یا کالج کی کوئی طالبہ ماسی زینب کے سامنے اپنی علمیت بھگارنے کی کوشش کرتی تو ماسی زینب کے لبوں پر یہ اُکھان آ جاتا:

”پاء نہ پڑھی تے وَخت نوں پھڑی“۔ کوئی تجربہ کار عورت کسی معاملے میں کوئی بڑا بلنڈر کر دیتی تو کسی لگی لپٹی کے بغیر ماسی زینب کا یہ اُکھان محفل میں گونج اٹھتا:

” بُلا وَوڈھی اماں نوں، آ نے چ کھے رَلائے۔“ ”ترنجن“ میں کسی روز کوئی ”ممبر“ عورت غیر حاضر ہوتی اور کوئی اس کی غیر حاضری کے بارے میں پوچھتا تو ماسی زینب کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیتی:

”جدھر گیاں بیڑیاں تے اودھر گئے مَلاح“ ---۔ کوئی کام وقت سے پہلے مکمل کرنے والا ہوتا اور نہ مکمل ہو پاتا اور عین وقت پر شروع کرنے کی بات کی جاتی تو ماسی زینب جھنجھلا کر طنزیہ انداز میں یہ اُکھان دے مارتی:

”بوہے کھلوتی جنج تے وِڈو کُڑی دے کَن“ ---۔ کسی ”گُھتنی“ یا زمانہ ساز عورت کے بچے بھی بڑے ہو کر اس جیسے نکلتے یا اس جیسی نا روا حرکتیں کرتے تو ماسی زینب کا یہ اُکھان کام آ جاتا:

''جیہو جئی کوکو، تے اوہو جئے بچے''۔ ایسی کوئی ''گھنّی'' یا ''میسنی'' عورت کسی موقع پر کسی اور عورت کو طعنے مہنے دیتی تو ماسی زینب بے ساختہ بول اُٹھتیں:

''آپ مائی کوکاں تے مہنے دیوے لوکاں''۔ ماسی زینب کی جیٹھانی فوت ہوئی تو کچھ روز بعد کسی گھریلو جھگڑے میں مرحومہ کے پوتے پوتیوں نے ماسی زینب سے تُو تکار شروع کر دی۔ ماسی زینب نے تڑ کی بہ تڑ کی جواب میں یہ اکھان بھی جڑ دیا: آپ مائی مر گئی تے دندسرھانے دھر گئی۔ غرض یہ کہ کوئی ایسا موقع یا ایسی صورت حال نہ ہوتی تھی کہ ماسی زینب کے زرخیز ذہن سے اسی مناسبت کا کوئی اُکھان برآمد نہ ہوتا ہو۔ اُکھانوں سے ہٹ کر۔ عام پنجابی گفتگو میں بھی کئی ضرب الامثال ماسی زینب کی زبان پر رواں رہتیں۔ کسی کم عمر ہوشیار بچی کو ''چلاکو ماسی'' کہہ دینا، کسی بوائے گرل کو ''ماہی مُنڈا'' کہہ دینا، کسی چاپلوس کو ''مِٹھی چُھری'' کہہ دینا ماسی زینب کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ اچھلنے کودنے اور پھدکنے والے بچوں کے لیے ''بکلیاں تے انڈے دینے والے بچے'' کا عنوان طے کر رکھا تھا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہُوا، ماسی زینب کے کچھ ناگفتہ اُکھان بھی سننے کو ملتے تھے مثلاً ایک وہ جس میں کسی اندھے کا ذکر تھا جسے گھر بھی چھوڑنے جانا پڑتا ہے۔ یا پھر وہ محاورہ جس میں کسی میسنی اور منجے کا ذکر تھا۔ ایک وہ بھی محاورہ تھا جس میں ڈِھڈوں بھکھی اُس عورت کا ذکر تھا جس کی شب باشیوں کی سیرابی اور ڈکاروں کا چرچا تھا۔ ماسی زینب ایسی ہی پھلجھڑیوں کا مرقع تھی۔ اور ایک روز وہ ایسے ہی ہنستی کھیلتی اور کرنیں بکھیرتی اچانک کچھ اس طرح بجھ گئی جیسے مسالہ ختم ہونے کے بعد فضا میں اوپر چڑھتی ہوئی شُرلی نصف دائرہ بناتی نیچے آ گرتی ہے۔

☆☆☆☆

احمد حسن رانجھا

اجنبی

ہوا میں تپش تھی، وہ بگولوں کی صورت اٹھتی اور دور تک پگڈنڈی پہ مٹی کو گول دائروں میں اٹھائے چلی جاتی تھی۔ گھوڑا سفید رنگ کا منہ زور اور اتھرا تھا۔ تانگہ طوفانی رفتار سے پگڈنڈی پہ دوڑ رہا تھا گھوڑے کے سموں اور تانگے کے پہیوں سے اٹھنے والی دھول کچھ دیر کے لیے حیرت سے تانگے کے پیچھے بیٹھے دو اجنبیوں کو تکتی اور پھر آرام سے پگڈنڈی پہ بیٹھ جاتی تھی۔ بوڑھے شخص نے نیلے رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی اور پگڑی کے نیچے پیشانی پہ شکنیں گہری ہو رہی تھیں۔ دو مسافر اور کوچون تانگے کے اگلے حصے میں براجمان تھے۔ اُس سال خوردہ بوڑھے شخص نے اپنی برف سفید داڑھی پہ ہاتھ پھیرا اور گردن موڑ کر پگڈنڈی کو دیکھا۔ بڑھاپے سے لاغر ہوتے چہرے پہ دو گڑھوں میں دھنسی نیم پیلی آنکھوں سے اُس نے متفکر انداز میں سامنے دیکھا۔ عمر کے اسی دہائیوں کے سفر نے اُس کا حلیہ ہی نہیں بدلا تھا پنجاب کے اس دور افتادہ علاقے کی شکل بھی کافی حد تک تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ تذبذب اور پریشانی میں تھا کیا وہ صحیح راستے پہ جا رہے ہیں کیا یہی راستہ اُس کے گھر کو جاتا ہے۔ سالوں کے سفر نے راستوں کے حلیے ہی نہیں بدلے تھے اُس کی یادداشت کا چراغ بھی کسی حد تک دھیمی آنچ پہ کر دیا تھا۔

''بھاجی آپ کو یقین ہے ہا چک نظام کو یہی رستہ جاتا ہے؟''، بوڑھے شخص نے کوچوان کو مخاطب کیا۔

''بزرگو چک نظام کا تو مجھے پتہ نہیں مگر جو آپ نے نشانیاں بتائی ہیں اور جو آپ نے نقشہ بتایا ہے وقت کے ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے پر اس سے ملتی جلتی بستی خیر دین ہے اور میں وہیں پر آپ کو لے جا رہا ہوں، اگر وہ آپ کا مطلوبہ گاؤں ہوا تو سمجھو آپ کا سفر رنگ لایا اور اگر نہ ہوا تو سمجھو آپ نے مفت میں اس بڑھاپے میں سفر کی یہ صعوبت اٹھائی۔''

کوچوان کی بات سن کر بوڑھے کی پیشانی پہ شکنیں اور بھی گہری ہو گئیں گرد آلود گرم ہوا اُس کی پیشانی سے ٹکرا رہی تھی جیسا کھا اپنے شروع کے دنوں پہ تھا۔ گندم کے سونا کھیت پگڈنڈی کے دونوں طرف دور تک پھیلے تھے۔ گرم ہوا اُن سبز بالیوں سے ٹکرا کر ایک احساس تفاخر میں اوپر اٹھتی تھی۔ کھیتوں میں کسرتی بدن کے کسان تیز دھوپ سے بچاؤ کے لیے پگڑیاں باندھے گردن جھکائے انتہائی پھرتی کے ساتھ درانتیاں چلا رہے تھے اور گندم کی فصل کاٹ رہے تھے۔ گھوڑے کے سموں اور تانگے کے پہیوں کی آواز سن کر اکا دکا کسان گردن اٹھا کر

کچھ دیر تک اُن کو دیکھتے اور اس بہانے تھوڑا سا سستا بھی لیتے تھے۔ کہیں کہیں کسانوں کی ٹولیاں مل جل کر فصل کاٹ رہی تھیں اُن میں سے کچھ لوگ ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہے تھے اور بھنگڑا ڈال کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

”تانگے والا خیر منگدا تانگہ لاہور دا ہووے۔ تے بھانویں جھنگ دا“ کوچوان مشہور پنجابی دھن گنگنا رہا تھا۔ گنگناتے ہوئے اُس نے دھیمی پڑتی رفتار پر اچانک اتھرے کو دو چار پنجابی گالیاں بکیں اور چھانٹا رسید کیا۔ اتھرے کے سموں میں جیسے بجلیاں سی بھر گئیں اُس نے طوفانی رفتار کے ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔

بوڑھا مسافر بدستور پریشان تھا۔ اُس نے متفکر نظروں سے اپنی بوڑھی بیگم کو دیکھا جو اُس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ بوڑھی عورت نے سر سے سرکتا دوپٹہ کھینچ کر سفید بالوں کے اوپر کیا۔ پریشانی سلوٹیں بن کر بڑھیا کے ماتھے پر بھی پھیلی تھی۔

”لو جی بزرگو لگتا ہے آپ کی منزل آ گئی ہے۔ یہ دائیں ہاتھ بستی خیر دین ہے۔“ کچھ دور جا کر کوچوان نے تانگہ روکتے ہوئے کہا۔ کرایہ ادا کر کے عمر کے ہاتھوں کمزور اور سفر کے ہاتھوں نڈھال ہوتا بدن سمیٹ کر وہ بوڑھا، بڑھیا تانگے سے نیچے اتر آئے۔ دائیں ہاتھ قبرستان کے ساتھ ساتھ ایک کچا راستہ جاتا نظر آیا۔ وہ دونوں اُس راستے پہ چل دیے۔

چک نظام کے راستے میں ایک چھوٹا سا قبرستان تھا یہ قبرستان اُس سے کافی بڑا تھا۔ پھر اُس نے سوچا وقت کے ساتھ جب بستیاں بڑی ہوتی ہیں تو اُن کے ساتھ قبرستان بھی پھیلنے لگتے ہیں۔ بستیوں میں زندگی اس سے بے خبر کہ موت کا دامن بھی وسیع ہو رہا ہے اپنی دھن میں بے فکر اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ قبرستان سے آگے بائیں ہاتھ ایک جوہڑ تھا اور جوہڑ کے کنارے برگد کا ایک بوڑھا درخت تھا۔ بوڑھے برگد کے نیچے پرانی اور بوسیدہ اینٹوں کا ایک کھنڈر سا پھیلا تھا۔ بوڑھے نے رک کر اُس برگد کے درخت کو دیکھا۔ چک نظام کے آس پاس بھی برگد کا ایک درخت ہوا کرتا تھا پر اُس کے نیچے ایک کنواں تھا۔ بوڑھے نے سوچا یہ کھنڈر شاید اُس کنویں کے ہی ہوں۔ برگد کے قریب یہ جوہڑ نیا ہمسایہ تھا پہلے وقتوں میں تو برگد کے آس پاس ہرے بھرے کھیت ہوا کرتے تھے۔ جوہڑ سے آگے کچے پکے مکانوں کی ایک بستی شروع ہو گئی۔ وہ دونوں جب بستی میں داخل ہوئے تو یکا یک بوڑھے کی پیشانی سے شکنیں غائب ہو گئیں خوشی شفق رنگ ہو کر گالوں کے افق پر اترتی چلی جا رہی تھی۔ یہ گلیاں یہ کوچے، یہ در و دیوار کافی حد تک بدل ضرور گئے تھے مگر اُس کے لیے مکمل اجنبی نہیں ہوئے تھے۔ چک نظام اُس کی طرح بوڑھا نہیں ہوا تھا بل کہ وقت کے ساتھ ساتھ کافی حد تک پھیل گیا تھا اور جوان ہو گیا تھا۔ چک نظام جہاں اکا دکا پکی حویلیاں تھیں اور باقی سارے کچے مکان تھے، وہاں اب اکا دکا کچے مکان تھے اور اکثریت پکے گھروں کی تھی۔ لوگ حیرت سے اُس اجنبی بوڑھے کو تکتے تھے۔ آج وہ اُس چک نظام کیلیے اجنبی تھا جہاں وہ پیدا ہوا پلا بڑھا۔ جس کے گلی کوچوں میں بچپن کا کھلنڈرا پن پھیلا تھا اور منہ زور

اتھری جوانی کی ٹھوکریں بکھری پڑی تھیں۔ کچھ دیر کی تگ و دو اور تلاش کے بعد وہ بالآخر اپنی حویلی کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا ڈیوڑی کی اینٹیں خستہ ہو کر بھربھری ہو چکی تھیں۔ کہیں کہیں بھربھری سرخ اینٹوں پر کلر کی سفید تہہ جمی ہوئی تھی۔ سیمنٹ کے ٹکڑے باقی تھے اُن پر سیمنٹ ہی سے بنے نقش و نگار کے معدوم ہوتے نشان باقی تھے۔ ڈیوڑھی کے کواڑ نیچے سے کافی حد تک وقت اور دیمک کی نذر ہو چکے تھے۔ کواڑ بند تھے اور باہر سے کنڈی لگی تھی۔ بوڑھے اجنبی نے کنڈی کھولی اور کواڑ کو اندر دھکیلا۔ ایک دھیمی چرچراہٹ کے ساتھ وقت کے ہاتھوں بوسیدہ ہوتا دروازہ لرزتے ہوئے کھل گیا۔ بوڑھے شخص کی پیلی گدلی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی نمودار ہوتے چلے گئے۔ اُس نے بوڑھے پپڑی جمے ہونٹوں سے دروازے کو بوسہ دیا اور دہلیز پہ سجدہ ریز ہو گیا۔ آتے جاتے لوگ حیرت سے اُس سٹھیائے ہوئے بوڑھے کے پاگل پن کو تکتے تھے۔ کافی دیر سجدہ میں رہنے کے بعد وہ اٹھا تو اُس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی۔ وہ اٹھا اور وارفتگی سے ڈیوڑھی کی دیواروں سے لپٹ گیا۔ وہ بوسیدہ دیواروں پہ لاغر ہاتھ پھیرتا اور اپنے چہرے پہ مل لیتا۔ سورج کہیں دور مغرب کے اندھے کنوئیں میں اتر رہا تھا اور ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں جو ڈیوڑھی کے راستے برآمدے پر اتر آئی تھیں منڈیروں سے رخصت ہونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ صحن میں بیری کے درخت کے نیچے بان کی چارپائی پڑی تھی وہ دونوں اُس پر بیٹھ گئے۔ وہ ابھی چارپائی پر بیٹھے ہی تھے کہ ڈیوڑھی سے ایک نوجوان اندر داخل ہوا اُس نے ہاتھ میں حقہ اٹھا رکھا تھا اور دن بھر کی مشقت کے آثار اُس کے چہرے سے عیاں تھے۔ اُس جوان کے کے پیچھے ایک دیہاتی عورت اور دو لڑکے بھی حویلی میں داخل ہوئے۔ اُن دونوں اجنبیوں کو دیکھ کر وہ تمام حیرت کے سکتے میں تھے۔ بالآخر وہ نوجوان بولا!

”جی آپ کون؟“

”میں اس گھر کا مالک ہوں!“ بوڑھے نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے لفظ ادا کیے۔

”اس گھر کا مالک تو میں ہوں“، نوجوان کے لہجے میں غصے اور حیرت کا ملا جلا تاثر تھا۔ وہ غصے میں اس لیے تھا کہ اجنبی اُس کے گھر میں گھس آیا تھا اور اب اُس کے گھر پہ بلا جواز ملکیت کا دعویٰ کر رہا تھا۔

”بیٹا تمہارا نام کیا ہے؟“ بوڑھے نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”میرا نام خورشید احمد ہے۔“ بوڑھے نے باری باری اُس کی بیوی اور بیٹوں کے سر پہ بھی ہاتھ پھیرے۔ دن بھر وہ گندم کی کٹائی میں مصروف رہے تھے اور اب اس ناگہانی آفت نے انہیں چکرا دیا تھا۔

”بہت پیارا نام ہے خورشید۔ خورشید بیٹا اگر تم لوگ اطمینان سے بیٹھ سکتے ہو تو میں تمہیں ایک چھوٹی سی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔“ خورشید نے برآمدے میں سے چارپائی اٹھائی اور اُن کے سامنے ڈال دی اور وہ پورا خاندان اُس پر بیٹھ گیا۔

”خورشید بیٹا یہ گھر میرا گھر ہی تھا۔ وہ جو سامنے برآمدے میں کونے والا کمرہ ہے نا میں اُس کمرے میں

پیدا ہوا تھا۔ ماتا پریت کور یہی بتایا کرتی تھی۔ میرے باپ کا نام سردار جتندر سنگھ تھا وہ اس گاؤں کے سرپنچ تھے۔ میرے دادا سردار نظام سنگھ نے یہ گاؤں آباد کیا تھا۔ جب ہم لوگ چلے گئے تو گاؤں کا نام بھی بدل کر چک نظام سنگھ سے بستی خیر دین ہو گیا۔ میرے باپ نے میرا نام سردار بلوندر سنگھ رکھا۔ اسی برآمدے میں گھٹنوں کے بل چلتے چلتے میں نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھا۔ گرمیوں کے دنوں میں اسی دالان میں ماتا پریت کور کی لوریوں کی آواز گونجتی تھی اور نیند دبے قدموں آنکھوں کی وادیوں میں اتر آتی تھی۔ اسی صحن میں بہن امرت کور ''کنگی کلیر دی، پگ میرے ویر دی'' گایا اور کھیلا کرتی تھی اُس کی سکھیوں کے ہنسنے اور گانے کا شور دن بھر ان در و دیوار کے اندر گونجتا رہتا تھا۔ وہ سامنے ڈیوڑی میں سردار جتندر سنگھ کی پنچایت لگا کرتی تھی اور لوگوں کا میلہ تھا کہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا اور ماتا پریت کور کا سارا دن لسی پانی اور روٹی ٹکر کے بندوبست میں گزر جاتا تھا۔ اسی ڈیوڑھی میں سے سردار سکھوندر سنگھ پہلے اپنے کندھوں پہ بٹھا کر اور پھر انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ سکول لے جایا کرتا تھا۔'' بوڑھے سردار نے پگڑی درست کرتے ہوئے تھوڑا توقف کیا۔ وہ پورا خاندان بیتے وقتوں کی الف لیلیٰ میں گم ہو چکا تھا۔

''بچپن سے لے کر جوانی تک کی سبھی خوشیاں انہی در و دیوار کے اندر تو بکھری ہوئی ہیں۔ اسی ڈیوڑھی سے میری بارات نکلی تھی اور اسی صحن میں اجیت کور کی ڈولی اتری تھی۔ بلوندر سنگھ نے اپنی پتنی کی طرف اشارہ کیا۔

''اسی صحن میں میں نے اپنوں کو پرائے ہوتے اور دوستوں کو دشمن بنتے دیکھا۔ میں لوگوں کو دوش نہیں دیتا وہ وقت ہی ایسا تھا۔ جب تقسیم کا اعلان ہوا تھا تو سبھی بدل گئے تھے۔ وہی جو ماتا پریت کور کے ہاتھ سے لسی پیتے تھے اور پراٹھے کھاتے تھے اور اپنی ماں کہتے تھے اُنہی کے ہاتھوں ماتا پریت کور، بہن امرت کور اور بھائی سکھوندر سنگھ کے سینے چھلنی ہوئے وہ وقت ہی ایسا تھا۔ ہندوستان جاتے ہوئے جو راستے میں ملے جو وہاں سے آ رہے تھے اُن کے ساتھ بھی یہی بیتی تھی۔'' بوڑھے سردار کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی ''اُن در و دیوار نے اُن کی چتا کی آگ کے شعلے دیکھے تھے اور اسی صحن میں سب رشتے راکھ ہو گئے تھے دکھ اور سکھ کے ان گنت لمحے جو زندگی کا اثاثہ ہیں اس آنگن سے وابستہ تھے۔ سردار جتندر سنگھ، اجیت کور اور میں جان بچا کر ادھر چلے گئے۔ مگر میرا دل ساٹھ سال سے مسلسل ان گلی کوچوں ان در و دیوار کی لیے تڑپتا ہے۔ آیا تو میں بابے نانک کی جنم بھومی پہ ماتھا ٹیکنے کے بہانے سے ہوں پر اصل ماتھا میں نے اس دہلیز پر ٹیکنا تھا۔ زندگی کی ایک آخری خواہش تھی کہ جب آنکھیں بے نور رہوں تو اس حویلی کا ایک آخری نقش ان آنکھوں کی پتلیوں میں محفوظ ہو۔''

شام کی تاریکی آہستہ آہستہ در و دیوار پہ بسیرا کرتی جا رہی تھی۔ خورشید احمد کی آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی تھی۔ گھر کا اصلی مالک اُس کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ خود کو اپنے گھر میں ہی اجنبی محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆☆

شاہین کاظمی

تریاق

پربتوں سے رات اُتری تو راستوں پر اندھیرا اُبھنے لگا، خنکی بڑھ رہی تھی وہ قدرے پریشان ہو گیا۔

”شاید میں راستہ بھول گیا ہوں، ورنہ ابھی تک تو مجھے وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔“

اُس نے بیلوں کو ہُشکارا لیکن دن بھر کے ناہموار راستے نے انھیں بھی تھکا دیا تھا، ہُشکارنے کے باوجود اُن کی چال میں سست روی رہی۔ وہ چاہتا تھا رات کے پوری طرح جاگنے سے پہلے اپنی منزل پر پہنچ جائے۔ اُس کی بیوی بُری طرح کراہ رہی تھی۔ کمبل درست کرتے ہوئے وہ بیلوں کو پھر سے ہُشکارنے لگا کہ اچانک وہ سیاہ سنگی عمارت جیسے زمین سے اُگ آئی۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت بھر گئی، تاہم اُس نے بیل گاڑی کا رُخ عمارت کی طرف موڑ دیا۔

”سنو کیا یہ قدیمی معبد ہے؟“ عمارت کے باہر سفید کپڑوں میں ملبوس وہ بوڑھا شخص پتھریلا صحن صاف کر رہا تھا۔

”کیا تم اونچا سنتے ہو؟“ وہ بیل گاڑی سے اُتر آیا۔

”تم مجھ سے مخاطب ہو؟“ بوڑھا ہلکے سے مسکرایا تو اُس کے دودھیا دانت نمایاں ہو گئے۔

”ہاں، اسے قدیمی معبد ہی کہا جاتا ہے۔“

”میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں تم اُس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“ بوڑھے کی آواز میں نرمی تھی۔

”نہیں میں اُسی سے بات کرنا چاہوں گا۔“

”شاید میں تمھاری کوئی مدد کر سکوں۔“

”میں اپنی اذیتوں کا اشتہار نہیں لگانا چاہتا، اِس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے میرا اُس سے ملنا نہایت ضروری ہے۔“

”تمھیں کیوں لگتا ہے کہ وہ تم سے ملنا چاہے گا؟“

”اس لیے کہ میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”تم اُسے اچھی طرح جانتے ہو؟“

''ہاں میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''معذرت، مگر میں تمھاری بات سے متفق نہیں ہوں، اگر تم اُسے اچھی طرح جانتے ہوتے تو آسمان سے اُترنے والا پانی روک نہ دیا جاتا، تم نے دیکھا، اب آسمان سے بارش نہیں ہوتی۔''

''جانتا ہوں بارش نہیں ہوتی، لیکن اس بات کا اِس ملاقات سے کیا تعلق؟ دیکھو مجھے الجھاؤ مت، میں بہت لمبے سفر سے آیا ہوں، میری بیوی شدید تکلیف میں ہے، میں اُس سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔''

''کیا ہوا ہے تمھاری بیوی کو؟''

''وہ تخلیق کے مراحل سے گزر رہی ہے۔''

''تخلیق کا مرحلہ تکلیف دہ ہوتا ہی ہے، اِس میں گھبرانے والی کوئی بات نہیں۔''

''جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں وہ تم نہیں دیکھ سکتے، اس لیے بہتر ہوگا تم جو کام کر رہے ہو اُس پر دھیان دو۔''

''تم جانتے ہو تم کتنے منہ پھٹ ہو؟''

''کیا میرے جاننے سے حقیقت بدل جائے گی؟''

خاموشی کا ایک طویل وقفہ۔۔۔۔

''میں معذرت چاہتا ہوں کچھ سخت الفاظ بول گیا، میں ایسا نہیں تھا لیکن جانے کیوں ایسا ہو گیا ہوں، تم نہیں جانتے آبادیاں نابود ہو رہی ہیں، چھتنار پیڑوں کے بڑھتے ہوئے سایوں نے دوسروں کے حصے کی دھوپ بھی چاٹنا شروع کر دی ہے، خوابوں کا رنگ بدل رہا ہے، قدم تھمنے لگے ہیں، اور میرا خوف بڑھ رہا ہے''

''تمہارا خوف بے بنیاد ہے، کچھ نہیں ہونے والا، جو گھڑی اٹل ہے سو ہے، بارشوں کا رکنا کیا اِس گھڑی کی منادی نہیں ہے؟''

''میں مسافر ہوں جو گھڑی مسافت کی لکھی گئی ہے اُس گھڑی پاؤں رکاب سے باہر نہیں ہوگا، لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''بستی میں اُترتے اندھیروں نے سب کو بے چین کر دیا ہے، وہاں کے باسیوں کی ہیئت بدل رہی ہے۔''

''ہیئت بدلنے سے تمھاری کیا مراد ہے؟''

''تم شاید نہیں سمجھ رہے میں کیا بات کر رہا ہوں، پیروں سے سکوت اور جسم سے رعشہ کا لپٹ جانا... میں اِس کی وجہ جاننا چاہتا ہوں، مجھے یہ بھی خبر ہے کہ موعود گھڑی کی ایک ساعت مقرر ہے اِس نے اِسی ساعت میں ظہور پذیر ہونا ہے۔''

‘‘تم کہاں سے آئے ہو؟’’

‘‘میں شمال کا رہنے والا ہوں ہم ابدی زندگی کے چشمے کے وارث اور ستاروں کے ورثے کے امین کہلاتے تھے۔’’

‘‘وہاں سے کوچ کرنے کی وجہ؟’’

‘‘جب سے ہمیں سیاہ دھبوں کی وبا نے چاٹنا شروع کیا ہمارے قدم منجمد ہونا شروع گئے، ہاتھوں میں رعشہ اُترا تو وقت ہمیں پچھاڑ کر آگے بڑھنا شروع ہوگیا، چاروں طرف سے ہونے والی یلغار سے ہمارے چہرے مسخ ہوتے گئے۔’’

‘‘مسخ ؟ کیا ہوا؟۔’’

‘‘ہاں ہمارے بڑے بوڑھے بتاتے ہیں کہ صدیوں پہلے ہمارا ہر پیدا ہونے والا بچہ ایک خاص قسم کے نور کے ساتھ پیدا ہوتا تھا، پورے وجود سے روشنی پھوٹتی نظر آتی تھی، زیبائی کا یہ تحفہ ہمیں قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا، لیکن ایک دن اچانک ہم میں سے چند ایک نے اِسے فروخت کردیا۔ حاصل ہونے والا فائدہ اتنا زیادہ تھا کہ دوسرے لوگ بھی خود کو روک نہ سکے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ہماری زیبائی دوسروں کے پاس گویا رہن رکھی ہوئی تھی۔’’

‘‘پھر کیا ہوا؟’’

‘‘ کیا مجھے ایک گلاس پانی مل سکتا ہے؟، بول بول کر میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ آہ، میں پانی کے حیات بخش ذائقے کو ترس گیا ہوں۔’’

‘‘تم اپنی بات مکمل کرو، میں دیکھتا ہوں۔’’

‘‘ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ ہم نے تجارت شروع کردی، ہم جو سنہری چشمے کے وارث اور ستاروں کے امین تھے۔’’

‘‘یہ بات میں سن چکا ہوں، کیا بہتر نہ ہوگا تم مختصر الفاظ میں اپنی کہانی بیان کرو۔’’

‘‘میرے پاس بتانے کو کچھ زیادہ نہیں ہے۔ صدیوں تک ایسا ہی ہوتا آیا، ہماری سنہری رنگت دھیرے دھیرے ماند پڑنے لگی، ہمارے چہروں پر عجیب طرز کے سیاہ دھبے نمودار ہوئے اور بڑھتے گئے۔ ہر کوئی ان سے خوفزدہ تھا، لیکن ان کے ظاہر ہونے کے سبب سے ناواقف۔’’

‘‘کیا اِسے لاعلمی سے تعبیر کیا جائے گا؟’’

‘‘ہاں تم شاید ٹھیک کہتے ہو، ہم اس تحفے کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ نہ تھے، ہوتے بھی تو کیسے ہمارے لیے تو یہ بالکل عام سی بات تھی، لیکن جب پتہ چلا بہت دیر ہو چکی تھی، ہمارے ہاتھوں پاؤں میں رعشہ اُتر آیا، نسیان کا مرض ہماری یادداشتوں کو کھا گیا، میں نے پہلی بار جب ایک مریض کو دیکھا تو بہت خوفزدہ ہوگیا

تھا، طبیبوں کا کہنا تھا یہ چھوت کا مرض ہے، اُڑ کر آن لگتا ہے۔ ''

''وہ شفا خانے میں ایک جگہ کھڑا تھا، اُس کے قدم لگتا تھا، جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے، اُس کے بدن میں شدید قسم کا ہیجان اور بیقراری تھی، وہ اپنے روزمرہ کے افعال بھی مناسب انداز میں سرانجام نہیں دے پاتا تھا، تیمارداری کرنے والی خاتون اُس مریض کے پیچھے کھڑی تھی۔ ''

''ایک، دو، تین۔ ایک بڑا سا قدم،، وہ اُسے قدم اُٹھانے پر مائل کر رہی تھی، لیکن اس کے ''بڑا سا قدم،، کہنے کے باوجود مریض کے پاؤں بمشکل زمین سے اٹھتے اور پھر وہیں جم جاتے، وہ بے دم سا ہو کر آگے کی طرف جھکتا جاتا یہاں تک کہ اپنا توازن کھو دیتا، تیماردار خاتون کی آواز میرے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہی تھی، میں تیزی سے گھر کی طرف بھاگا، لیکن راستے میں ہر جگہ لوگ اسی طرح قدم اٹھانے کی کوشش میں نڈھال نظر آئے، آہستہ آہستہ پوری بستی منجمد ہونے لگی۔ ''

خاموشی کا ایک اور طویل وقفہ۔۔۔

''کیا ہوا خاموش کیوں ہو؟''

''میں سوچ رہا ہوں ہم نے کتنی بڑی بھول کی، ہماری زیبائی سے ایسی ادویات تیار ہونے لگیں جو کسی بھی نئے پیدا ہونے والے بچے کو سنہری جلد کا تحفہ عطا کر سکتی تھیں، شمالی نہ ہونے کے باوجود نسل در نسل بچے اُسی گریس کے ساتھ پیدا ہوتے گئے، مکمل طور پر نہ سہی مگر ان میں ہماری زیبائی کا پرتو جھلکتا تھا، تم کیا کہتے ہو اس بارے میں؟''

''دیکھو میں اپنی رائے دینے کا مجاز نہیں ہوں، اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن ایک بات طے ہے، عطا کو صرف قدرہی دوام بخش سکتی ہے۔ ''

ایک طویل سرد سانس۔ اور خاموشی کا نیا وقفہ۔۔۔

''میں تمھاری بقیہ کہانی سننا چاہوں گا، بتاؤ پھر کیا ہوا؟''

''پھر کیا ہونا تھا، ہماری بدلتی ہیئت سے دوسرے خوفزدہ رہنے لگے تو کچھ شالیوں نے اپنے بدن ایک خاص قسم کی مٹی سے رنگنے شروع کر دیے، یہ ہماری تباہی پر آخری مہر تھی، یہ مٹی ہر ایک پر الگ الگ اثر کرتی تھی، ہماری یک رنگی اور پہچان کھو گئی، تو باہر سے در آنے والوں نے ہماری زیبائی کی فریبی ردا اُوڑھ کر ہماری زندگیوں میں افتشار ہونا شروع کر دیا اور ہم۔ کیا کیا بتاؤں تمھیں اب۔ ''

''کیا تمھارے ہاں کوئی ایسا طبیب نہ تھا جو اِس بیماری کا علاج کر پاتا؟''

''طبیب بہت تھے اور اعلیٰ پائے کے بھی، لیکن شاید ہم سے ہماری گریس ہی نہیں چھنی تھی، شعور و وجدان بھی رخصت ہو گیا تھا، ہم ہواؤں کے رُخ نہیں پہچان پائے اور آندھیوں نے اپنے دوش پر رکھی برق سے ہمارے گھر پھونک ڈالے۔ ''

”جب آگہی کا نور ڈھانپ دیا جائے تو اندھیرا مدتوں ٹھہرا رہتا ہے، لیکن اس چشمے کا کیا ہوا، ؟ میں نے تو سنا تھا اس کا پانی آبِ شفا کہلاتا تھا۔ “

”تم نے ٹھیک سُنا، اس چشمے کا پانی واقعی آبِ شفا ہے، لیکن وقت نے ہم سے عجیب سی چال چلی ہمارے عقل و شعور سلب ہوئے تو ہم نے اس چشمے کو محض برکات تک محدود کر دیا، اسے کاروبار اور طاقت کا ذریعہ بنا لیا۔ “

”ہمارے گلے سڑے بدن تعفن پھیلا رہے تھے، ہم بینائی رکھتے ہوئے بھی اندھے، شنوائی کے باوجود بہرے اور ناطق ہوتے ہوئے بھی گونگے ہو گئے، آنے والے بے مہر وقت کی چاپ ہمیں ڈرانے لگی، لیکن واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا، ہم کسی ریوڑ کی طرح بے جہت بھاگ رہے تھے، میری بیوی اُمید سے تھی اور میں چاہتا تھا کہ ہمارا بچہ اپنی اصلیت کے ساتھ پیدا ہو، اسی سنہری رنگت کے ساتھ جو فطرت کی عطا تھی۔ “

”تم جانتے ہو عطا روٹھ جائے تو کیا ہوتا ہے؟“

”ہاں، عطا روٹھ جائے تو وقت کے ترازو میں رکھا ہر عمل خفیف اور ارزاں ہو جاتا ہے، آوازیں بانجھ اور حروف تاثیر سے عاری۔ بارشیں روک دی جاتی ہیں اور زمین عفریت بن کر اپنے اوپر رہنے کا تاوان لاشوں کی صورت میں وصول کرتی ہے۔ “

”تو تم نے اسی ڈر سے وہ بستی چھوڑ دی؟“

”میں بھاگا نہیں ہوں، مجھے اپنے لوگوں کی چیخیں سونے نہیں دیتیں، نوحے رلاتے ہیں، کرلاہٹیں بے دم کر دیتی ہیں، میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ “

”تمھیں یہاں کا پتہ کس نے بتایا؟“

”بستی کے دوسرے کنارے پر رہنے والے عبادت گزار بوڑھے نے، وہ بستی کا واحد شخص ہے جو اس بیماری سے محفوظ ہے، لوگ اسے جادوگر سمجھتے ہیں، اس لیے وہ بستی کے دوسرے کنارے پر جا بسا۔ “

”اب تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں، مجھے تریاق کا پتہ جاننا ہے، لیکن اس سے پہلے مجھے اپنی بیوی کے لیے کوئی دوا چاہیے وہ سخت تکلیف میں ہے۔ “

”اوہ، تم نے بتایا کہ وہ تخلیق کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ “

”ہاں تکلیف، بھوک اور کئی دنوں کے سفر کی تکان نے اُسے نڈھال کر دیا ہے۔ “

”تم پاک طینت اور پاک دل معلوم ہوتے ہو میں تمھارے باطن میں روشنی محسوس کر سکتا ہوں۔ “

”کیا مجھے ایک گلاس پانی مل سکتا ہے اور نہیں تو وہ کم از کم اپنے ہونٹ ہی تر کر لے۔ “

”ہر طالبِ عطا کا سزاوار ہے، تم بھی محروم نہیں رکھے جاؤ گے، لیکن ایک بات یاد رکھنا اگر اندر کی آنکھ بند

ہوتو ظاہری آنکھ بھی اندھیرا اوڑھ لیتی ہے۔’’

‘‘ہاں سمجھ گیا۔’’

‘‘یہ لو۔’’ شفاف سیال سے بھرا سنہری کانچ کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا جاتا ہے۔

‘‘یہ پانی ہی ہے نا؟، اس کی رنگت قدرے مختلف ہے۔’’، اس نے گلاس سے چند بڑے گھونٹ بھرے۔

‘‘سپاس گزار ہوں، میں یہ بقیہ پانی اپنی بیوی کو دے کر آتا ہوں۔’’

‘‘بارِ دگر اظہارِ تشکر قبول ہو۔ چند گھونٹ پانی نے ہمارے مردہ تنوں میں جیسے نئی زندگی پھونک دی ہو، لگتا تھا جیسے یہ آبِ شفا ہو۔’’

بوڑھے کے چہرے پر زیرِ لب تبسم نمودار ہو۔

‘‘غرض کی ملونی سے نجات کے لیے ذات سے باہر نکلنا لازم ہوتا ہے ورنہ آفاقی دکھوں کی میعاد بڑھ جاتی ہے۔’’

‘‘میں سمجھا نہیں؟’’

جلد سمجھ جاؤ گے۔’’

‘‘خیر یہ بتاؤ کیا اب میں اُس سے مل سکتا ہوں؟’’

‘‘تمھاری طلب کو نوازا جا چکا ہے۔’’ دودھیا دانت پھر سے دکھائی دینے لگے۔ بوڑھے کا چہرہ ایک دم لو دینے لگا تھا۔

یکا یک مسافر نے دیکھا وہ خالی گلاس کے ساتھ کچے راستے پر تنہا کھڑا ہے، بیل گاڑی میں پڑے پرانے کمبل سے سنہری لو چھن رہی تھی، اُس کی بیوی پرسکون ہو چکی تھی۔

دور اُس شمالی بستی کے ایک کچے مکان میں جھلنگا سی چارپائی پر لیٹے بوڑھے عبادت گزار کا سینہ جانے کیوں ایک بار پھر دکھ سے بھر گیا۔

ایک، دو، تین، بڑا سا قدم، قریبی مطب سے آتی آوازیں تیز ہونے لگیں۔

☆☆☆

محمد عباس

جاوید مستان

کسی نے بھی میری بات کا یقین نہیں کیا، لیکن میں تو جانتا ہوں کہ سچ کیا ہے۔ خود میں بھی ابھی تک اس جھٹکے سے باہر نہیں آ سکا کہ حقیقت ہمارے خوابوں کی نسبت اس قدر کم تر ہو سکتی ہے۔ میں تو ابھی بھی دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر ایک لمحے کے لیے مجھے شک بھی ہو جاتا کہ یہ واقعی جاوید مستان ہیں تو میں ان کے پاؤں چومنے کو گر جاتا لیکن میں تو کیا، میرے دونوں ساتھیوں میں سے بھی کسی نے ایک دفعہ سوچا تک نہ ہو گا کہ یہ وہ ہو سکتے ہیں، آپ خود ہی سوچیں کہاں وہ سکرین پر گبھرو جوان، یہ بڑی بڑی نوک مار کالی کالی مونچھیں جنھیں دیکھ کر ہی عام آدمی پر خوف طاری ہو جائے، چوڑا چکلا لوہا سینہ، پھرتیلا چست بدن۔ اور ادھر کیا تھا......! ہم سہا گا یقین کرتے۔ بل کہ وہ جب بتاتے تھے کہ میں جاوید مستان ہوں تو ہماری ہنسی نکل جاتی بل کہ ایک دفعہ تو میں اس کے بالکل قریب گیا اور اسے اپنی مونچھیں دکھا کے کہا اگر تم جاوید مستان ہو تو میں تم سے اچھا جاوید مستان ہوں، اگر ان جیسا بننے کا شوق ہے تو ان کی طرح مُچھ تو رکھو پہلے، اس پر اس نے منمنا کر کہا تھا، میں جاوید مستان جیسا بن نہیں رہا، میں ہوں ہی جاوید مستان، اس پہ میرے ساتھیوں کی بھی ہنسی نکل گئی تھی اور انھوں نے مجھے یہ کہہ کر پیچھے ہٹا دیا تھا کہ اس پاگل کا کوئی علاج نہیں۔

ہمیں واقعی وہ پاگل لگا تھا، بھلا وہ جاوید مستان کیسے ہو سکتا تھا۔ میں خود جاوید مستان کا فین تھا بل کہ فین کیا، مرید ہی سمجھ لیں۔ بچپن سے آج تک فلمیں اگر دیکھیں تو صرف ان کی، کسی اَور کی فلم لگی ہو تو بھوسے کی طرح بدمزہ لگتی۔ اداکاری تو صرف جاوید مستان جانتا ہے، ہیرو ہو تو جاوید مستان۔ یہی باتیں کیا کرتا تھا میں۔ ان کی کون سی فلم ہے جو میں نے نہیں دیکھی تھی بل کہ کون سی فلم ہے جو میں نے محض ایک بار دیکھی ہو، میں تو صرف ان کا نام پڑھ کے سینما میں جا گھستا تھا۔ یہ بعد میں دیکھتا تھا کہ فلم کون سی ہے۔ ان کی جو فلمیں سینما پر دیکھی ہیں، ان کا ایک ایک سین سینما سکوپ یاد ہے، مکالمے ازبر ہیں، ساتھ یہ حساب بھی لگاتا رہتا کہ اس فلم میں انھوں نے کتنے بندے پھڑکائے، کتنی دفعہ سینہ تانا اور کتنی دفعہ مسکرائے۔ جو فلمیں وی سی آر پہ دیکھیں، وہ تو بار بار آگے پیچھے کر کے کبھی سلوموشن چلا کے دیکھتا تھا اور جاوید مستان کی ہر ادا پر واری جاتا تھا۔ ”جانگلی جٹ“، ”بالا جٹ“، ”کمینہ جٹ“، ”اُوکھا جٹ“، ”تگڑا جٹ“، ”جٹاں دا پکھراج“، ”گبھرو پت پنجاب دا“، ”ٹوکے دی دھار“، ”راوی دا رولہ“، یہ دس دس پندرہ پندرہ دفعہ اور ”جٹ دا انتقام“ جوان کی پہلی سپر ہٹ فلم تھی، وہ تو

کوئی پینتیس دفعہ دیکھی ہوگی ۔

وہ جب فلم کے پردے پر آتے تو دیکھ کے بدن مچل اٹھتا تھا، کئی دفعہ میں نے سینما سکرین کے پاس جا ،اُن پر نوٹ وار کر انہیں ویل دی تھی، جب وہ اپنا مشہور گنڈاسہ لہراتے ہوئے بیسیوں غنڈے لم لیٹ کر دیتے اور اپنا صاف ستھرا پَرنا لہراتے ہوئے سکرین پر اکڑ کے کھڑے نظر آتے تو سینما ہال میں ان کے نام پہ لگنے والے نعروں پر سب سے اونچا للکارا میرا ہوتا تھا۔ ان کے گنڈاسے کے ایک ایک مہلک وار پر میرے منہ سے سیٹی نکلتی تھی۔ ان کا اکڑ کر چلنا، ان کا شان کے ساتھ پنچایت میں بیٹھنا، عورت کے ساتھ مردانہ وار سلوک، جس میں پیار کے اظہار سے زیادہ انہیں اپنی مردانہ بے نیازی دکھانے کی فکر ہوتی، گھوڑے پر بیٹھے ٹکڑی ٹکڑی کرتے ان کا اوپر نیچے اچھلتا بدن، وہ ہر روپ میں نظروں کو بھلے لگتے تھے، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، بولنا چالنا ان کی ہر حرکت میرے دل پر نقش ہوتی۔ ان سب سے ہٹ کر ان کی جو خوبی ہمیں سب سے زیادہ پسند تھی، وہ ان کی لڑائی میں مہارت تھی۔ ''جٹ دا انتقام'' سے لے کر آخری فلم ''شیراں دا شیر'' تک کسی بھی فلم میں انھوں نے بزدلی نہ دکھائی۔ دشمن اگر دس ہیں یا پندرہ انہیں فکر نہ ہوتی بل کہ شروع کی کچھ فلموں کے بعد (شاید) جب ان کا ہاتھ پکا ہو گیا تب تو دس پندرہ کو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ دس پندرہ غنڈے ان کے سامنے آنے سے ہی گھبراتے ہیں اس لیے جب بھی آتے، چالیس پچاس ہی آتے لیکن جاوید مستان صاحب دو بدو لڑائی کے اتنے ماہر تھے، اللہ نے ان کے بازوؤں میں اتنی طاقت دی تھی کہ وہ دو تین منٹوں میں ان سب کو ملیا میٹ کر دیتے۔ یوں تو خالی ہاتھ کے ساتھ ساتھ چاقو، خنجر، تلوار، نیزہ، لاٹھی، پستول، بندوق، گن، کلاشنکوف سبھی قسم کے ہتھیاروں پر انہیں مہارت حاصل تھی لیکن اصل جوہر تب ہی سامنے آتے تھے جب گنڈاسہ ان کے ہاتھ میں ہوتا۔ دشمن کی صفوں کو چیرتے بل کہ پھاڑتے چلے جاتے۔ گنڈاسہ ان کے ہاتھ میں کیا ہوتا، موت کا پیغام تھا، جس کی طرف رخ ہو گیا، اس کا بدن کٹا پڑا ہوتا۔ میں نے ان کی دو مشہور فلموں میں باقاعدہ گنا تھا، ''شیر دا علاقہ'' میں انھوں نے کلاشنکوف سے آٹھ منٹ میں تراسی غنڈے مارے تھے جب کہ ''سجناں دا وَیر'' میں انھوں نے گنڈاسے سے محض چھ منٹ میں اَناسی غنڈے کاٹ کے رکھ دیے تھے۔ یوں دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ گنڈاسے پر زیادہ دسترس رکھتے تھے۔

لڑائی میں ان کی اس مہارت کی وجہ سے ہی میں اور میرے ساتھ لاکھوں اور لوگ ان کے پرستار تھے، اسی لڑائی کی وجہ سے ہم ان کے پرستار بنتے اور پھر بعد ازاں ان کی ایک ایک ادا پر فدا ہونے لگتے۔ جاوید مستان نڈر آدمی تھے، دلیر مرد تھے، اس لیے ہم انہیں پوجتے تھے۔ سکرین پر جب فلم شروع ہوتی، غنڈوں کی غنڈہ گردی، ان کی بدمعاشی، بے جا ظلم کے مناظر سامنے آتے تو ہم ان پر خون روتے ہوئے اندر ہی اندر یہ جان کر اپنا حوصلہ سلامت رکھتے کہ یہ لفنگے جتنا ظلم ڈھا سکتے ہیں، ڈھا لیں، ابھی جب جاوید مستان آئیں گے تو ان سب کی ماں بہن ایک کر دیں گے۔ اور جب وہ اچانک کسی پہاڑ سے کود کر، دریا سے ابھر کر، زمین پھاڑ کر نکلتے

ہوئے، سکرین پر طلوع ہوتے تو ہال میں بیٹھے لوگ اپنی امیدوں کو مجسم دیکھ کر نعرے لگانے لگتے۔ اپنے نجات دہندہ کو سامنے دیکھ کر ان سے اپنے جذبات پر قابو نہ پایا جاتا تھا۔ اکثر اس قدر رولا مچتا کہ سینما والوں کو فلم دو چار منٹ پیچھے کر کے چلانی پڑتی یا کبھی کبھی بالکل روکنی پڑتی۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں چاروں طرف ظلم، غنڈہ گردی، بد معاشی، نا انصافی، سمگلنگ، جبری آبرو ریزی اور قتل و غارت نے اندھیر مچا رکھا ہو، وہاں جاوید مستان ایک ایسا سورج تھے جس کے جلوے سے ہی اندھیرے چھٹ جاتے تھے۔ جاوید مستان مسیحا تھے، وہ ظلم اور نا انصافی ختم کر کے انصاف کا بول بالا کرنے والے تھے۔ وہ عزتوں کے رکھوالے تھے، وہ حق کا پرچم تھے، ان کا سکرین پر آنا ہی اس بات کی دلیل تھا کہ اب دنیا سے برائی ختم ہو جائے گی اور اچھائی کا راج ہوگا۔ سب پُر شوق نظروں سے ان اندھیروں کے مٹنے کے مناظر دیکھنے لگتے، ہال میں بیٹھی ان مشتاق نظروں میں سب سے مشتاق نظر میری ہوتی تھی۔ جاوید مستان ہر طرح کی لڑائی پر پوری طرح عبور رکھتے تھے، دوبدو، دست بدست، ہتھیار سے، آمنے سامنے، گوریلا جنگ، ہر طریقِ جنگ پر مہارت تھی اور ہم نے انہیں کبھی ہارماننے نہ دیکھا تھا۔ طاقت، پھرتی اور چستی جتنی اس شیر کے بدن میں تھی، اتنی شاید اصل والے شیر میں بھی نہ ہو، تیس لوگوں کی یلغار ہو یا پچاس کی، وہ نرغے میں سے صاف بچ نکلتے اور ہم جو دشمن کی منصوبہ بندی سے واقف ہوتے تھے اور دل تھامے بیٹھے ہوتے، ان کے یوں نکل آنے پر خوشی سے ہال سر پر اٹھا لیتے۔ خطروں سے کھیلنے کا تو انہیں شوق تھا۔ برستی گولیوں، دستی بموں کے دھماکوں، گولوں کی بوچھاڑ، بارودی سرنگوں کے میدانوں سے مردانہ وار چلتے ہوئے وہ اپنے دشمن تک پہنچ جاتے اور پھر روئے زمین کو ان سے نجات دلا دیتے۔ جاوید مستان کے سامنے دنیا کا کوئی خطرہ معنی نہ رکھتا تھا اور انہیں کوئی طاقت روک نہ سکتی تھی۔

ان کی جو خوبی ہمیں اچھی لگتی تھی وہ ان کا نا قابلِ شکست ہونا تھا، ان کے بدن پر جتنے بھی زخم آ جاتے، کبھی جھکتے نہ تھے۔ فلم ''ہمت بہادراں دی'' میں کلہاڑیاں لے کر پندرہ آدمی نہتے جاوید مستان پر ٹوٹ پڑے اور ان کے بدن کا چپہ چپہ زخموزخم کر دیا لیکن ...... جیوے شیر کا بچہ ...... ذرا نیچے ہوئے، سانس لیا اور اٹھ کر ان پر ٹوٹ پڑے اور ذرا ہی دیر بعد پندرہ لاشوں کے گرد کھڑے صافہ پھٹکار رہے تھے۔ ''موتی میرا نام'' میں پولیس کی پارٹی نے انہیں گھیر لیا، یہ وادی میں تھے، پولیس چاروں طرف پہاڑیوں پر، چاروں طرف سے برستی گولیوں میں جاوید مستان نے ایسی دلیری کا مظاہرہ کیا کہ درجنوں گولیاں بدن میں اتر گئیں، لیکن پھر بھی انھوں نے فتح پائی اور دشمن کو مار کر ہی دم لیا۔ اسی طرح ''ڈاکو ماں'' فلم کا وہ سین تو مشہورِ زمانہ ہے کہ جب جاوید مستان درجنوں گولیاں کھا چکنے کے بعد پہلو کے بل گرتے ہیں، عین جب بدن زمین سے لگنے والا ہوتا ہے، ان کی ماں اپنی گرجدار آواز میں پکارتی ہے، اوئے شیدیا ...... اور ان کا بدن زمین پر لگنے کی بجائے ماں کی پکار سن کے دوبارہ اوپر اٹھنے لگتا ہے۔ ہم نے نعروں اور تالیوں کی گونج میں دیکھا تھا کہ زمین پر ہاتھ ٹکائے بغیر وہ اوپر اٹھے اور اٹھ کر دشمنوں کا جلوس نکال کے رکھ دیا۔ فلم ''راجا رانی'' کا وہ سین تو شاید آپ کو بھی یاد ہو جب ولن کی بہن

جاوید مستان کو ولن کے گھر کے پچھواڑے میں پکڑ لیتی ہے اور چور اور بزدل مرد ہونے کا طعنہ دیتی ہے، جاوید مستان یہ سن کر بھڑک اٹھے اور گرج کر بولے تھے، یہ طعنہ میں نہیں سن سکتا، میں مرد ہوں، مرد تو برستی گولیوں میں پیٹھ نہیں دکھاتے بل کہ سینہ تان لیتے ہیں، اس پر ولن کی بہن آزمانے کے انداز میں پوچھتی ہے کہ یہ سینہ کتنی گولیاں سہہ سکتا ہے، جاوید مستان اس کے سامنے اکڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسے للکار کر کہتے ہیں، تیرے پستول میں جتنی بھی گولیاں ہیں ابھی اتنی طاقتور نہیں ہوئیں کہ راجا نیاز علی کے سینے کی تھاہ تک پہنچ سکیں ۔ تو سارا پستول خالی کر دے، اس سینے میں ان کی گم شدگی کی خبر بھی نہ ملے گی ۔ اس پر ولن کی بہن دونوں ہاتھوں میں پستول پکڑ کر ایک ایک کر کے چھ کی چھ گولیاں جاوید مستان کے سینے پر چلا دیتی ہے لیکن جاوید مستان ٹھہرا مرد کا بچہ، اس کے سینے کے بال تک بھی نہیں لرزتے اور وہ چھ گولیاں کھا کر بھی اپنا چٹان سینہ پھیلائے اسی طرح کھڑے رہتے ہیں، ولن کی بہن ایسی مردانگی پر مرمٹتی ہے اور دوڑ کے ان کے کلیجے سے جا لگتی ہے اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس فلم میں یہی راجا کی رانی ہے ۔

جاوید مستان کبھی دشمن کے قابو نہیں آئے ۔ بے شک وہ جیسی بھی چالبازی کر لے، دشمن کبھی ان کے رشتہ داروں کو اپنے ساتھ ملا کر وار کرتا، کبھی ان کے کبھی بدخواہوں کو جمع کر لیتا، کبھی پولیس کو ان کی بو پر ڈال دیتا اور کبھی پوری حکومت جاوید مستان صاحب کے خلاف کھڑی ہوتی لیکن کبھی دشمن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا، ہمیشہ کامرانی کا تمغہ جاوید مستان کی چھاتی پر سجتا اور مہلک شکست کی داستان دشمن کے چور چور بدن پر لہو کی زبانی رقم ہوتی، عام طور پر جاوید مستان کبھی کسی کے ہاتھ نہ آتے تھے البتہ دشمنوں کی سازشوں یا جھوٹے الزامات کی بنا پر کبھی کبھار پولیس انہیں پکڑنے میں کامیاب ہو جاتی لیکن جاوید مستان کو جب اپنے ماں، باپ، بھائی، بہن میں سے کسی کے مرنے کی خبر ملتی تو وہ مشتعل ہو کر جیل توڑ کر بھاگ جاتے اور پھر تمام دشمنوں سے لڑ کے اپنی بے گناہی بھی ثابت کروا دیتے، یا دشمن کے نرغے میں آنے کی دوسری صورت یہ تھی جس میں دشمن ان کی محبوبہ، بہن، بیٹی یا ماں کو یرغمال بنا لیتا اور انہیں ہتھیار پھینکنے کو کہہ دیتا اور وہ جو غیرت کے خمیر سے تراشے گئے تھے، عورت کو مجبور دیکھ کر، اس کی عزت کی خاطر ہتھیار ڈال دیتے ۔ یہ صورت ان کی فلموں میں اکثر آتی تھی ۔ وہ بالکل بے بس کر دیے جاتے تھے ۔ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے جاتے، مارا پیٹا جاتا، ظلم کی ہر انتہا کر دی جاتی مگر وہ عورت کی عزت کو داؤ پہ دیکھ کر لب سیے رہتے، ایسے میں سینما ہال دم سادھ کے بیٹھا ہوتا، تمام سیٹیں بے جان ہو جاتیں، ہر آنکھ دعا بن جاتی اور جاوید کو کسی نہ کسی طرف سے مدد مل جاتی، بعض اوقات جب وہ دیکھتے کہ ان کی عورتیں محفوظ ہیں تب وہ خود ہی پلٹ کر وار کر دیتے، بعض اوقات ان کا کوئی جگری یار ایسے موقع پر آ جاتا جو عورتیں بچا لیتا ۔ کئی ایک فلموں میں تو بہت ہی کمال ہوا ۔ شاید یہ ایسے ہی واقعات تھے جن کی وجہ سے جاوید مستان ہم سب کو پسند تھے، سب کے دل میں لاشعوری طور پر یہ بات تھی کہ جاوید مستان کی پشت پر بڑی طاقتوں کا ہاتھ ہے، کئی فلموں میں ایسا ہوا کہ جاوید مستان پوری طرح بے بس ہو گئے اور کسی طرف سے بھی مدد

ملنے یا بچ نکلنے کی راہ نہ نظر آئی تو انھوں نے گڑگڑا کر پیر پیغمبروں سے مدد چاہی، مولا ان پہ مہربان تھا، کبھی پیر فقیر، اولیا، پیغمبران کے پاسبان تھے، اللہ جاوید مستان صاحب کی مغفرت کرے، جس کو بھی آواز دیتے، آندھیاں دوڑاتا، آسمان پر کالی گھٹائیں بکھیرتا ان کی مدد کو آپہنچتا۔ مولا علی مشکل کشا، مظلوم کربلا، سید الشہدا، امیر حمزہ، پیر خضر خواج، غوث پاک، شاہ شمس تبریز، داتا گنج بخش، خواجہ غریب نواز، لال شہباز قلندر، میراں شاہ، سیال شریف، سلطان باہو، امام بری، گولڑہ شریف کس کس کو جاوید مستان صاحب نے مشکل وقت نہ پکارا اور کس نے ان کی مدد نہ کی۔ وہ ادھر گڑگڑا کر دعا کرتے، اُدھر سکرین پر تمام مناظر دھندلے پڑنے لگتے، کچھ ہی دیر بعد واضح ہوتا کہ آندھی آ رہی ہے اور غیبی مدد پہنچ چکی ہے، دشمن کے دل پر ہیبت طاری ہو جاتی، جاوید مستان آزاد ہو کے ایک ایک کی پیٹھ سینکنے لگتے اور جو بچ جاتے اسے غیبی طاقت سے تبرک مل جاتا۔ ان پاک ہستیوں میں سے کبھی کسی کو ہم نے سکرین پر نہیں دیکھا اور آپ خود ہی بتائیں کہ ان ہستیوں کی تصویر گوروں کا بنایا ہوا کیمرا لے بھی کیسے سکتا ہے، البتہ غنڈوں کی ہونے والی پٹائی سے معلوم ہو جاتا کہ کون مدد کو آیا ہے، اگر دوشاخہ تلوار ہوتی تو حیدرِ کرار، دشمنوں کے سروں پر جوتے پڑ رہے ہوتے تو داتا گنج بخش، اگر عصائے مبارک سے ان کی خاطر ہو رہی ہوتی تو غوث پاک، بس یوں ہم پہچان لیتے تھے کہ کس طاقت نے مدد کی ہے۔ اور یہ انہیں پاک ہستیوں کی خاص عنایت تھی جس کی وجہ سے جاوید مستان کے پرستار انہیں پوجنے کی حد تک چاہتے تھے۔

پچھلے پینتیس برس سے جاوید مستان کا سکرین پر راج تھا۔ وہ میرے دادا کے ہیرو تھے، وہ میرے ابا جی کے ہیرو تھے اور اب وہ میرے بھی ہیرو تھے، جب گھر میں کچھ دیکھنے جوگا ہوا تھا تو ہر طرف جاوید مستان کے فوٹو دیکھے، ویڈیو کیسٹ کی شکل میں ان کی سینکڑوں فلموں کا ڈھیر دیکھا، کبھی مردوں کو ان کی نقالی کرتے دیکھا۔ میرے دل میں بھی ایک رہنما ستارے کے طور پر انہی کی تصویر نقش تھی اور میں ان کی فلمیں دیکھ دیکھ کر انہیں رہنما ستارے کی بجائے پوجنے کی حدوں تک پہنچ گیا تھا۔

جاوید مستان کے لاکھوں دوسرے مداحوں کی طرح میں بھی ان کا پرستار تھا، میں ان کی فلمیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا اور مزید دیکھنے کے لیے تڑپتا رہتا تھا، جب گھر پڑی تمام ویڈیو ختم ہو گئیں تو پیسے چرا، سکول سے بھاگ شہر جا کے سینما پر ان کی فلمیں دیکھنے لگا، دو ہی سالوں میں سکول چھوٹ گیا اور میں ذمہ داری سے آزاد ہو کے جاوید مستان بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ وہ میرے ہیرو تھے، میں ان کی طرح بننا چاہتا تھا۔ میں نے ان کی فلمیں دیکھ دیکھ کر پوری کوشش کی کہ میں چلتا پھرتا جاوید مستان نظر آؤں۔ میں مونچھ ان کی طرح ترشواتا، نائی کو خصوصی اجرت دے کر ان کی طرز پر بال کٹواتا، پرنا کندھوں پر رکھتا، پاؤں میں کھسہ، چلتے وقت ان کی طرح بازو پھیلا کر اور سینہ پھلا کر چلتا اور جب بات کرنی ہو تو کوشش کرتا کہ ان کی کسی فلم میں سے ڈائیلاگ بولوں، میرے پاس ہر سچویشن کے لیے ڈائیلاگ تھے، ابا جی جو خود جاوید مستان کے فین تھے، مجھے ان کی نقالی کرتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور میرے شوق پر کوئی اعتراض نہ لگاتے۔ خیر اگر کرتے بھی تو کیا تھا، کون سا اکیلا میں

ہی تھا جسے جاوید مستان بننے کا جنون تھا، اک زمانہ تھا جو جاوید مستان تھا، پچاس سال کے بوڑھے، چالیس سال کے مرد، تیس سال کے جوان اور ہم جیسے لڑکے، کس عمر کے لوگوں میں جاوید مستان بننے کا شوق نہ تھا۔ جس کی جتنی ہمت ہوتی وہ اتنی نقل کر لیا کرتا تھا۔ کسی کی چال ڈھال اُن کی طرح ہے تو کسی نے گفتگو میں ان کا انداز اپنایا ہوا ہے، کوئی ان کی نقل میں ہر وقت لڑائی کرنے کے چکر میں رہتا تھا اور کسی صاحب نے محض ان کی سی مونچھیں نمائش کی ہوتیں۔ ان کی طرح گنڈاسہ، کلاشنکوف وغیرہ اٹھائے گھومنے کا رواج نہ تھا کیوں کہ ہمارا علاقہ دشمنی، خاندانی مخاصمت وغیرہ جیسی لعنتوں سے پاک تھا اور کسی کو اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار رکھنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ جاوید مستان صاحب کی نقل محض چال ڈھال اور وضع قطع تک محدود رہتی۔ البتہ اس چیز کو معیوب نہ سمجھا جاتا تھا بل کہ جو شخص جاوید مستان صاحب کی اچھی نقل کر لیا کرتا، اس کی بڑی قدر ہوتی تھی، ٹی سٹال پر ہے تو دو ڈائیلاگ سنائے اور چائے کے پیسے کسی اَور نے دے دیے، کہیں جاوید مستان صاحب کی طرح دو بھڑکیں لگائیں تو خوب خاطر مدارات ہو گئی، دکاندار خاصی رعایت کر دیتے، رشتہ دار وقعت دیتے اور دوستوں یاروں میں بھی قدر ہوتی۔

میں ان کی اچھی خاصی نقل کر لیتا تھا، اور اس وجہ سے مجھے اپنے دوستوں کے حلقے میں کافی عزت ملتی تھی بل کہ اکثر تو میرا نام بھی بگاڑ کر تگڑا جٹ بولتے تھے جو کہ ان کی مشہور فلم کے مشہور کردار کا نام تھا۔ اسی عزت کی وجہ سے میں رفتہ رفتہ اپنے دوستوں کا لیڈر بنتا گیا اور وہ سب میرے کہنے پر چلنے لگے۔ فارغ تھے، نہ نوکری، نہ ذمہ داری ہم نے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے۔ ابھی نئی نئی زندگی تھی، بڑے پنگوں کا پتا نہ تھا مگر پھر بھی اپنی حد تک جو ہو سکتا تھا، کرتے رہتے، چھوٹی موٹی چوری، ڈکیتی یا کبھی کبھار وہ والی ہیرا پھیری۔ میں پیش پیش ہوتا، میری پلاننگ ہوتی اور وہ سب وہی کرتے جو میں کہتا۔ ہماری وارداتیں تو چھوٹی موٹی ہی تھیں لیکن اس کے نتیجے میں میری لیڈری چمکنے لگی۔ ایک دفعہ کسی ساتھی نے کہا تھا کہ تم بنتے تو جاوید مستان ہو لیکن کام سبھی ولن والے کر رہے ہو، اس پہ میں نے ہنس کر انہیں ’’کمینہ جٹ‘‘، ’’قول قرار جھوٹے‘‘، ’’ساڈا گھر، تہاڈا گھر‘‘، ’’دِل اتھرے جٹ دا‘‘ جیسی فلموں کی مثال دی تھی کہ جن میں جاوید مستان غنڈوں کے گینگ میں شامل ہوتے لیکن بعد میں جب انہیں پیار ہوتا ہے تو سیدھی راہ پر آ جاتے ہیں، دعا کرو مجھے بھی پیار ہو جائے پھر دیکھنا کیسا زہیرو بنوں گا۔ اس پر ایک ساتھی نے قہقہہ لگایا تھا، ہیرو بننے کی ساری تیاری ہو چکی ہے، بس اب پیار ہونے کا انتظار ہے، اس بات پہ میں بھی اپنی مونچھوں کو بل دے کر رہ گیا تھا۔ پیار خاک ہونا تھا مجھے، جن کھیتوں میں یہ فصل ہوتی ہے ان کی مٹی ہی اور ہوتی ہے۔ زندگی اسی طرح آگے بڑھتی رہی۔ فلمیں جاوید مستان کی پسند تھیں۔ زندگی انہی کی پیروی میں گزارنے کا شوق تھا جب کہ کام ان غنڈوں والے شروع کر دیے تھے جن کو پھینٹی لگتے دیکھ کر ہم خوش ہوتے تھے، لیکن کسی حد تک یہ قصور ’’کمینہ جٹ‘‘ اور ’’قول قرار جھوٹے‘‘ جیسی فلموں کا بھی تھا جنہوں نے ہمارے لیے بدمعاشوں کی زندگی کی مثالی تصویر بنا کے دکھائی تھی۔

جاوید مستان بنتے بنتے اصل میں غنڈے بن رہے تھے لیکن شاید دل میں یہ بھی خیال تھا کہ ہم سب اسی طرح حالات کے جبر کا شکار ہو کے غلط راہ پر چل پڑے ہیں جیسے اُن فلموں میں جاوید مستان صاحب ہو گئے تھے اور ذرا سی ٹھوکر لگتے ہی، یا حالات سازگار ہوتے ہی ہم واپس اچھائی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ یوں ہی سوچے سمجھے بغیر چلتے گئے اور وقت کے بھاگنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ زندگی نے کس لمحے ایک بڑا موڑ لیا اور شاہراہ پر چلنے لگی۔ اب میرے ہاتھ میں پسٹل تھا اور تین چار کوپوں والے میرے ساتھ ہوتے تھے۔ لوگوں کو دھمکا کر، رعب ڈال کر اپنے مالکوں کے کام نکلوانا، ان کی پشت پناہی پر ڈکیتی کر لینا، کسی ناپسندیدہ آدمی کو اٹھوا لینا، کسی کی ٹانگیں، پسلیاں توڑ دینا، کسی کو نامعلوم افراد کی فائرنگ سے جاں بحق کرانا ہمارے روزمرہ کے کام ٹھہرے تھے۔ اب ہم دن رات خطروں سے کھیلتے تھے اور جن کاموں کا سن کر عام آدمی کی شلوار ٹپکنے لگے، وہ ہم ہنس کے کر لیتے تھے۔ زندگی کی ڈرائیونگ میں اتنی مہارت تھی کہ اترائی، چڑھائی یا خطرناک موڑ ہم خاطر میں لاتے ہی نہ تھے۔ اگر کبھی کوئی کام بگڑ بھی جاتا تو اسے سدھارنے کے لیے مالکوں کے ٹیلی فون کافی تھے۔ پھنے خان تھانیداروں نے بھی فون واپس رکھنے سے پہلے سر جھکا دیا ہوتا تھا۔

جس رات کا یہ وقوعہ ہے، اس رات ہماری پلاننگ یہی تھی کہ مستانوالی جانے والی سڑک پر اپنا غیر سرکاری ناکہ لگائیں گے اور ہر آنے جانے والے سے "ٹیکس" اکٹھا کریں گے۔ پولیس کے ساتھ حصہ مقرر تھا، ہمیں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ شام کا وقت تھا، ابھی ایک ویگن والے کو لوٹ کر بھگایا تھا کہ یہ گاڑی سامنے آ گئی۔ کار تھی، اچھی چمکتی ہوئی، آگے وردی والا ڈرائیور اور پیچھے یہ تھا بیٹھا ہوا۔ ہم سمجھ گئے کہ ادھر سے کچھ قیمتی ہی ملے گا۔ گھڑی، موبائل، انگوٹھی اور شاید نقدی بھی۔ گاڑی جب ہمارے ناکے پر رکی تو ڈرائیور ٹوپے والی دو کوپیں دیکھ کر سہم گیا تھا۔ البتہ یہ پچھلی سیٹ سے اتر آیا۔ چٹا سفید سر، چٹی مونچھیں، بدن مرمرا سا۔ مگر بڑھاپے کے باوجود اس میں تن فن کافی تھی۔ اترتے ہی اکڑ کر بولا۔ کیا چاہتے ہو تم۔ میں لیڈر تھا، ہنس کر آگے ہوا اور اپنا مدعا بتایا کہ ہر قیمتی چیز اپنی ہتھیلی پر چاہتا ہوں۔ اس پر وہ مجھے گھورتا رہا، پھر بولا جانتے ہو میں کون ہوں؟ اس پر میرے ایک ساتھی نے قہقہہ لگا کر کہا، کیوں ......تم کیا جاوید مستان کے مامے ہو؟ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا، میں جاوید مستان ہوں۔ ہماری تو ہنسی ہی نہ رکے۔ قسم سے ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔ یہ تھکا ہوا بڈھا جاوید مستان ہو سکتا ہے، یہ تو ہمارے فرشتے بھی نہ سوچ سکتے تھے۔ ایک ساتھی نے بتایا، اس سڑک پر جو آخری گاؤں ہے وہ مستانوالی ہے، وہاں سبھی مستان رہتے ہیں، اس کا نام بھی جاوید مستان ہو سکتا ہے۔ نام کی طرح نام ہوتے ہیں۔ یہ بڈھا غصے سے بولا، میرا نام جاوید مستان نہیں ہے، میں واقعی جاوید مستان ہوں فلموں کا ہیرو، پچھلے پینتیس سال سے سینما پر راج ہے میرا۔ اس کی جاوید مستان صاحب کی طرح چھاتی پھلانے کی کوشش پر ہماری ہنسی نکل گئی اور میرے ایک ساتھی نے ایک ہوائی برسٹ مار کر لطف لیا۔ شاید بڈھے کو بھی جاوید مستان کی نقل کا شوق تھا، لیکن جس طرح کی نقل وہ کر رہا تھا اس سے کہیں زیادہ بہتر تو میں کر

سکتا تھا مل کہ ہم سب اس سے اچھی نقل کر سکتے تھے۔ ایویں ڈرامے باز۔ میں کبھی بھی اس کی بات کا یقین نہیں کر سکتا تھا البتہ اس کے ڈرائیور نے بھی جب گھگیا کر بتایا کہ یہ جاوید مستان صاحب ہیں تو مجھے ان کی ڈراما بازی پہ بہت غصہ آیا اور سوچا کہ ابھی ان کا جھوٹ رفع کرتا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ تم اتنے بڈھے اور کمزور ہو اور جاوید مستان اتنا تنومند، تو پھر ہم کیسے مانیں؟ ہم نے ماننا کب تھا، بس ویسے اس کا جواب سن کر دل پشاوری کرنی تھی، کہنے لگا سکرین پہ جانے سے پہلے میک اپ ہوتا ہے، اس لیے وہاں کچھ اور نظر آتا ہوں۔ میک اَپ۔ ہاہاہا۔ ہم سب ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔ میک اَپ ......!!! اتنا میک اپ ہو سکتا ہے تو پھر میں بھی جاوید مستان بن جاتا۔ میں نے اس بڈھے سے کہا کہ تم اگر جاوید مستان ہو تو ثابت کر دو۔ ہم عزت کے ساتھ گھر چھوڑ کے آئیں گے اور اگر نہ ثابت ہوئے تو پھر ...... یہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا، میں نے پوچھا، جاوید مستان صاحب نے کتنی فلموں میں کوپ استعمال کی ہے اور کتنی میں گنڈاسہ؟ یہ سوچ میں پڑ گیا۔ کافی دیر بعد بولا۔ میں نے حساب نہیں رکھا۔ سہا گا۔ میرا ایک ساتھی اس کے سامنے آیا اور بولا مجھے ''دِل اتھرے جٹ دا'' کا وہ والا ڈائیلاگ سنا دو جب ہیروئن کا ''میریا ڈھول کھنا'' والا گانا ختم ہونے پہ جاوید مستان صاحب نے بولا تھا، بڈھا کچھ یاد کرنے کے انداز میں بولا۔ مکھن تو مینوں کہہ رہی ایں جد کہ تیرا پورا وجود ....وہ گڑبڑا گیا۔ باقی میرے ساتھی نے بولا، مکھن دا بنیا ہویا اے، مکھن دے پیڑے دی طراں لشکدا تیرا منہ اے۔ تے مکھن دے وچ گندھے اس نرم ملائم بدن نوں ویکھ کے دل وچ ست رنگے مست جذبے اٹھ کے آندے نیں۔ اب بتاؤ ہم تمھیں کس طرح جاوید مستان تسلیم کریں۔ وہ اسی طرح اکڑ کر بولا۔ ۲۲ سال پرانی فلم ہے۔ آدمی بھول سکتا ہے۔ ایک ڈائیلاگ بھول جانے سے جاوید مستان کی شناخت ختم کیسے ہو گئی۔ او ماما، میرا ایک ساتھی تپ کر بولا، بائیس سال ہو گئے تو کیا، جب ہمیں تیسری جگہ وہ ڈائیلاگ یاد ہے تو پھر تمھیں کیوں نہیں یاد۔ چل سیدھا ہو۔ اس کے ڈرائیور کو اتار کر مرغا بنا دیا گیا۔ اسے حکم دیا گیا مگر یہ نہ بنا۔ جب زبردستی اس کی گھڑی اتارنے کی کوشش کی گئی تو وہ میرے ساتھی کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا، چڑھ گیا غضب، اسے پکڑ کر سڑک پر لٹا دیا گیا اور ہاتھ پاؤں قابو کروا کے میں اسے ٹھڈے لگا رہا تھا جب اس نے پھر کہا کہ وہ جاوید مستان ہے، مجھے پہلے ہی اس پہ غصہ تھا، میں نے تپ کر کہا، چل تیرا ایک امتحان اور لیتے ہیں، فلم ''راجا رانی'' میں جاوید مستان صاحب چھ گولیاں کھا کر بھی اپنے پاؤں پہ کھڑے رہتے ہیں، تم میری ایک گولی کھا کر بچ گئے تو مانوں گا۔ میں نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھا، دل کے عین اوپر پسٹل دبایا اور اس کے غب غب کرنے اور سر پٹکنے کے باوجود ٹیگر دبا دیا۔ چند ہی لمحوں میں بے جان پڑا تھا۔ بڑا آیا تھا جاوید مستان۔ خون کر کے بد مزگی سی ہوئی اور ہم اس بدمزگی کو مٹانے کے لیے کار ہی لے اڑے۔ وہاں سے نکلتے ہی ہم بھول چکے تھے کہ ہم نے کسی کو مارا بھی ہے۔ ڈڈو گاڑی کے نیچے آ کے مرتے رہتے ہیں، اب کون ان کا حساب رکھتا پھرے۔ مالکوں کو بتا دیں گے، آگے سنبھال لیں گے۔

اگلی صبح جب پورے ملک میں شور مچ گیا کہ جاوید مستان صاحب کو کچھ ڈاکوؤں نے قتل کر دیا تو ہمیں تشویش ہوئی۔ خبر کی تفصیل سنی تو معلوم ہوا کہ یہ واقعہ گزشتہ دن شام کے وقت مستانوالی روڈ پر پیش آیا ہے۔ مقتول کے ساتھ ان کا ڈرائیور بھی تھا جسے ڈاکو زدوکوب کر کے چھوڑ گئے تھے۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ واقعی جاوید مستان تھے۔ خیر یقین پھر بھی نہ آتا تھا۔ بھلا کہاں ہمارے جاوید مستان صاحب، جن کا جثہ سکرین پر نہ سماتا تھا اور کہاں وہ بڈھا۔ جو بھی ہوا تھا اس میں ہمارا قصور نہ تھا۔ سب قصور انہی کا تھا، انھوں نے ہی ہمیں دھوکا دیا تھا۔ البتہ یہ بات میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ دھوکہ انھوں نے اس رات ہمیں دیا تھا یا پچھلے چالیس سال سے وہ سکرین پر پوری قوم کو دیتے رہے تھے۔

اخبارات، ٹی وی کے پروگرام دس پندرہ دِن چیختے رہے۔ فلم انڈسٹری کا ناقابلِ تلافی نقصان۔ مایہ ناز سپوت سپردِ خاک۔ ایک ایسا خلا جو پُر نہیں کیا جا سکتا۔ سات فلمیں ادھوری رہ گئیں اور درجنوں کا کام کبھی شروع ہو ہی نہ سکے گا۔ تینوں ہیروئنیں جوان کے ساتھ جلوہ افروز ہوتی تھیں، اب فاقے ان کے دروازے پہ کھڑے ہیں سینکڑوں ایکسٹرا، جو ہر فلم میں مرنے آ جاتے تھے، اشک بار۔ ڈائریکٹر بے کار، پروڈیوسر بے حال، سٹوڈیو ویران، وہ کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے۔ مداحین، پرستار سوگوار۔ قاتلوں کو قرار واقعی سزا کا وعدہ۔ یہ سبھی اپنی جگہ لیکن میں سوچتا ہوں کہ جاوید مستان میرے ہاتھوں مر گئے، یہ کچھ غلط تو نہ ہوا۔ اک دھوکہ ہی تو تھا، جو نہ رہا۔ اگر جاوید مستان صاحب حقیقت میں جاوید مستان نہیں تھے تو پھر انہیں جاوید مستان بننے کا حق بھی نہ تھا اور نہ ہی انہیں جاوید مستان بن کے رہنا روا تھا۔ کوئی افسوس نہیں، کوئی دکھ نہیں۔

☆☆☆☆

سدرہ حفیظ

باؤلی

دروازہ کب سے بج رہا ہے کیا بہرے ہو گئے ہیں سب؟ وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل کر باہر کے دروازے کی طرف بڑھی۔ افق کی روشنی تاریکی میں ڈھل رہی تھی۔ وہ صحن میں رکھی مسہری سے ٹھوکر کھا کر گر گئی۔ ’’ارے بتیاں کیوں بجھائے بیٹھے ہو۔ شام ہو رہی ہے۔ زوال کا وقت ہے یہ۔ توبہ! کوئی اس وقت بھی اندھیرا کیے رکھتا ہے‘‘۔ نیم تاریکی میں اس کے سلاٹ زدہ چہرے پر وحشت رقصاں تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ باہر مالک مکان تھا۔ زردی مائل ویران آنکھوں کا خالی پن کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ ’’خالہ پچھلے دو مہینے سے کرایہ نہیں آیا۔ اگر اس مہینے بھی نہ پہنچا تو مکان خالی کرنا پڑے گا‘‘۔ اس نے بڑھیا کے وحشت زدہ چہرے سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

یہ لو بھئی! کرایہ کیوں نہیں آئے گا۔ دے دیں گے بھیا! کئی برسوں سے اسی مکان میں رہ رہے ہیں۔ عثمان کے بہشتی ابا نے کبھی دیر سویر نہیں کی تھی اب جب وہ ہی نہیں رہے تو کچھ تاخیر ہو گئی ہے۔ آ جائے گا کرایہ۔ دیے بنا تو نہیں جانے والے...... وہ یہ کہہ کر پلٹ آئی۔ ’’یہ کیا ابھی تک اندھیرا ہے...... کسی کام کے نہیں یہ سب‘‘ اس نے سوئچ بورڈ کے تمام بٹن دبا دیے۔ کائنات کی ہر چیز سے العبادی 3D ہے۔ لیکن اس تھری ڈائی نیشنل دنیا کے شعوری حقائق سے بالاتر ایک بعدِ چہارم بھی ہے۔ جہاں خواب بستے ہیں۔ جہاں خیالات کے پھولوں پر خواہشات کی زندہ اور مردہ تتلیاں منڈلاتی ہیں اور جہاں اس کے اپنے رہتے تھے۔

’’کیسا جی متلانے لگا ہے۔ یہ بھی عجیب وقت ہے یا تو روشنی ہو یا پھر اندھیرا۔ یہ ملگجی اندھیرا تو جان نکالے دیتا ہے۔ اف توبہ توبہ...... یہ محمود بھی کیسی بات کر گیا کہ مکان خالی کرنا پڑے گا۔ ہمارے سامنے پل کر جوان ہوا ہے اور مکان چھوڑنے کی بات کا کہتا ہے۔ اس کے ابا کتنے لحاظ والے انسان تھے۔ اللہ درجات بلند کرے۔ سچ ہے دنیا اچھے انسانوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔ یہ آج کی نسل تو منہ کو آتی ہے۔ عثمان آتا ہے تو کہتی ہوں آج ہی کرایہ دے کر آئے۔ چار پیسوں کے لیے کسی کا احسان کیوں لیں‘‘ اس کی آنکھوں کی پتلیاں کسی غیر مرئی نقطے پر ساکت ہو گئیں اور اس کا سر افسوس سے بہت دیر تک ہلتا رہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولی ’’ابھی عثمان آ جائے گا اور آتے ہی بھوک بھوک کا شور مچا دے گا۔ کھانے کا ہی کچھ کر لوں۔ وہ تو بچپن سے ہی بھوک کا کچا ہے، کیسے دونوں بہنوں کو پیٹ ڈالتا تھا۔ کھانا نہیں بنا، کھانا نہیں بنا۔ دونوں کو اللہ اپنے

گھروں میں خوش رکھے۔ کتنا عرصہ ہو گیا ملنے ہی نہیں آئیں۔ پچھلی سے پچھلی بقرعید پر آئی تھیں یا شاید اس سے بھی پچھلی''۔ ایک آنسو نکل کر دائیں گال کی جھریوں میں اٹک گیا۔ لو میں بھی کیا قصہ لے کر بیٹھ گئی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر ہونٹوں کی جنبش نے ساتھ نہیں دیا۔ ''ماں تو ماں ہوتی ہے''۔ ''نہیں آئیں تو نہیں آ سکتی ہوں گی۔ بھرے پرے سسرال میں سو مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ویسے بھی بیٹیاں اپنے گھروں میں اچھی لگتی ہیں۔ پر ایسی بھی کیا مجبوریاں کہ فون بھی نہ کر سکیں'' بے رنگ سیال سے اس کا چہرہ بھیگنے لگا۔ ''میں بھی سٹھیا گئی ہوں۔ سچ کہتے ہیں بڑھاپا چیز ہی ایسی ہے۔ ابھی نازیہ کو فون کرتی ہوں، دوڑی چلی آئے گی۔ نہیں پہلے شازیہ کو کرتی ہوں۔ اسے ہمیشہ گلہ رہتا ہے کہ میں اس سے کم پیار کرتی ہوں۔ بھلا ماں بھی کبھی اپنے کسی بچے سے کم پیار کر سکتی ہے۔ پگلی نہ ہو تو'' وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ٹیلی فون سٹینڈ کی طرف آئی۔ دراز سے ڈائری نکالی اور ایک نمبر ملانے لگی۔ پر یہ کیا ریسور خاموش کیوں ہے۔ تار نکل گئی ہوگی۔ اس نے دائیں جانب دیکھا۔ تار اپنی جگہ تھی، کچھ دن پہلے تک تو ٹھیک تھا وہ ریسور رکھ کر وہیں سوچ میں گم کھڑی تھی۔ اوہ ہاں یاد آیا کئی دنوں سے بل نہیں بھرا۔ یہ عثمان بھی نہ۔ کتنا لاپرواہ ہے۔ بل نہیں بھریں گے تو بھلا ٹیلی فون چلے گا۔ ابھی آتا ہے تو کان کھینچتی ہوں نواب صاحب! ایسے جیسے محکمہ اس کے باوا کا ہے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ کچن کی طرف چل دی۔ تپائی پر کھانے کے برتن جوں کے توں دھرے تھے۔ اس نے رومال ہٹا کر دیکھا ..... تو کیا کسی نے بھی دوپہر کا کھانا نہیں کھایا؟ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ ابھی میرے حصے کا دانہ پانی باقی ہے، کاش میں بسیار خور ہوتی تو اپنے حصے کا رزق بہت پہلے ختم کر چکی ہوتی اس نے دو لقموں کے بعد پلیٹ پرے کھسکا دی۔ کس قدر بدمزہ کھانا ہے۔ بھلا بھگار کے بنا بھی کبھی دال بنتی ہے؟ ..... آج کل کی لڑکیاں ...... مانوں کام کرتے تو جان جاتی ...... اپنی بہو کا سوچتے ہی اس کا منہ کڑوا ہو گیا۔ عطیہ کے ہاتھوں میں تو ذائقہ ندارد۔ بدنیتی سے ہی بھلا اچھا کھانا بن پائے گا؟ ہونہہ ..... اس نے ہنکارا بھرا اور دواؤں والی ٹوکری کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جس میں بہت سے خالی پتے پڑے تھے، روز سوچتی ہوں عثمان سے کہوں یہ دوائیں ختم ہو گئیں اور روزانہ ہی بھول جاتی ہوں۔ اب کی بار ایک حافظے کی دوا بھی منگا لوں گی۔

اٹھتے اٹھتے اس کی نگاہ میز کے دوسرے کونے پر پڑے تصویروں کے البم پر رک گئی۔ بڑھاپے میں ہر چیز کی قلت ہو سکتی ہے، سوائے وقت کے۔ وہ البم کھول کر بیٹھ گئی تھی اور ایک ایک تصویر کو ایسے غور غور سے دیکھ رہی تھی جیسے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی ہوں۔ یہ بھی سچ ہی تھا کہ ہر بار ہی کوئی نہ کوئی نئی چیز ضرور اس کی نگاہ میں آ جاتی۔ جیسے آج نازیہ اور شازیہ کے ایک جیسے فراکوں میں یہ فرق اسے پہلے کبھی نظر نہ آیا۔ شازیہ کے فراک کی بائیں آستین پر ایک سیاہ دھاری نظر آ رہی تھی جو نازیہ کی کسی آستین پر نہیں تھی۔ اس نے تصویر البم سے نکال لی اور قریب سے دوبارہ دیکھا شاید مہر کا نشان تھا، اسے خواہ مخواہ افسوس ہونے لگا۔ مجھے یہ سلائی کرتے وقت کیوں نہ دکھائی دیا۔ کس قدر بھدا معلوم ہو رہا ہے۔ بچوں کو مائیں بھی نہ جو مرضی پہنا دیں۔ جیسے یہ عثمان کی نارنجی

بشرٹ۔ اس نے اگلی تصویر دیکھتے ہوئے خود کلامی کی۔ لڑکوں کو ایسے گہرے رنگ کہاں اچھے لگتے ہیں۔ میں نے خریدتے وقت کیوں نہ سوچا؟

عثمان میرا بیٹا دیکھتے ہی دیکھتے کیسا گھبرو جوان ہو گیا ہے نا، دماغ کے کسی کونے میں نہیں نہیں کی پکار تھی، خوابوں کی دنیا سے ماتم کا شور اٹھ رہا تھا۔ آرزوؤں کے بے گور کفن لاشے اپنی موت پر خود ہی بین کرنے لگے تھے۔ اپنے اندر کے شور سے گھبرا کر اس نے جلدی جلدی البم کے کئی پنے پلٹ ڈالے۔ ایک تصویر کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ماندی چمک ابھری اور غائب ہو گئی۔ عثمان کے ابا کیسے بیگانے سے لگ رہے ہیں اس تصویر میں...... بارہا کہا خاکی کی بجائے سرمئی رنگ جچتا ہے ان پر، پر کہاں جی، میری تو ساری عمر ایک نہ مانی۔ شاید اس خطے کا پانی ہی ایسا ہے۔ مرد کو خدا بنائے رکھتا ہے۔ وہ بہت دیر تصویر پر انگلی سے لکیریں کھینچتی رہی۔ وہ نہ جانے کتنی دیر البم ہی الٹتی پلٹتی رہتی اگر دروازے پر دوبارہ دستک نہ ہوتی۔

ارے کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہو؟ کیا میں ہی اپنی بوڑھی ہڈیاں گھسیٹتی رہوں۔

ہاں بھئی، کسی اور کام کے جو نہیں رہے، گورے صحیح کرتے ہیں اولڈ ہومز میں بوڑھوں سے کوئی بیگار تو نہیں لیتا۔

وہ غصے سے اونچا اونچا بولنے لگی تھی پر وہاں کسی پروا تھی۔ تھوڑی دیر بعد دستک معدوم ہو گئی۔ شاید کوئی سائل تھا وہ اٹھ تو چکی تھی، سو سوچا رات کے کھانے کی تیاری ہی دیکھ آئے۔ باورچی خانے کی تاریکی سے اسے پھر کوفت ہونے لگی۔ کیا اندھیر نگری بنا رکھی ہے۔ بہو کے آنے سے لوگوں کو سکون ملتا ہے اور یہ عطیہ کسی کام کی نہیں، بہت سمجھایا عثمان کے ابا کو کہ میری بھتیجی فاطمہ صورت، سیرت دونوں میں بدرجہا بہتر ہے۔ اسے گھر داری کی بھی خوب سمجھ بوجھ ہے، پر نہیں، بہن کی محبت، لے آئے اپنی بھانجی کو، خود تو چلے گئے اب بھگت میں رہی ہوں۔ اب یہی دیکھ لو رات ہو رہی ہے کھانے کا ہی کچھ ہوش نہیں، اب کیا عثمان کو بھی دوپہر کا باسی کھانا دے گی؟ میں خود ہی اپنے بچے کے لیے دال چاول بنا لیتی ہوں شوق سے کھاتا ہے۔ وہ ڈبوں کے ڈھکن اٹھا کر دیکھنے لگی۔ دال ختم تھی۔ چاولوں کا کنستر بھی خالی تھا اور اس میں چھوٹی سی مخلوق کی بہتات تھی۔ ''لو بھئی ابھی کل تک تو سیر بھر چاول تھے، بہو رانی نے چپکے سے بنا لیے ہوں گے۔ کم ظرف مجھے کہاں پوچھتی ہے وہ تو چاہتی ہے کل کی مری میں آج مر جاؤں''۔

عطیہ...... او عطیہ! وہ بہو کو آوازیں دیتی ہوئی صحن میں آ گئی۔

''خالہ کس کو آوازیں دے رہی ہو؟'' ساتھ والی دیوار سے پڑوسن کا سر ابھرا۔ بڑھیا نے مڑ کر دیکھا۔ دفعتاً شعور کی کھڑکی کھلی اور خواہشات کی زندہ تتلیاں تڑپنے لگیں۔

''اے لڑکی! باؤلی سمجھا ہے مجھے جو خالی گھر میں آوازیں لگاؤں گی۔ اپنے منے کو بھیج کے کھانے کے برتن اٹھوا لیجو''۔

پڑوسن کا سر غائب ہو گیا تھا۔

محمد عثمان عالم

حاملہ آوازیں

وہ کنواری تھی مگر حاملہ۔

ایسی حاملہ جسے آج تک کسی نامحرم نے آنکھ اُٹھا کر اور محرم نے اوڑھنی کے بغیر نہ دیکھا تھا پھر بھی وہ کنواری تھی اور حاملہ۔

اس بات کی خبر اُس بوڑھی ماں کو بھی نہ ہو سکی جس کے ساتھ رات کچھ فٹ کی دوری پر وہ بستر ڈال کر سویا کرتی۔ اُس کی زندگی کے ماہ و سال پہاڑی پتھروں سے نکلتی انگور کی بیل کی مانند تھے جس پر کچے اور سبز دانے اپنی فطرت کے مطابق جوان ہوتے اور پھر پکتے، پکتے اور پکتے جاتے۔

جب اُنھیں کوئی اُتارنے، توڑنے یا کھانے والا میسر نہ آتا تو اتنا پک جاتے کہ اُن میں سے رس ٹپکنے لگتا اور اُس کی جوانی بھی غربت کی بیل پر اتنی پک چکی تھی کہ اب اُس میں سے رس نکل نکل کر ٹپکنا شروع ہو چکا تھا۔

وہ درمیانے نین نقش والی لڑکی تھی۔ تعلیمی مدارج احسن طریقے سے طے کرنے کے بعد ایک سالہ سلائی کڑھائی کا کورس کر ڈالا۔

زندگی کے پُل پر وہ ان شوخ اور دیدہ زیب لباس کے ساتھ اکیلے ہی آدھا سفر طے کر چکی تھی اور پُل کے نیچے پھیلا معاشی تنگی اور لڑکوں کے قحط کالئی خطرے کے نشان سے اُوپر آ چکا تھا۔

گھر بیٹھے بیٹھے اُس کے اندر کی سیم اُس کے جسم اور کپڑوں پر اُترنے لگی اور وہ جسم اور کپڑوں کے خیال سے لاپرواہ ہوتی گئی۔

وہ وقت دُور نہ تھا کہ اُس کے بدن کی دیوار کی سفیدی تھکن اور سیم کے ٹکڑوں کی شکل میں اُتر اُتر کر گرنے لگتی پھر اُس نے گھر کے صحن میں محلے کے بچوں کو ٹیوشن دینا شروع کر دی۔

دوپہر ہوتے ہی بچے اپنے بھاری بھرکم بستوں کے ساتھ آنا شروع ہو جاتے اور شام ڈھلے گھروں کو واپس پلٹ جاتے۔

اُس کی دوستوں میں سے ایک وہ تھی۔ جو بڑی کپتی تھی۔ بولتی تو بولتی جاتی۔ ہنستی تو ہنستی جاتی۔ غصہ ہوتی تو پاس پڑی چیزیں اور کتابیں اُٹھا اُٹھا کر پھینکتی اور مارتی۔ اُسی کا اب اُس کے گھر آنا جانا باقی تھا۔

وہ بھی زندگی کے پُل پر آدھے سے کچھ اُوپر کا سفر اکیلے طے کر چکی تھی لیکن وہ چاہتی تھی باقی کا سفر کسی کی

ہمراہی میں طے ہو۔ اور یہ اُس کا حق بھی تھا۔ مگر لئی جو معاشی تنگی اور لڑکوں کے قحط کا شکار تھا۔ اُس کے لیے جبر بن چکا تھا۔

اُسی نے ثمینہ کو اُن آوازوں کے متعلق بتایا جن سے وہ پچھلے کچھ عرصے سے مخاطب تھی۔

وہ گھنٹوں اُن سے باتیں کرتیں، خود بہکتی، دل کو بہلاتی، اور اندر کے آتش کدے کو ٹھنڈا کرتی۔

ایک شام آسمان سرمئی بادلوں سے اٹا ہوا تھا ہلکی ہلکی میٹھی ہوا چہرے کے پوروں میں داخل ہو کر لطافت پیدا کر رہی تھی۔ چھت پر پڑے گلاب، موتیا، اور نیازبو مہکنے اور خوشبو دینے لگے بارش کی پھوار خوشبو دار پودوں کے پتوں پر جمی گرد اور آلودگی صاف کرنے لگی۔ صاف ستھرے پتے، ٹہنیاں اور پھول ایک نئے وجود کی طرح ظاہر ہونے لگے۔

وہ بھی کسی ایسی ہی بارش کی منتظر تھی۔ جو اُس کے جسم کی ضرورتوں اور خواہشوں کی گرد کو جبر کی ندی میں بہنے دے۔

پھر اُسے اپنی دوست اور اُس سے متعلق آوازیں اور اُن سے منسوب باتیں یاد آنے لگیں۔ کتنی دلفریب، میٹھی اور شیریں باتیں تھیں۔ جب وہ اُسے گھر آ کے سناتی تو اس کی رگوں میں ٹھہرا ہوا جس کا موسم کسی خوشگوار احساس کے ساتھ بہنا شروع ہو جاتا۔

وہ پچھلے چند لمحوں سے چھت کی مغربی دیوار پر ٹھوڑی رکھے نیچے کھلے پلاٹ میں لڑکوں کو بارش میں بھیگتا اور کرکٹ کھیلتا دیکھ رہی تھی۔ اُنہی میں سے ایک وہ بھی تھا جو اُس کی آنکھ کی پتلی میں آ بیٹھا تھا اور باقی کے اُس کے پیچھے دھندلے اور غیر نمایاں ہوتے چلے گئے۔

وہ بلے باز تھا جس کی بارش سے بھیگی ہوئی شرٹ ورزشی جسم کے ساتھ چپٹی جا رہی تھی۔ اُس کے کاندھے، سینے اور بازوؤں کے کٹ بڑے واضح اور نمایاں تھے۔

اُس نے ایک اُونچا شاٹ کھیلا اور گیند اُس کی چھت پر آ پڑی۔ اُس نوجوان کی آنکھیں ہوا کو کاٹتی ہوئی گیند کے تعاقب میں اُس سے ٹکرائیں۔

اور یہ لمحہ۔۔۔ بس۔۔۔ یہ کچھ دنوں بعد کی بات ہے جب سورج اپنے جسم کی آگ زمین کے باسیوں پر برسا رہا تھا شام وہ چھت پر بالٹی پانی کی بھر لائی اور مگ کی مدد سے ایک ایک کر کے وہ چھت پر رکھے خشک پودوں کو پانی ڈالنے لگی۔ پانی ڈالتے وقت اُسے احساس گزرا کہ سدا بہار اور موتیا کے پودے کئی دنوں سے اُس کی طرح پیاسے اور خشک تھے۔ زخم حیات اور رات کی رانی کے گملوں کی مٹی اُس کے خیالات کی طرح سخت اور پتھریلی ہو چکی تھی اور گوار کندل کے سبز اور اُوپر کو اُٹھے پتے پیلے، نرم اور نیچے کو ڈھلک چکے تھے۔

مسمریزم کے زیر اثر وہ دیوار سے جھانکنے لگی۔ جہاں کچھ دن پہلے وہ بلے باز کسی منجھے ہوئے کھلاڑی کی طرح گیند اچھال رہا تھا۔

وہ خیالات کے گملے کی سخت مٹی کو جذبات اور احساسات کی گوڈی سے نرم کرنے لگی۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے اُسے اپنی دوست کی بات یاد آئی ۔ وہ کہتی تھی تم بھی اِن آوازوں کو مخاطب کر سکتی ہو۔ اپنی زندگی کی اندھیری شاہراہ پر چلتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے ہم کلام کے جگنوؤں کو روشن کر سکتی ہو۔

مگر۔۔۔ وہ کیسے اِن نامحرم آوازوں سے ہم آواز ہو سکتی تھی۔ اُس کے دماغ کے سینے پر غیرت نام کی اوڑھنی اُس کی ماں کی جانب سے لپٹی تھی۔

وہ اِن میں آوازوں کے چھید کیسے لگا سکتی تھی؟

پھر۔۔۔ اُس کی دوست نے اُس کی اوڑھنی میں انہیں آوازوں کے کئی چھید کبھی خاموشی اور کبھی الھڑ بازی میں لگا دیے۔

اور وہ نوجوان بلے باز کو ذہن میں رکھ کر اُن آوازوں سے ہم کلام ہونا شروع ہو گئی۔ ایسی سریلی اور مدھر باتیں جو کانوں کے پیالوں میں اُمرت گھول دیں۔ جن کے سحر میں راتیں بیت جائیں اور دن چڑھ جائے۔ شروع شروع کے حجابات آہستہ آہستہ بے حجابی میں بدلتے گئے۔

وہ برہنہ باتیں جو بغل میں لیٹی انجان ماں سے ہوتی ہوئی بیٹی کے کان میں جاتیں‘ کان سے دِل دِل سے دماغ‘ دماغ سے جسم اور جسم سے رحم میں جا کر ٹھہر جاتیں۔

اُس کا تمام بدن پسینے سے تر بتر ہو جاتا۔ سانس کسی بدکے ہوئے گھوڑے کی مانند بھاگتا، جسم سورج میں پڑے لوہے کی طرح تپتا۔ یہ عمل کئی لمحوں تک جاری رہتا۔ پھر آوازیں معدوم ہونا شروع ہو جاتیں۔ جسم ڈھیلا پڑنے لگتا۔ منہ اور خشک ہوتے ہونٹ پانی کی طلب کرتے اور دماغ پر غنودگی چھانے لگتی۔

ساتھ بستر پر خراٹے مارتی ماں، جس کی کنواری بیٹی ہر رات اُس کی موجودگی میں کئی آوازوں کو جسم میں اتار لیا کرتی اور وہ بے خبر جو بیٹی کو چار دیواری میں ڈال کر مطمئن تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ اُس کے رحم کا لٹی خطرے کے نشان سے اُوپر آتا گیا۔ وہ کنواری آنکھوں کے گرد حلقے ڈالے سارا سارا دن چارپائی پر پڑی رہتی۔

یہ اُس دن کی بات ہے کہ جب ایک دوپہر اُس کی ماں نے آ کر خبر دی کہ اُس کی اکلوتی دوست پچھلی رات گھر سے غائب ہے۔ یہ اُس کے لیے پریشان کن بات نہ تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ کچھ عرصے سے ایک آواز کے تعاقب میں تھی۔ اور وہ آواز اُس کے تعاقب میں، وہ اپنا حق لینا جانتی تھی۔ زمانے سے، لوگوں سے، گھر والوں سے۔۔۔ اُسی رات جب چاند ہلکی نیلی روشنی اُس کے چہرے پر پھینک رہا تھا اور وہ اپنے کمرے کی اکلوتی کھڑکی سے گورکھ دھندہ نما گلیوں میں آنکھ سے آوارہ گردی میں مشغول تھی تو اندھیرے میں اُنہی آوازوں کا ہجوم اُس کی جانب بڑھنے لگا اور اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ یہ ننگی آوازیں رات کے اس پہر شہر کے گلی کوچوں میں بے ترتیب تھور زدہ مکانوں میں مقیم لڑکیوں کے جسم کے ساتھ دیمک کی مانند چمٹی ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

ناول کا قاری اور زندگی کے گورکھ دھندے

ناول جیسا کہ سب کو ادراک ہے، سماجی زندگی کی عکاسی کا سب سے نازک، بڑا اور گمبھیر ذریعہ ادب ہے۔ اس سلسلے میں دوسری کوئی صنف ادب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ناول زبردست، تخلیق وتنقیدی ریاضت کا طالب ہوتا ہے اور جو بھی اس راہ سے سلامت گزر گیا اس نے ایک جانب اس صنف ادب کو ثروت مند بنایا اور دوسری جانب زندگی جیسی گنجلک، پیچیدہ اور اکثر نا قابل فہم مسائل سے آلودہ ابدی اور انسانی ذات سے کبھی جدا نہ ہونے والی صنف سے عہدہ برا ہو گیا۔ ہر انسان کی پیدائش زندگی کے حجم میں اضافے کی نوید ہے۔ ظاہر میں موت اس کی زندگی کے خاتمے کا اعلان ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ کئی حصوں میں بٹا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی زندگی کی ماہیت کچھ یوں ہے گویا ایک میں بہت Many in One ہو۔ اس کی زندگی میں کئی زندگیاں سانس لے رہی ہوتی ہیں اور اس کا سفر ختم نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ایک انسان پورے سماج کا نمائندہ ہوتا ہے۔ ناول ابتدا سے آج تک اسی انسان کا احاطہ کرتا چلا آیا ہے، ایک تلاش ہے، ایک کھوج ہے جو لامختتم ہے۔ اگر یہ تگ و دو اختتام کے مرحلے پر پہنچ جائے تب ناول اختتام پذیر ہو جائے گا۔ یوں ناول کی موت انسان کے لیے دھچکا ثابت ہوگی۔ لہٰذا ہر اچھا ناول یعنی تاثیر سے بھرپور ناول جسے آپ بھلا نہ پائیں، زندگی کے وجود کی ضمانت دیتا ہے۔ یہ ان گنت اور کبھی نہ ختم ہونے والی منزلوں تک آپ کی رہنمائی کرے گا۔ تو یہ گویا بذات خود زندگی ہے۔ اس زندگی کی تفہیم کیا آسان ہے؟ قطعی نہیں۔ زندگی کو سمجھ پانا ہر قاری کے لیے مشکل امر ہے اس لیے کہ اس سے متعلق مخصوص کو ڈی کوڈ کرنے میں مختلف نظریات، مختلف فلسفے، مختلف تعصبات، ذاتی مشاہدات و تجربات کے بطن سے ابھرنے والی آرا اس کے لیے رکاوٹیں کھڑی کرتی ہیں۔ ناول پر وزنی زندگی کا بوجھ ہوتا ہے، ناول نگار شروع سے آخر تک اسے اپنے فن، اسلوب، تکنیک، منظر نگاری، مقالموں، قصے اور وژن کے توسط سے اس بوجھ کو اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور اسے قاری کو سہارنا پڑتا ہے۔ ایک کرب سے گزرنا پڑتا ہے اور اگر وہ تاریخ سے جوجھ رہا ہے تب یہ بوجھ دو چند ہو جاتا ہے۔ 'آگ کا دریا' کے بعد یہ گونج سنائی دی کہ وقت TIME بذات خود ناول کا کردار ہے جو لمحہ بہ لمحہ زندگی کے سفر میں ایک زور آور سائے کی مانند سب کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوتا ہے۔ یہ ناول بتاتا ہے کہ اس وقت پر کسی کا زور نہیں چلتا، اس کے آگے کوئی منطق کارگر نہیں ہوتی۔ وہ تباہ کن ہے اور قائم بھی رکھتا ہے۔ انسان اپنے گھمنڈ، تکبر اور غرور میں اپنے آپ کو زمین پر خدا سمجھنے

کی (نعوذ باللہ) کوشش کرتا ہے لیکن وقت اسے ایک ہی ضرب سے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ علم البشریات اور تاریخ یہی ثابت کرتی چلی آئی ہے لیکن ہر دور میں انسان یہی غلطی دہراتا چلا آتا ہے۔ انسان فطرت سے ٹکراتا ہے اور پاش پاش ہو جاتا ہے اس لیے کہ فطرت NATURE بھی وقت کا دوسرا روپ ہے۔

ہرمن میلول کا ناول موبی ڈک MOBY DICK ہمیں اسی تاثر سے ہم کنار کرتا ہے۔ انسانی تگ و دو ایسے معاملات میں بس ایک حد تک ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اسے سوچنے، سمجھنے اور مختلف کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ہمارے لیے ایک دائرہ مقرر ہے اسی کے اندر کامیابی اور ناکامی پنہاں ہوتی ہے۔ اسے توڑ کر نکلنا ناممکن ہے۔ تاریخ میں جو کہ سینکڑوں سال پر محیط ہے انسان کو یہی سبق ملتا ہے۔ اپنے حصے کی کوششیں جس میں خلوص، لگن، ریاضت اور اولوالعزمی اور مقصد جھلکتا ہے اسے سمجھ پانا اور مثبت نتیجے پر پہنچ جانا ممکن ہے، ناممکن نہیں مگر اس راہ میں مصائب و مشکلات قنوطیت کی جانب بھی ہمیں لے جا سکتی ہے، ناول میں کرداروں کے مکالمے جہاں ایک طرف قصے میں روشنی پیدا کرتے ہیں وہیں ایک خاص فکر یا خیال کو قاری کے ذہن میں بیدار کر سکتے ہیں۔ ایک طرف مخصوص کردار یہ تاثر دے سکتا ہے کہ اس کے نصیب میں یہی لکھا تھا۔ لہٰذا نصیب یا مقصد سے پیچھا چھڑانا مشکل نظر آتا ہے۔ ناول کے قصے میں مقدر یا نصیب کا حوالہ فکر کے حوالے سے 'تقدیر' کا انمٹ معاملہ ہے۔ آنحضرت محمدؐ نے فرمایا ہے کہ ''جس نے تقدیر کو نہ مانا اس نے کفر کیا''۔ یہاں پر صبر و برداشت کرنے اور مایوسی سے گریز کرنے کا بھی مذہبی پہلو ہے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ سے طلب کرتے رہو۔ جس کا سب سے بڑا ذریعہ دعا ہے۔ معاف کیجیے گا یہ روحانی اور مابعد الطبعیاتی نسخہ جس سے گریز اس لیے ممکن نہیں کہ کائنات میں تنہا انسان یا اجتماع پر اس کے مقدر کے حوالے سے شیطانی قوتوں کی کارفرمائیوں اور چیرہ دستیوں کا بھی غلبہ ہوتا ہے۔ چھوٹے موٹے جھگڑوں اور بڑی جنگوں کے خوفناک نتائج کو دیکھ کر اور ان کے متعلق ڈھنگ سے پڑھ کر انسان لرز اٹھتا ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کا چنگیز خان، ہلاکو اور فرقہ باطنیہ سے متعلق دہشت انگیز کارروائیوں اور عورتوں، مردوں نیز بچوں کی کھوپڑیوں کے میناروں نظریات و عقائد کے حوالے سے خون کی ندیوں کے بہنے کا فکشن میں اظہار رہا ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ ہائے عظیم پر ناولوں، عبدالحلیم شررؔ کے ناول 'فردوس بریں' میں فرقہ باطنیہ کی خونریز کارروائیوں اور حضرت امام حسینؓ کے ساتھ ہونے والے مظالم پر جو کچھ بیان ہوا ہے وہ ہمارے قاری کو کائنات، اس کے مقصد، انسانی وجود اور اس کے مقدرات پر بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے، خاص طور پر سب سے زیادہ جبر کا شکار ہونے والا طبقہ عورت ہے۔ 'آگ کا دریا' میں گوتم بڑے افسوس اور صدمے کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہتا ہے ...... ''ناری کو طوائف نہیں ہونا چاہیے''۔ ایک بار اس نے ہری شنکر کو ڈانٹ دیا تھا جب اس نے ناری کو دل بہلانے کی چیز کہا تھا۔ قرۃالعین حیدر نے اس مخلوق کو ''گردشِ رنگ چمن'' میں معاشرے کی تلچھٹ SCUM OF THE SOCIETY سے تعبیر کیا تھا۔ قصے میں دو مغل شہزادیوں کے قلعے سے نکلنے کے بعد ان کے نصیب کے

بگڑنے کا دل دکھانے والا قصہ بیان کیا ہے جس میں ایک بہن کو دنیا کے اسی قدیم پیشے کا شکار ہو کر دو نسلوں کو نفسیاتی بیمار ہوتے ہوئے دکھایا۔ یہاں بھی اسی تقدیر کے کھیل کا حوالہ ہے جس میں عورتوں کو انسانیت کی تذلیل کے اس پیشے میں ملوث دکھایا ہے جس کا صحیح معنوں میں ذمہ دار ”ولین“ VILLAIN کی حیثیت سے ہمارے اور دیگر سماجوں کا مرد ہے جو عورت کو ناری یا عورت کو دل بہلانے والی شے تصور کرتا ہے۔ اور اس کو صحیح مقام دینے میں ریاست کے کارپردازوں کے ساتھ ہزاروں سال سے شریک ہے۔ یہاں قاری اس کے اور عام عورت کے گھروں میں ان گنت مصائب کا شکار ہونے والی عورت کے مقدرات کے بارے میں نہ صرف دل مسوس کر رہ جاتا ہے بلکہ اس کے مقدرات کے بارے میں کنفیوژن کا بھی شکار ہوتا ہے۔ مرزا ہادی رسوا کا ناول 'امراؤ جان ادا' اس سلسلے کا ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔ 'امراؤ جان ادا' کے اختتام پر رسوا نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف عالمانہ سطح کا حامل قاری ہی کر سکتا ہے۔ امراؤ کہتی ہے ”یوں تو بڑھاپا ہر ایک کے لیے بُرا ہے، خصوصاً رنڈیوں کے لیے ...... رنڈیوں کے لیے بڑھاپا دوزخ کا نمونہ ہے۔“ اس کے بعد کہتی ہے کہ وہ روزے نماز کی پابند ہے مگر رہتی رنڈیوں کی طرح ہے کیوں کہ خدا چاہے مارے، جلائے۔ لیکن پردے میں گھٹ گھٹ کے تو مجھ سے نہ بیٹھا جائے گا۔“

یوں تو پورا ناول ہی قاری کی توجہ کا مرکز ہے تاہم آخری حصہ بشمول امراؤ کی ماں سے ملاقات دل پر دھچکا لگاتا ہے۔ اسی طرح عورت کے مقدرات کو نمایاں کرنے کے لیے راجندر سنگھ بیدی نے ایک چادر میلی سی میں رانو کو مقدر کی دوہری مار ماری ہے۔ ایک یہ کہ شوہر کے مرنے کے بعد پنچوں نے اس پر چادر ڈالی اور اسے کم عمر دیور سے شادی پر مجبور ہونا پڑا۔ دوسرے یہ کہ شوہر کے قاتل ہی سے بیٹی بیاہنا پڑی۔ اس موقع پر رانو کے سسر کا روپ بیدی نے خود دھارا ہے۔ حضور سنگھ کہتا ہے ...... یہ سب کیا ہو گیا ہے کیوں ہو رہا ہے، اسے تو نہیں جانتی، نہ یہ لوگ جانتے ہیں۔ تو اسے سمجھنے کی کوشش مت کر۔ ایک چپ۔ یہاں تو دم مارنے کی جگہ نہیں ہے۔“

بیدی اس ضمن میں بہت سفاک ہیں ان کے کئی افسانوں میں بھی وقت TIME اور حالات سے مفاہمت زندگی میں بصیرت کا پہلو ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن بھی بیدی کی تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر قدم ناگوار حقیقتوں اور دشمن چہروں سے سابقہ پڑتا اور بے جوڑ رشتوں سے بھی، اور زندگی کا تقاضا ہے کہ حالات جن ناگوار حقیقتوں کی گود میں پھینک دیں، انہی سے سمجھوتہ کر لیا جائے۔ 'گردشِ رنگ چمن' ہی میں دو ٹھکرائی ہوئی اور حالات کی ماری ہوئی مغل بہنوں میں سے ایک مہر و خوب کہتی ہے ...... 'حالات پر ہمارا قابو کہاں ہے، رائے صاحب، جس نے ناول پڑھا ہے وہ مہرو کے اس جملے کی قصے کے حوالے سے اہمیت سے واقف ہے۔ مہرو ہی ایک جگہ کہتی ہے ...... ہر ایک پر ایک ہی دھن سوار ہے ...... عورت۔ عورت۔ عورت۔ اسی ناول میں ایک عظیم فراڈ اور چالباز کردار دلشاد عرف دلّن میاں جو تایا کی جائیداد ہضم کر جاتے ہیں، انٹرنیشنل کارڈ شارپر بھی ہیں ایک ماڈرن صوفی اور ولی اللہ والی کیفیت کے حامل پُراسرار کردار میاں یا بھیا کی خانقاہ کے زیرِ اثر بالکل بدل

جاتے ہیں۔ رکھیل لوزماہ سے نکاح کرتے ہیں تاکہ لڑکا ناجائز اولاد نہ کہلائے اور پھر اللہ والے بن جاتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ان سے عجیب جملہ کہلوایا ہے...... ’ہم کیسینو سے نکلے تو خانقاہ پہنچ گئے ...... کیا یہ پہلے سے طے تھا؟‘ یہ آخری الفاظ جبر وقدر کے ان معاملات کو سامنے لے آتے ہیں جس پر صوفیا کرام، مفکرین اور فلسفیوں نے کتابوں کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ یہ ناول کا اعجاز ہے کہ وہ واقعات اور حالات کے پردے میں ایسے سنگین ومتنازعہ سوالات کو جنم دیتا ہے جن پر تا دیر غور کرتے رہیے، اختلاف کیجیے، تائید کیجیے یا ذہنی انتشار میں مبتلا رہیے۔ اس بارے میں کوئی نظریاتی ریاست بھی آپ کے نقطہ نظر پر دباؤ ڈال سکتی ہے کہ وہ آپ کے اندر کے احساسات وجذبات نیز خیالات کو کھلم کھلا باہر نہیں آنے دینا چاہتی۔ ان کا آپ پر بظاہر کوئی دباؤ تو نہیں ہوتا مگر آپ خطرے میں ہوتے ہیں۔ میلان کنڈیراMILAN KUNDERA کہتا ہے کہ ایک نظریاتی ریاست میں ناول کی کوئی جگہ نہیں ہوتی! میرا خیال ہے کہ بہتوں کو اس مقولے کو تسلیم کرنے میں تامل ہوگا؟ پاکستان، ایران، چین اور روس میں ناول لکھے جاتے رہیں گے۔ روس میں الیگزنڈر سولژے نٹسن اور بورس پیسترناک کے بالترتیب دو ناولوں کینسر وارڈCANCER WARD اور ڈاکٹر ژواگو DR ZHIVASGO نے بڑا ہنگامہ برپا کیا تھا۔ ان کے بارے میں سنجیدہ قاری جانتا ہے کہ ایسی نظریاتی ریاست جہاں انسان پر جبر آزمائے جاتے ہوں وہاں بھی ناول نگار اپنی ذاتی تھیوری یا اختلافی تھیمTHEAME کا قصے میں اظہار کر ہی دیتا ہے۔ اکثر سزا بھی اس کا مقدر بنتی ہے لیکن وہ باز نہیں آتا۔ انیس ناگی نے اپنے اولین ناول میں سچ بولنے والے کردار یعنی پروفیسر کو پیش کیا ہے کہ جو ریاستی جبر کا مارا ہوا ہے۔ وہ اپنے دوست کو غائب ہو جانے سے قبل خط میں لکھتا ہے۔ ”میں حقیقت بتانا چاہتا ہوں مگر مجھے روک دیا گیا ہے۔ منطقی صورت حال میں اعلانِ حق کا وقت لد چکا ہے! یہ ڈان کہوٹےDON QUIXOTE کا اسلوب بے وقت کی راگنی ہے۔ میری نسل بیمار نسل ہے اس کے پاس سوچنے کے لیے کچھ نہیں ہے، یہ عہدِ زوال ہے۔ میں مفاہمت نہیں کروں گا، ترقی کے قدم رک گئے ہیں، نئی دانش کی ضرورت ہے۔ یہ عصر تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ میرا وجود ایک لایعنی صورت بنتا جا رہا ہے۔ میں واقعی گریکGREEK ٹریجک ہیرو ہوں۔ یہ کائناتی نظام میرے خاتمے پر تُلا ہوا ہے۔“ یہ پروفیسر کے مکالمے سے الگ الگ ٹکڑے ہیں۔ ایسی ہی صورت حال ان کے دوسرے ناول ”میں اور وہ“ اور ”کیمپ“ میں بھی ہے۔ واضح رہے کہ انیس ناگی وجودیت کے عنصر کا انطباق پاکستانی معاشرے کے ان افراد پر کرنے آئے ہیں جو سچ بولنا چاہتے ہیں، حقیقت سننا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی ان کے خیالات کو صبر اور سکون سے برداشت کریں اور ریاست خفیہ والوں کو ان کے پیچھے نہ لگائے۔ ”دیوار کے پیچھے“ کا ہیرو مفاہمت سے گریزاں ہے، ادھر راجندر سنگھ بیدی کی رانو کو مفاہمت کرتے ہی بن پڑتی ہے اور نہ ظاہر کہ زندگی دشوار تر کہ ناممکن ہو جائے۔ یہاں ایک شعر یاد آ رہا ہے کہ ”چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے ...... اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے“ لیجیے شاعر بھی ناول نگار

کے نظریہ کے قریب آ گیا ہے۔ ابھی ڈاکٹر محمد حسن مرحوم کے جملوں کا حوالہ دیا گیا ہے جو زندگی کی ناگوار حقیقتوں کے بارے میں ہے تو دنیا کی ماہیت کے بارے میں یہ والا شعر بھی یاد آیا کہ ”بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا ...... تیری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے“ شاید کافکا KAFKA بھی یہی سمجھتا تھا۔ اس کے دونوں ناولوں دا ٹرائل THE TRIAL اور THE CASTLE کے ہیرو جوزف کے JOSEPH-K دنیا کے بارے میں مایوسی اور قنوطیت کا شکار رہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ دنیا کو اپنے نقطہ نظر سے نہیں چلتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ بیرونی جبر اور اندر کا ذہنی خلفشار زندگی کے بارے میں کافکا اور کیمو CAMUS دونوں قنوطیت ہی کے پرچارک ہیں۔ اس کا ان دونوں کو حق ہے۔ زندگی کو جیسا کہ انھوں نے دیکھا، پرکھا اور بھگتا اسی سے اپنی فکر تراشی ...... قاری کو حق ہے کہ اس فکر کو نہ مانے، اتفاق سے ناول نگار سے اختلاف کے حوالے سے شرمندگی کے ساتھ اسٹیفن سپینڈر کی اس رائے کو پھر دہرانا پڑ رہا ہے کہ کبھی کبھار ناول نگار اپنے لیے لکھتا ہے، ضروری نہیں آپ اس کی بات تسلیم کریں۔ لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قاری لاکھ ناول نگار کے نقطہ نظر کو تسلیم نہ کرے وہ زندگی کے بارے میں ایک علیحدہ تصور سے ضرور آشنا ہوتا ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے اگلے تجربات اور مشاہدات اور مطالعہ کے زور پر وہ اسی منزل پر پہنچے جہاں ناول نگار پہنچا ہے۔ مثال کے طور پر جنگ کی ہولناکی پر لکھتے ہوئے ناول نگار جو کچھ بیان کرے قاری بھی جنگ کے بھنور میں گرفتار ہو کر اسی نتیجے پر پہنچے۔ سقوط ڈھاکہ پر چار ناولوں میں جو کچھ ہے اس سے اختلاف کے ساتھ ساتھ ہم ان کے مصنفین سلمیٰ اعوان (تنہا)، رضیہ فصیح احمد (صدیوں کی زنجیر)، طارق محمود (اللہ میگھ دے) اور الطاف فاطمہ (چلتا مسافر) کی تائید بھی کریں گے کہ انھوں نے بنگلہ دیش کی تخلیق سے وہاں کی تہلکہ خیز زندگی کا خود مشاہدہ کیا تھا۔ اس المیہ پر مزید ناولوں کا بھی انتظار کرنا سودمند ثابت ہوگا تاکہ کچھ قارئین کی تشنگی دور ہو جائے! اس موضوع پر تحریر کردہ ناول بہت کم ہیں۔ اگر مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی جیسا واقعہ مغرب میں ہوتا تو کئی ناول وجود میں آ جاتے۔ بہرصورت ان چار ناولوں سے بھی اس المیہ پر خاصی روشنی پڑتی ہے اور چند ایسے بنگالی کردار سامنے آتے ہیں جو علاقے کے رہنے والوں کی سوچ اور وہاں کے سماجی، سیاسی اور سماجی ماحول کا پتہ دیتے ہیں اور یہ احساس دلاتے ہیں کہ آیا ہم سے بھی کچھ غلطیاں ہوئی تھیں کہ نہیں؟

ایک مسئلہ جسے زیادہ زیر بحث نہیں لایا گیا ہے اس کا تعلق خواتین کے آدرش پسندانہ رویے سے ہے جسے کسی حد تک ان کے مقدرات سے بھی جوڑا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس راہ میں نقصان اٹھاتی ہیں۔ نثار عزیز بٹ کے ناول 'نگری نگری پھرا مسافر' کی ہیروئن افگار کی آدرش پسندی سے ہے۔ وہ ٹی بی کی شکار ہے اور کسی بھی چاہنے والے مرد سے مفاہمت نہیں کر سکتی اور لاحاصلی کا عذاب سمیٹتی ہے۔ اس ضمن میں اس کے دلائل انوکھے ہیں یوں اس کی نفسیاتی تحلیل قاری کے لیے یقیناً الجھن کا سبب ثابت ہوگی۔ منصور اس کی پہلی چاہت ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ وہ روحانی راستوں کا مسافر ہے اور مہاتما بننا چاہتا ہے۔ پھر عرفان، نعیم اور عابد

اس کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں ۔ عرفان کو وہ جذباتی انسان تصور کرتی ہے، نعیم کو وہ یونہی سا اور مغرور قرار دیتی ہے اور عابد کو بھی مسترد کرتی ہے اس لیے کہ وہ آسائشوں سے بھری زندگی پسند کرتا ہے جس میں موٹریں، ایرانی قالین اور مہنگی گھریلو چیزیں ہوں ۔ وہ خود کلامی کرتے ہوئے کہتی ہے:

''میں تو خواہ مخواہ اس کی قدریں گڈمڈ کردوں گی اور نتیجتاً خود بھی گڈمڈ ہو جاؤں گی ۔''

'آنگن' ایک ناقابل فراموش ناول ہے اس کی ہیروئن عالیہ آگ وخون کے سمندر کو عبور کر کے پاکستان آکر جب دیکھتی ہے کہ صفدر تو زبردست قسم کا آدرش پسند بن چکا ہے جب کہ وہ اس سے قبل اس کے خوب صورت خیالات کی بنا پر پسند کرتی تھی ۔ یوں اپنا آدرش چکنا چور ہونے کو اپنی زندگی کی معراج تصور کرتی ہے! اسے ہم کردار کی استقامت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں ۔ قاری اس قسم کی عدم مفاہمت پر متضاد رائے اختیار کر سکتا ہے کہ زندگی کے گورکھ دھندے اور مخمصے ذہنی وفکری افراتفری میں بھی مبتلا کرتے ہیں، اس کے برعکس مفاہمت کے نتیجے میں جس ابتلا سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے وہاں کبھی کبھار موت کی خواہش یا موت کا شکار ہو جانا ایسے نسوانی کردار کے لیے زندگی کا ضامن بن جاتا ہے ۔ موت کا بذات خود زندگی میں بدل جانا ناول کے قصے میں کردار پر جو واردات گزارتا ہے وہ زندگی کے بارے میں تصورات کو گہنا دیتا ہے ۔ کئی ناول اس امر کی گواہی دیتے ہیں ۔ دیوار کے پیچھے کی مثال دی جا چکی ہے یہاں قاری کا امتحان ہے ۔

کئی ناول یہ تاثر واگزار کرتے ہیں کہ پوری دنیا ہجرت میں ہے اور ازل سے اب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا ۔ ہجرت کے مسائل اکثر جان لیوا ہوتے ہیں ۔ یہ انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگی کے منظرنامے کو یکسر تبدیل کر دیتے ہیں اور اس کے بطن سے ناستلجیا، بے جڑی کا احساس اور ہستی کے یکسر بدل جانے کا انتہائی ناگوار تکلیف دہ احساس جنم لیتا ہے ۔ تقسیم ہند اور تخلیق پاکستان نفرت نظریات کے تصادم اور کشت وخون کی وہ داستان ہے جس میں ان گنت، خوفناک، انفرادی المیے پوشیدہ ہیں جن کو آج بھی پڑھ کر انسان لرز جاتا ہے ۔ ہر ہجرت ناقابل بیان المیے کو جنم دیتی ہے ۔ ہمارا ناول آج بھی ان کہانیوں کو دہرا رہا ہے ۔ آنگن، اداس نسلیں، آگ کا دریا، تلاش بہاراں، لہو کے پھول، اور انسان مر گیا ۔ ایلی اور الکھ نگری (نان فکشن، فکشن) زمین، میرے بھی صنم خانے، بستی، میرا گاؤں، خواب رو (جوگندر پال) سب مل کر ہجرت اور اس سے ابھرنے والے مسائل کا تھوڑا بہت یا زیادہ احاطہ کرتے ہیں ۔ آج بھی پوری دنیا ہجرت میں ہے، لوگ اپنے مستقر سے جنگ وجدل کے باعث بیوی بچوں کے ساتھ سمندری کشتیوں کے ذریعہ یورپ پہنچ رہے ہیں اور کچھ کو سمندری مگرمچھ منزل پر پہنچنے سے قبل ہی نگل رہا ہے ۔ انتظار حسین کے یہاں کشت وخون کے بجائے ماضی کی یادوں کا المیہ ملتا ہے جو ''تذکرہ'' اور ''آگے سمندر ہے'' تک اپنی بساط بچھاتا نظر آتا ہے ۔ 'بستی' سے اقتباس دیکھیے :

''مجھے اپنے گمشدہ پیڑ نظر آرہے تھے، گمشدہ پرندے، گمشدہ صورتیں، نیم کے موٹے ٹہنے میں پڑا ہوا جھولا، صابرہ، لمبے جھونٹے ۔۔''

تذکرہ میں انھوں نے عجیب حقیقت بیان کی ہے کہ مولد کہیں، مقتل کہیں، مدفن کہیں، آنکھ کہاں کھولتا ہے، سوتا کہاں جا کر ہے۔ بو جان (ہیرو کی والدہ) کا دکھ یہ ہے کہ کہ جڑوں سے کٹ جانے پر زندگی میں کس قدر دکھ آ گئے ہیں۔ جب دنیا ہجرت میں ہے اور اس حوالے سے دکھوں کو آنا ہی ہے تو اسے بھی مقدر یا تقدیر کا لکھا تسلیم کرنا پڑے گا کہ بقول ‘گردش رنگ چمن’ کی در بدر بھٹکنے پر مجبور مغل شہزادی مہرو کہ ‘واقعات پر ہمارا قابو کہاں ہے رائے صاحب’ صداقت کا پرتو ہے۔ یہ سب باتیں قاری کے ذہن میں یقیناً تلاطم کا باعث ہوں گی۔ اس حوالے سے انتظار حسین پر ماضی پرستی کا جو الزام ہے اسے انھوں نے یہ کہہ کر دھو دیا ہے کہ روپ نگر (ماضی کا مسکن) اور لاہور گھل مل کر ان کے اندر ایک بستی بن گئے ہیں۔ ادھر جوگندر پال ‘خواب رو’ میں ہجرت کے مسائل کو پوتے کے ذریعے دادا کو یہ کہلوا کر لپیٹ دیتے ہیں کہ سب لکھنو یہیں تو ہے، بڑے ابو...... جوگندر پال، ناسٹلجیا، بے جڑی، ماضی کی یادوں اور ہجرت کے دیگر مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے نئی سرزمین میں پودا لگانے پر زور دیتے ہیں۔ ‘خواب رو’ کا یہی تھیم ہے۔ یہ قاری پر منحصر ہے کہ اس بارے میں اپنا نظریہ قائم کرے جسے وہ بالکل صحیح یا سچ سمجھتا ہے۔ ایڈمنڈ برک EDMUND BURKE نے کیا خوب کہا ہے کہ ناول سچ کو قصے یا ماجرے کا محور بناتا ہے جو اس نے دیکھی اور محسوس کی ہے۔ وہ اور دیگر سب ناول نگار قاری کو زندگی کے محشر دھکا دے دیتے ہیں۔ شاید ڈیوڈ سیسل DAVID CECIL نے صحیح کہا ہے کہ ناول ایک ایسا فنی کارنامہ ہے جو ہم کو ایک زندہ دنیا سے متعارف کرا دیتا ہے۔ مگر واضح رہے کہ یہ زندہ دنیا ایک گھنا جنگل ہے جس کی بھول بھلیوں، پگڈنڈیوں، کانٹوں بھرے راستوں اور انسانوں پر حملہ آور مرئی اور غیر مرئی ہستیوں کے دیے گئے زخموں کا کہانی کی شکل میں چکرا دینے والے حال چال کی عکاسی ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ناول میں جہاں طبیعات کا انسانی زندگی میں دخل دکھایا جاتا ہے وہیں مابعد الطبیعات کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ‘گردش رنگ چمن’ میں قرۃ العین حیدر نے ایک زندہ پیر میاں یا بھیا کو پیش کیا ہے جن کی کرامات کو سب نہیں کچھ لوگ بد عقیدگی، بدعت اور غیر حقیقی سوچ قرار دے سکتے ہیں۔ عقیدے کے معاملات نازک ہوتے ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ میاں/بھیا سے ان کی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں ہیں۔ یہ صاحب نوجوان تھے اور مریدوں کا لاؤ لشکر ان کے ساتھ چلتا تھا۔ ان کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ علم لدنی سے بہرہ ور تھے! روایتی تعلیم نہ ہونے کے باوجود علم کا سمندر اور غیب پر عبور رکھتے تھے، وہ قطب الاقطاب تھے۔ انہیں مریدوں نے بیک وقت کئی مسجدوں میں نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ ایک بار ایک پریشان حال شخص کے والد کی روح کو بلا لیا تھا جنہوں نے جائیداد کی وہ تفصیلات انہیں بتا دیں جن کی غیر موجودگی میں وہ مقدمہ ہار جاتے۔ ایک خاتون نے بتایا کہ اولیا اللہ زمان و مکان سے آزاد ہوتے ہیں ان کی کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ عربی باجی (ایک کردار) نے یہ بھی بتایا تھا کہ ایک جن بصورت انسان فرنگی محل کے مدرسے میں پڑھنے آتا تھا۔ بانو قدسیہ نے ‘راجہ گدھ’ میں مابعد الطبیعاتی نقطہ نظر کو جینز (خلیوں) سے جوڑ کر پروفیسر سہیل سے کہلوایا تھا۔ ‘میری

تھیوری ہے کہ جس وقت رزق حرام جسم میں داخل ہوتا ہےتو وہ انسان کے جینز کو متاثر کرتا ہے۔ رزق حرام میں ایک خاص قسم کی میوٹیشن MUTATION ہوتی ہے۔ جو خطرناک ادویات، شراب اور RADIATION سے زیادہ مہلک ہے۔ وہ مزید بتاتے ہیں کہ ان جینز کے اندر ایسی پراگندگی ہوتی ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ یقین کرلو کہ رزق حرام سے آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے۔"

میرا خیال ہے کہ سنجیدہ قاری نے اپنے مشاہدے سے محسوس کیا ہوگا کہ رزق حرام کھانے والوں میں یقیناً ایک نوع کا پاگل پن موجود ہوتا ہے۔ بانو نے مادیت پرستی کے مہلک اثرات کا بھی احاطہ کیا ہے ادھر قرآن اور حدیث دونوں میں رزق حلال کے فوائد اور برکتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے لہٰذا فکشن میں یہ باتیں قاری کے شعور میں اضافے کا باعث ہوتی ہیں۔ ایک اور حوالہ میں ورجینیا وولف کے تعلق سے ایک بار پھر شرمندگی کے ساتھ باربار دیتا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ناول میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ اس میں سب کچھ سمویا جا سکتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ یہ شتر مرغ کی طرح سب کچھ کھا جاتا ہے۔ ڈی ایچ لارنس نے بھی اپنے ایک مضمون میں ناول کو گلیلیو کی دوربین سے بڑی ایجاد کہا ہے۔ ان اقتباسات کے حوالے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناول کی موضوعاتی اور محرکاتی وسعتیں لامحدود ہیں جو قاری کو زندگی کے گورکھ دھندوں، اس کے مخمصوں، اس کے دیکھنے میں لاینحل مسائل اور اس کے متعلق دکھوں کے روبرو کرتا ہے۔ لیکن شعور کی بلند سطح اسے مطمئن کر سکتی ہے۔ گوتم نے "آگ کا دریا" میں "علم" کا آزادی اور سکون سے رشتہ جوڑا تھا۔ کیمو سمجھتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کے ہزاروں سوالات ہیں اور کائنات کی مکمل خاموشی ہے لیکن پیغمبروں کے فرمودات و ملفوظات ان کی انسانیت کی فلاح کی خاطر قربانیاں اور صحیفے بھی تو بھٹکنے سے بچاتے ہیں۔ قاری ان تعلیمات سے بھی تو حاصل کرتا ہے۔ کافکا نے اچھی بات کہی ہے کہ بہت سی باتوں اور الفاظ کا مطلب اپنے زخموں سے سمجھ میں آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی گہرائی میں جا کر زندگی کے گورکھ دھندوں اور مخمصوں سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ فنتاسیائی ناول NOVELS OF FANTASY بھی جن کی تعداد اردو میں کم ہے ایک اخلاقی نظام کی بازگشت ہیں۔ شوکت صدیقی، غربت، مفلسی، استحصال اور مزدوروں سے حق تلفی پر اپنے ناولوں میں شدید وار کرتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی "جاگے ہیں خواب میں" زندگی کی حقیقت کو مابعد الطبیعات سے منسلک کرتے ہیں۔ دیکھنے میں ان کا ہیرو زمان وقت میں پیچھے کی طرف سفر کرتا ہے ایسا ثابت ہوتا ہے کہ خواب کی صورت میں انسان جاگ رہا ہے۔ 'دائرہ' میں عاصم بٹ نے پہچان کی گمشدگی تشکیک کے روگ اور شخصیت کے دولخت ہونے کا اپنے ہیرو کے حوالے سے ماتم کیا ہے۔ جس کے عقب میں بچپن کا فرسٹریشن اور کافکائی الجھن شامل ہے۔ دونوں ناول جدید رنگ کے ہیں اور تیسرا فلسفے کے پروفیسر مرزا اطہر بیگ کا ناول 'غلام باغ' ہے جس کے تین ایڈیشن قاری کی پسندیدگی کا ثبوت ہیں۔ اس میں پوسٹ کولونیل POST COLONIAL اور بلاشبہ پری کولونیل PRECOLONIAL زندگیوں کا زبان کے نئے ذائقے کے ساتھ اظہار ہے۔ لایعنیت اور

مضحکہ خیز حراکات واعمال کی انوکھی حقیقت کے پردے میں عکاسی کے لیے یہ ناول ہمیشہ یادگار رہے گا اور مذکورہ تینوں ناولوں پر تادیر گفتگو کا امکان ہے۔ اس کے علاوہ مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں راکھ، بہاؤ، قربت مرگ میں محبت، قلعہ جنگی، ڈاکیا اور جولایا اور اے غزال شب پر بات کرنا ضروری ہے جن میں بالترتیب پاکستان کے سیاسی وسماجی منظر تھے، موہنجوداڑو اور ہڑپا کے قدیم انسانوں کی معاشرت، زیادہ عمر کے دانشور ٹائپ انسان (ٹی وی شخصیت) کی جانب نوجوان وادھیڑ عمر عورتوں کا جھکاؤ، افغان جنگ کا تناظر، علامت کی زبان میں زندگی کے عجیب مظاہر کی عکاسی اور سوئیٹ روس کے انہدام پر پرکشش اسلوب میں تھیمز THEMES کے اظہار ایک دل چسپ رنگا رنگ دنیا کو سامنے لاتا ہے۔ ابتدائی اور گزشتہ کئی عشروں کا ناول قاری کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ زندگی کے گورکھ دھندوں، مخمصوں، کھیکھڑوں اور سائنس کے عہد کے نئے پیچیدہ منظر ناموں کو گہرائی میں جا کر سمجھے اور لطف اٹھائے، یعنی اپنے مطالعاتی کرب AGONY کو مسرت میں تبدیل کرے۔ رابرٹ فراسٹ نے کہا ہے کہ ناول کا مطالعہ مسرت سے بصیرت تک لے جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ اس مسرت میں بصیرت بھی پوشیدہ ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر صلاح الدین درویش

مابعد جدیدیت، لبرل علوم اور ڈی کنسٹرکشن

بیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں تک آتے آتے گزشتہ سوا سو سال کی علمی، فلسفیانہ، سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی نظریہ سازی کی تمام تحریکوں نے سرمایہ داری نظام کی ضرورتوں کی کوکھ سے جنم لینے والے لبرل علوم کی طاقت اور افادیت پسندی کے سامنے ہتھیار پھینک دیے۔ ان لبرل علوم کا تعلق مارکیٹ اور سرمائے کے باہمی اعتماد اور تعاون سے تھا۔ سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں تحقیق و جستجو کی خالص نظریاتی بنیادوں کو غیر ضروری قرار دے دیا اور علوم کا تعلق براہ راست ٹیکنالوجی، پیداوار، مارکیٹ اور سرمائے سے جوڑ دیا۔ ٹیکنالوجی، پیداوار، مارکیٹ اور سرمایہ انسانی تمدن کے ایسے مظاہر ہیں کہ جن کا کسی بھی نوع کی نظریاتی شناخت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان مظاہر کے عملی قیام کے لیے جن لبرل علوم کو بے پناہ ترقی اور وسعت حاصل ہوئی وہ علوم ساری دنیا کا گویا عالمی اثاثہ قرار پائے اور تمام اقوام عالم نے ان علوم کو اپنے قومی نصابوں کا بغیر کسی بڑی یا چھوٹی رکاوٹ کے حصہ بنا لیا۔ آزادی، ترقی اور خوشحالی کا وہ خواب جسے حقیقت کی شکل دینے کے لیے یورپ اور امریکہ نے اپنے لیے ممکن بنا لیا تھا، باقی تمام اقوام بھی اسی خواب کی اسیر ہو گئیں۔ اس خواب کی تعبیر مارکیٹ اور سرمائے کو بنیاد بنانے والے لبرل علوم کے حصول کے بغیر ناممکن تھی۔ ڈیکارٹ، لاک، ڈیوڈ ھیوم، والٹیر، نطشے، مارکس اور ڈارون سے لے کر سارتر تک جتنے بھی جدیدیت پسند نظریاتی فلسفی اور مفکرین تھے، سماج کی اس نئی سائنس کے سامنے بے اثر اور غیر ضروری ہو گئے۔ یہ مابعد جدید عہد تھا۔

جدیدیت کے تمام نظریہ سازوں کو فرد کی بجائے جماعت میں گہری دلچسپی تھی ان کا خیال تھا کہ کسی بھی مقصد یا نصیب العین کے حصول کے لیے کسی گروہ، جماعت یا پارٹی کا ہونا از حد ضروری ہے۔ نظریے سے وابستہ اور ہم خیال لوگوں کے گروہ کے بغیر وہ اپنے نظریے کو بے جان سمجھتے تھے چنانچہ نظریہ سازی میں اس بات کا خاص اہتمام رکھا جاتا تھا کہ نظریہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابل قبول بن جائے اور قبولیتِ عامہ کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ اپنے نظریے کی اپیل کسی رنگ، نسل، زبان، جغرافیہ یا مذہب میں پیدا کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر نظریات کا جوہر ”تعصب“ قرار پایا۔ نظریہ، تعصب اور عقیدہ ایک ایسی تکون ہے کہ جس کا مرکز و محور ”نظریاتی شناخت“ بن جاتا ہے۔ یہ شناخت نظریے کے حامل فرد اور جماعت کو دوسرے تمام انسانوں سے ممتاز قرار دیتی ہے اور معقولیت کی جگہ عدم رواداری، تسلط پسندی، نفرت اور تشدد لے لیتا ہے۔

مارکیٹ اور سرمائے کو بنیاد بنانے والے لبرل علوم اپنے اصول وقوانین میں کسی بھی نوع کی نظریاتی شناخت سے محرومی کے باعث اس قابل ہوتے ہیں کہ نظریاتی مقصدیت یعنی تعصب، نفرت اور عدم رواداری کے متوازی ایک ایسے تمدن کے قیام کا مطالبہ کریں کہ جس میں خیر سے مراد معاشی اور سماجی خوشحالی ہو۔ یہ علوم اجتماع کی بجائے فرد کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی نظریاتی شناخت سے علیحدہ ہو کر بھی خود اپنے اور معاشرے کے لیے مفید شہری بن سکتے ہیں۔ بطور سیاسی نظام جمہوریت کا سیکولر اختصاص نظریاتی شناخت کو دبائے رکھنے کا بہترین ٹول ہوتا ہے کہ جس کے نتیجے میں مارکیٹ اور سرمائے کی وسعت کا وہ ہدف جو لبرل علوم کا منشا ہوتا ہے، حاصل ہونے میں بہت آسان ہو جاتا ہے۔

مابعد جدیدیت نظریاتی تفکر میں سر کھپانے اور انفس و آفاق کے بارے میں عقلِ محض کے ذریعے حتمی آراء کے ظہور کی بجائے ان لبرل علوم پر فوکس کرتی ہے کہ جن کی عملی سرگرمیوں کے نتیجے میں انسانی تمدن کو مادی وسائل کے ذریعے ترقی ملتی ہے۔ نظریاتی تفکر کا مسئلہ یہ ہے کہ کہ اس تفکر کو عملی سرگرمیوں میں حصہ بنا کر اسے انسانی تمدن کی تشکیل میں بروئے کار نہیں لایا جا سکتا مثلاً ہیگل جب یہ کہتا ہے کہ عقل کائنات کا جوہر ہے تو عقل، کائنات اور جوہر تین ایسے اجزاء ہیں کہ جن کی عددی یا مقداری پیمائش ممکن نہیں ہے اور نہ ہی ان تینوں کے ارتباط سے کسی معنوی تشکیل کو منظر عام پر لایا جا سکتا ہے، اس کے حقیقی مقصود کو تمدن کی صورت گری میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

فلسفیانہ افکار میں ”نظریہ“ ایک ایسی قدیم ایجاد تھی کہ جس کے ذریعے حیات و کائنات کے حوالے سے بڑے بڑے سوالوں کا جواب دینے کی لیاقت پیدا کرتا تھا مثلاً یہ کہ کائنات کیسے وجود میں آئی؟ کائنات کے مقاصد کیا ہیں؟ حیات کیا ہے؟ بعد از حیات کیا ہے؟ گناہ اور احساسِ گناہ کیا ہے؟ خیر کیا ہے؟ شر کیا ہے؟ بیماریاں کہاں سے آتی ہیں؟ یقین کیا ہے؟ تشکیک کیا ہے؟ خدا کیا ہے؟ دیوتا کون ہیں؟ وغیرہ ایسے تمام سوالات کا جواب محض عقل سے دیا جانا ممکن نہیں تھا کیوں کہ عقل کے پاس جو شواہد تھے وہ ان کی صرف ناظر تھی چنانچہ نظری افکار کا فلسفے میں بار پا جانا بعید از قیاس نہ تھا۔ جب تک اشیا یا مظاہر کے باطن میں موجود عناصر اور ان کے اندرونی نظام سے آگاہی ممکن نہ ہو سکی اس وقت تک فلسفیانہ افکار ذہنِ انسانی کو مسلسل متاثر کرتے رہے اور مادی سچائی کی جگہ قیاس، گمان، خیال یا نظریے کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا اور اکثر نظریاتی افکار کو یقین جیسا اعتبار بھی حاصل ہو گیا۔

بیسویں صدی کے نصف آخر کے بعد سائنسی تحقیقات نے سرعت اختیار کی۔ یہ مادی حقیقتوں کی دریافت کا زمانہ تھا، نظریاتی خیال آرائیوں کا ان حقیقتوں کی کھوج، طریقہ کار اور ضرورت سے دور دور تک کا کوئی تعلق نہ رہا۔ یہ وہ جہانِ علم تھا کہ جس نے نظریہ سازوں کے ایمان و یقین کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کو بھی وقت کا زیاں سمجھا اور مادی علوم کا ہر شعبہ اپنی سماجی اور مادی معنویت کے باعث انسانی زندگی کا لازمی حصہ اور

ضرورت بنتا چلا گیا۔ تعقل، نظریے اور ایمان کی جگہ اب لبرل علوم نے لے لی کہ جن کی بنیاد محض مادے پر اور اس میں تحقیق پر تھی، جو اصول و قواعد اخذ ہوئے وہ سائنسی علوم کا متن قرار پائے اور پھر انہیں ٹیکنالوجی کا حصہ بنا کر پیداواری ضرورتوں کے ساتھ مشروط کر دیا گیا۔ یوں ایسے تمام علون و فنون، سماجی خدمات کی مستقل اور ارتقاء پذیر شعبے بنتے چلے گئے۔ مثلاً میڈیکل سائنس محض ایک علم نا رہا بل کہ اس کے دائرۂ وسعت میں یہ انڈسٹری بھی ہے، پیداوار بھی، مارکیٹ بھی اور مارکیٹ کی مینجمنٹ بھی۔

فطرت، ابدیت، آفاقیت، معروضیت، موضوعیت، اخلاقی نظام، عظیم تہذیبی روایات اور اعلیٰ اقدار و روایات کے نام پر جو عقل کے گھوڑے دوڑا کر نظریات قائم کیے گئے وہ ایسے عظیم مہابیانیے قرار پائے کہ جن کی عظمت پر سوال اٹھانا گویا انسان کی فطرت اور جبلتوں پر اعتراض اٹھانا تھا، ان بیانیوں کو خیر اور زندگی کا اصل اور حاصل سمجھ لیا گیا۔ ان کی منطقیت کی دھاک اقوام عالم پر ایسی بٹھائی گئی کہ ان میں موجود تضادات کو ابھارنا اور ان کے سطحی پن کو چیلنج کرنا ذہنِ انسانی سے گویا باہر نکال دیا گیا۔ ان میں موجود نسلی، گروہی، قومی، مذہبی، لسانی اور ثقافتی تعصبات کو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مہابیانیوں کے حاملین کا حق سمجھا اور جتایا گیا، اس حق کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفرتوں اور حقارتوں کے خلاف اٹھنے والی گردنوں کو کاٹ دینے کے حکم نامے سنائے گئے۔ جدیدیت بھی انہی مہابیانیوں کا تسلسل تھی۔ عالمی سرمایہ دار طاقتوں مثلاً برطانیہ، روس، امریکہ، فرانس اور جرمنی وغیرہ نے عالمی سطح پر اپنے سماجی اور معاشی تسلط کے لیے رنگ، نسل، زبان، مذہب اور تہذیب و ثقافت کے مہابیانیوں کو جدیدیت کے اہداف کے حصول کے لیے قابلِ قبول بنایا۔ ان طاقتوں کے پاس اپنی نو آبادیات پر چڑھائی اور جنگی جارحیت کے لیے کوئی بھی سیاسی یا اخلاقی جواز ہرگز نہ تھا چنانچہ ضروری سمجھا گیا کہ اپنے سیاسی اور اخلاقی جواز کے لیے ان مہابیانیوں کی طرف رجوع کیا جائے کہ جن کی عظمت اور برتری سے انحراف ان کی شناخت کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھی۔

یہی وجہ تھی کہ مذہب، ادب، ثقافت، زبان، نسل، اساطیر، تاریخ اور روایات کی بنیاد پر قائم نسلی، گروہی اور قومی مہابیانیوں کو تمدنِ جدید کے سیاسی اور معاشی مقاصد کے حصول کے لیے خوب خوب ہوا دی گئی اور نفرت اور حسد کی چنگاریوں نے دونوں عالمی جنگوں میں پوری انسانیت کو جلا کر بھسم کر دیا۔

ہمیں ڈینئل بیل کی کتاب "END OF IDEOLOGY" کے مندرجات سے کوئی بحث نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مابعد جدیدیت نے قومی، نسلی، ثقافتی اور مذہبی مہابیانیوں کے متشدد اور تعصب آمیز نظریات پر سوالات اٹھانے کے طریقہ کار کو سمجھا کر نظریے کی موت کا اعلان کر دیا ہے۔ ان مہابیانیوں سے جڑے بے جا احساسِ تفاخر کے بخیے ادھیڑنے کی راہ سجھا دی ہے۔ جدیدیت کی آدرشی نمائشیت کے خلاف محاذ کھول دیا ہے۔ جسے فلسفے کی اصطلاح میں "PLURALISM" کہا جا رہا ہے۔ وہ مذاہب، ثقافتوں، نسلوں، ادبیات اور اساطیر کے باہمی اشتراک و تعاون کا نام نہیں ہے اور نہ ہی ان میں موجود ایک دوسرے

کے خلاف نفرت انگیز مواد کے کانٹے نکال باہر پھینکنے کا کام ہے۔ مہابیانیوں کی تصحیح بھی یا قابلِ قبول جدت بھی اس ازم کی بحث سے خارج ہے جو مہابیانیوں پر واضح اور دوٹوک انداز میں تنقید کے ذریعے لبرل علوم کے استحکام کی ذمہ داری کو پورا کر رہا ہے۔ یہ تحریک لبرل علوم کو مہابیانیوں میں موجود عقلِ محض کی خیال آرائیوں سے آزاد اور علیحدہ کر رہی ہے۔ مہابیانیوں میں موجود سچائی یا صداقت کے معیارات کو جو تقدیس حاصل ہے اس کے باعث متوازی افکار و نظریات کی دنیا کو سطحی اور نا قابل اعتنا سمجھا جاتا ہے۔ ایسے افکار و نظریات کو سطحی قرار دینے کے لیے مہابیانیوں کے مندرجات کو بطور سند پیش کیا جاتا ہے کہ جس کا مقصد مہابیانیوں کی اتھارٹی اور حتمیت کو لازمی طور پر ثابت کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ارتقاء پذیر اور انسانی سماج کی ضروریات سے مطابقت قائم کرنے والے چھوٹے بیانیے لبرل علوم کی صورت میں مسلسل مدون ہوتے چلے گئے۔ لبرل علوم کی اس آزاد خیالی اور وسیع المشربی کا فائدہ یہ ہوا کہ انھوں نے مہابیانیوں کی طرح سائنس کو بھی سچائی کا حتمی معیار ماننے سے انکار کر دیا اور سائنس کے علم کو کوئی مہابیانیہ سمجھنے کی بجائے اسے صداقت کا ایک ادنیٰ ساجز قرار دے دیا لیکن یہی وہ ادنیٰ ساجز ہے جو مہابیانیوں کے تقدس اور ان کے منطقی استدلال کو مسلسل چیلنج کرتا ہوا سائنس کے علم کو ترقی کی منازل کی طرف دھکیل رہا ہے۔

مابعد جدیدیت جب یہ دعویٰ کرتی ہے کہ حقیقت کا کوئی حتمی مرکز نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حیات و کائنات کی بے حد و شمار حقیقتیں ہیں، ان حقیقتوں کا باہمی ارتباط اور تعلق ایک ایسا وسیع و عریض جال ہے کہ جس تک سائنسی تحقیق کی بنیاد پر دسترس کے بغیر حیات و کائنات کے بارے میں کوئی بھی حتمی نظریہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حیات و کائنات کے بارے میں لبرل علوم اور ان کی تحقیقات کا دائرہ اجزاء کی تفہیم تک محدود ہے اور تحقیقات کا یہ سلسلہ ان علوم کے ارتقاء میں مسلسل جاری و ساری ہے۔ سائنس اور سائنسی فکر کی بنیاد پر ابھرنے والی یہ چھوٹی چھوٹی سچائیاں ایسے "MINI NARRATIVES" ہیں جو کسی عظیم اور حتمی سچائی کی طرف بڑھنے کا دعویٰ کیے بغیر اجزاء کے ظاہر اور باطن میں چھپے عناصر، نظام اور طریقہ کار کو سمجھنے میں غرق ہیں۔ کسی مربوط اور ہمہ گیر آئیڈیالوجی یا نظریے کا قیام اس کی بحث سے خارج ہے۔ اس بات کا خاص اہتمام سائنسی علوم کے ساتھ ساتھ سماجی علوم میں بھی کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مابعد جدیدیت نے علمِ تاریخ کے حوالے سے اس بات کا انکار کر دیا ہے کہ انسانی تاریخ کے ارتقاء کے نتیجے میں کچھ ایسے اصول مرتب ہو چکے ہیں کہ جن کی بنیاد پر تاریخی سچائیوں کی دریافت ممکن ہے۔ انسانی تاریخ کا نہ کوئی حتمی اصول ہے اور نہ ہی کوئی ایسی سچائی ہے کہ جسے اتھارٹی قرار دیا جا سکے۔ تاریخ کی سچائیاں وہ عقلی موشگافیاں ہیں کہ جن کا مقصد اپنے نظریات میں موجود تعصب، نفرت، حقارت، انسان دشمنی اور تسلط پسندی کے عناصر کو دبا کر اپنی اس سچائی کو منظرِ عام پر لانا ہے کہ جس کو کسی گروہ، جماعت، نسل، وطن یا قوم یا مذہب کی حمایت اور ہمدردی حاصل ہو۔ حتمی اور ہمہ گیر سچائیوں کے حامل ایسے تمام بڑے بیانیے اور نظریات چھوٹی چھوٹی سچائیوں کے ان تمام

پہلوؤں سے نگاہ ہٹا دیتے ہیں کہ جن پہلوؤں کو دبانا ہی مہابیانیوں کی ان نام نہاد حتمی سچائیوں کا مقصود و مطلوب ہوتا ہے۔

انسان اور انسانی تاریخ کے بارے میں کوئی بھی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی اور اس حوالے سے جن پیش گوئیوں کا اعادہ کیا جاتا ہے ان کا مقصد تاریخ سے متعلق اپنے نظریے کا دفاع ہوتا ہے یہ نظریہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ بظاہر جسے ایک قوم، نسل، فرقہ، گروہ یا کسی مذہب کے حاملین اس نظریے کے بموجب اس نظریے کے مندرجات کو صریح ظلم اور ناانصافی سمجھتے ہوں وہ اسے عین حق اور مبنی پر انصاف سمجھ کر م قبول کر لیں ورنہ نتائج کے لیے تیار رہیں۔

تاریخ سے متعلق ایسے تمام تصورات اور نظریات اور ان کی مقصدیت مابعد جدیدیت کو ہرگز قبول نہیں ہے، ان معنوں میں ہم باسہولت کہہ سکتے ہیں کہ مابعد جدیدیت ردِ ثقافت یا DECULTURALIZATION کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدیدیت نے جن مہابیانیوں کی آڑ میں رنگ، نسل، زبان، تہذیب، مذہب اور تاریخ پر تفاخر کی بنیاد پر نئی معاشی منڈیوں کے حصول کے لیے تعصب، تشدد اور جارحیت کو اپنا فطری، نسلی، مذہبی، قومی یا لسانی حق قرار دے دیا تھا وہ حق چھوٹے بیانیوں کی حامل آزادی کی سیاسی تحریکوں نے چھین لیا مثلاً ہندوستان میں پہلے متحدہ ہندوستان کی آزادی کے چھوٹے سیاسی بیانیے نے آزادی اور خود مختاری کی تحریک میں زور پیدا کیا اور بعد ازاں دوسرے چھوٹے بیانیے یعنی دو قومی نظریے نے ”انگریز صاحب بہادر“ کے مہابیانیے کو دیس نکالا دے دیا۔ یاد رہے کہ دو قومی نظریہ اپنی الگ الگ قومی شناخت کے حوالے سے اپنا اپنا مذہبی، قومی اور نسلی مہابیانیہ رکھتے ہیں اگرچہ ان مہابیانیوں کے قومی، نسلی اور مذہبی تعصبات کو یہاں کے تعلیمی اداروں میں پڑھائے جانے والے لبرل علوم نے اب کافی حد تک بے اثر بنا دیا ہے۔ تاہم اس جملے کے مضمرات قابل بحث ہیں۔

ردِ ثقافت کے حوالے سے مابعد جدیدیت کا مطالبہ بلا وجہ نہیں ہے۔ جدیدیت کے نتائج ایک خاص حد تک ٹھکانے لگنے کے بعد سرمائے کی آزادانہ گردش اور پیداوار کی آزاد منڈیوں تک رسائی کے لیے مہابیانیوں کی موجودگی نے معاشی مقاصد کے حصول کے لیے قومی، نسلی اور مذہبی امتیازات جیسی کئی طرح کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں، چنانچہ ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایسی تمام پابندیوں کو خاطر میں لائے بغیر فری مارکیٹ کے تصور کو عالمی دکانداری کا لازمی حصہ بنا دیں۔ فری مارکیٹ اکانومی کا یہ نظریہ محض نظریاتی خیال آرائی نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق اس ٹھوس اور حقیقی صنعتی و نیم صنعتی پیداواروں سے تھا کہ جس کی طاقت کا مرکز و محور عالمی منڈی میں سرمائے کی آزاد اور بے رحم گردش سے تھا۔ تیسری دنیا کے نیم صنعتی معاشرے کہ جن کی صنعت کا تعلق محض خام مال کے حصول سے تھا۔ ان میں موجود غیر صنعتی پیشہ ور دلالوں کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ مصنوعات کی مارکیٹ کے لیے اپنے حصے کے غیر صنعتی یا تجارتی سرمایے سے ہاتھ دھونے کے لیے اپنے مہابیانیوں کو اپنے سینے

سے چھٹائے رکھتے۔ چنانچہ ردِ ثقافت نے مغرب سے کہیں زیادہ مشرق میں رنگ دکھایا۔

ردِ ثقافت مابعد جدیدیت کا براہ راست موضوع نہیں ہے اور نہ ہی لبرل علوم کی ترویج مابعد جدیدیت کا بنیادی موضوع ہے۔ اس مضمون میں ان دونوں حوالوں سے بحث کا مقصد ردِ تشکیل کے مفکرین لیوٹا رڈ، مشیل فوکو، رولاں بارت اور ڈریڈا کے افکار کی معنوی توسیع ہے تا کہ ادبی متون کے مابعد جدید مطالعے اور تنقید کے طریقہ کار کو سمجھنے میں سہولت پیدا کی جا سکے۔ اس حوالے سے ہمارے پیش نظر مہابیانیوں کی متون ڈی کنسٹرکشن یا ردِ تشکیل نہیں ہے بلکہ وہ تمام ادبی متون ہیں کہ جن میں مذہبی، نسلی، قومی، لسانی یا تہذیبی مہابیانیوں کی وکالت، تائید، حمایت یا دفاع کی مختلف صورتیں موجود رہتی ہیں، جہاں نسلی، قومی یا تہذیبی وقار اور امتیاز کو اجاگر کرنے کے لیے بڑی دلیری اور اعتماد کے ساتھ دوسری نسلوں، قوموں، مذہبوں، فرقوں، گرہوں یا تہذیبوں کے ساتھ دشمنی، حقارت اور تعصب کو استحقاق سمجھا جاتا ہے اور دوسروں کی نسلی، مذہبی یا تہذیبی شناخت کی توہین اور تذلیل پر اپنی شناخت کا قد بڑھایا جاتا ہے۔ مہابیانیوں کے نظریات ایسے عقائد بن جاتے ہیں کہ جو ادبی متون میں داخل ہو کر فن یا کرافٹ کے ذریعے اپنے داخلی تعصّبات اور فکری تضادات اور جھول کو مزید دبا دیتے ہیں اور بقول رولاں بارت ایک طرح کا PLEASURE OF TEXT (متن کا ثقافتی سرور) یا JUSSANCE پیدا ہو جاتا ہے، یوں تعصّبات کی معنوی پرتیں قاری کے ذہن کو متن کے ’’تجزیئے‘‘ سے دور لے جاتی ہیں اور متن کا معنوی سطحی پن اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر شعری متون میں ایسے احتمال کی گنجائش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ایسی شاعری حقیقی اور مادی زندگی کی چھوٹی مگر ناگزیر سچائیوں کو دبا کر ایک نمائشی سچ کو منظر عام پر اچھال دیتی ہے کہ جس کا مقصد سچائی کے اس ماڈل کو دیدہ زیب اور پُر مغز قرار دینا ہوتا ہے کہ جو ماڈل تہذیبی، نسلی، ثقافتی یا مذہبی اشرافیہ کے پیمانے سے مطابقت رکھتا ہو۔

مشیل فوکو نے ایسے متون کی انقلابیت کو سیاسی اور معاشی طاقت کے کسی دوسرے مرکز کے قیام کی خواہش قرار دیا ہے، ہر نیا ادبی یا سیاسی منشور طاقت کے حصول کے لیے کہیں نہ کہیں مہابیانیوں کے مقاصد کو بھی اپنی شقوں میں ضرور داخل کر لیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا نہ کرنے سے منشور کی اجتماعی اپیل محدود ہو جاتی ہے اور جسے متون کے مطالعہ کے بعد تعینِ قدر کا مرحلہ قرار دیا جا سکتا ہے، اس کا تعین بھی تہذیبی، نسلی، مذہبی، یا ثقافتی مہابیانیوں کی روشنی میں کہا جاتا ہے۔ ان مہابیانیوں کی اقدار ہی سے ادبی متون کی قدر کا تعین کیا جاتا ہے۔ ان اقدار سے مطابقت ہی قدر کا تعین کہلاتی ہے۔

ڈی کنسٹرکشن متن میں موجود معنی کی وحدت، تحریری اسلوب یا نظام کی مرکزیت، الفاظ، تراکیب اور جملوں کی نشست، اہتمام اور سلیقے میں موجود ترتیب اور توازن کو توڑ دیتی ہے۔ متن کا نمائشی تعقل جس نفرت، تعصب اور تسلط کی خواہش کو دبا کر اسے تفکر، تدبر اور حکمت کا لبادہ اوڑھا دیتا ہے، ڈی کنسٹرکشن اس لبادے کو گھسیٹ کر پرے پھینک دیتی ہے اور متن کی دبائی میں اصل خواہش کو ننگا کر دیتی ہے، وہ متن کی

معنوی حمیت اور حاکمیت کو توڑ دیتی ہے اور متن کا وہ معنوی تناظر سامنے لے آتی ہے کہ جسے متن کا بظاہر نمائشی تعقل دبانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یوں صداقت پر نظریے، فلسفے یا کسی مہابیانیے کی اجارہ داری LOGOCENTERISM کو بھی توڑ دیا جاتا ہے۔

ہر متن اپنے لیے ایک خاص سیاق وسباق منتخب کرتا ہے، سیاق وسباق کا یہ انتخاب کسی بھی متن کی معنوی حیثیت کو مشکوک بنانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ چنانچہ جس مہابیانیے کے سیاق وسبق میں رہتے ہوئے متن کی نظریاتی تشکیل کی جاتی ہے۔ متن کی یہ نظریاتی تشکیل THE OTHERS کے کان کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے، اس نظریاتی تشکیل میں ''دوسروں'' کے لسانی، قومی، مذہبی یا ثقافتی مفادات اور مقاصد کو جب ہدف بنایا جاتا ہے تو دوسرے اپنے مہابیانیوں کے سیاق وسباق میں اپنے متون کی نظریاتی تشکیل کے لیے کیل کانٹوں کو سیدھا کر لیتے ہیں۔ ڈی کنسٹرکشن متون کی ہر دو صورتوں کی خبر لیتی ہے کیوں کہ وہ متون کی نظریاتی تشکیل میں موجود تضادات، افتراقات اور معنوی کھانچوں پر خوب نظر رکھتی ہے۔ اپنی برتری، افتخار اور امتیاز کو جب بہر طور ثابت کرنا لازم آجاتا ہے تو جھوٹ، مکر وفریب اور جعل سازی کا متون میں در آنا کچھ ایسا مشکل نہیں رہتا۔ تاریخ، واقعات، افکار، شواہد اور شخصیات کو اپنی مخصوص نظریاتی تشکیل کے لیے متون میں موم کی ناک کی طرح من مانی شکل دے دی جاتی ہے۔ ڈی کنسٹرکشن ہر دو متون کے مطالعہ کے دوران ایسی تمام شکلوں کو ان کی اصل میں بحال کر دیتی ہے یعنی ہر دو متون میں موجود نفرت اور تعصب پر مبنی مواد کو متون سے باہر نکال کر ان کے فکری سطحی پن کو نمایاں کر دیتی ہے۔

ڈی کنسٹرکشن نثری وشعری متون کے باحتیاط مطالعے کا نام ہے، اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ کسی بھی متن کی پہلی خواندگی میں حالات، واقعات، فکریات، اس میں موجود اقتباسات، شخصیات، دلائل، شواہد، تشبیہات، علامات، استعاروں، روزمرہ محاورات، الفاظ، الفاظ کی تراکیب اور متن کی ترتیب اور توازن کو بالکل ویسے ہی دیکھا، سمجھا اور جانچا جائے کہ جو متن کی تشکیل کا مقصود ہو اور تجزیے میں ان تمام کی وضاحت کر دی جائے کہ جن سے وہ متن تکمیل پا کر ایک مربوط اور بامعنی تحریر کی صورت میں سامنے آیا ہے اور وہ تمام اعتراض جو اس تحریر یا متن پر واجب ہوتے ہیں انہیں ذیلِ مطالعہ نہ ہونے دیا جائے تا کہ متن کی اصل معنوی صورت برقرار رہے۔ دوسری خواندگی میں حالات، واقعات، فکریات، دلائل اور شواہد وغیرہ میں موجود تضادات اور افتراکات اور GAPS یعنی معنوی کھانچوں کو متن سے الگ کر دیا جائے کیوں کہ نظریاتی تعقلات کی تشکیل میں مخالف متون کو غلط، بے معنی اور ناحق ثابت کرنے کے لیے ان تضادات یا افتراکات کا در آنا ضروری ہے۔ نفرت اور تعصب کی وجوہات کے پیچھے نسلی، گروہی، ثقافتی، مذہبی یا قومی مفادات کے حصول کے لیے جو طاقت اور نظریے کی سچائی درکار ہوتی ہے، مہابیانیوں کی خوشہ چینی سے متن میں وہ طاقت اور سچائی کا جوہر بہت کم سما پاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عقلی استدلال جب اس کمی کو پورا کرنے کے لیے متن کے میدان میں

اترتا ہے تو متن میں غصہ اور اشتعال کے باعث شواہد اور دلائل کی جگہ براہ راست تعصبات لے لیتے ہیں۔ یوں وہ متن جو صداقت کی تلاش میں سفر کا آغاز کرتا ہے بہت جلد تضادات اور افتراقات کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ ڈی کنسٹرکشن کے لیے متن کی دوسری خواندگی متن میں موجود نفرت، غصے، حسد اور تعصب کے تمام عناصر کو منظر عام پر لے آتی ہے اور ان تمام جگہوں کی نشاندہی کرتی ہے کہ جہاں جہاں متن کی نظریاتی تشکیل نے ٹھوکر کھائی ہو۔ ڈی کنسٹرکشن کا تیسرا مرحلہ DECONSTRUCTED متن کی تیاری کا ہوتا ہے، ادبی متون کے ایک مابعد جدید ناقد کے لیے ضروری ہے کہ وہ زیرِ مطالعہ متن کے ان تمام فکری و معنوی مقاصد کو کھول کھول کر بیان کر دے کہ جن کو ادب پارے کی تشکیل کے دوران بین السطور کہیں چھپا دیا گیا تھا۔

مابعد جدید ناقد فن پارے کی معنوی قدر کا تعین فن پارے کے ثقافتی، قومی یا مذہبی سیاق و سباق میں اس لیے نہیں کرتا کیوں کہ وہ خود ایسے سیاق و سباق کے تناظرات اور اس کے تضادات سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔ وہ مابعد جدیدیت جو کسی بھی مہابیانیے کی حتمیت کو خاطر میں نہ لاتی ہو، اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا ہے کہ وہ اسی مہابیانیے کو قدر کے تعین کا وسیلہ قرار دے دے۔ اسے اقدار کے تحفظ سے زیادہ اقدار اور مادی زندگی کی حقیقتوں کے درمیان پائے جانے والے فرق اور فاصلے میں دلچسپی ہوتی ہے۔

جب وہ دوسری خواندگی میں زیرِ مطالعہ متن کی معنوی سطح پر دھجیاں اڑا رہا ہوتا ہے اس وقت اس کے پیشِ نظر متن کا داخلی تنوع بھی ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ حقائق سے پردہ پوشی کے لے متن میں فکری سطح پر کن جہات کو داخل کیا گیا ہے؟ اور کیوں؟ واقعیت کی جگہ جھوٹ کی اختراع کیسے کی گئی ہے؟ اور کیوں؟ عبارت کے بعض حصوں کے درمیان متن ربط پیدا کرنے میں کیوں ناکام ہوا؟ اس کی وجوہات کیا تھیں؟ نتائج کی تدوین میں بعض جگہوں پر متن کے مندرجات کو خاطر میں نہیں لایا گیا تو کیوں؟ جن حوالہ جات کو سند کے طور پر متن کے لیے منتخب کیا گیا، ان کے انتخاب کی وجہ کیا تھی؟ یہ تمام ایسے سوالات ہیں جو ہمیشہ مابعد جدید ادبی ناقد کے پیشِ نظر رہتے رہے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات میں وہ اپنے معانی داخل نہیں کرتا بلکہ خود متن میں ان تمام کے جوابات موجود ہوتے ہیں۔ یوں وہ متن کی واحد معنوی تفہیم کو بھی توڑ دیتا ہے کہ جس کی پذیرائی کسی نسل، قوم، تہذیب یا ہم مذہبوں میں شد و مد کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔

جہاں تک اردو تنقید کا معاملہ ہے تو وہ ابھی تک جدیدیت کی مہابیانیوں سے مملو طرزِ تنقید سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس کی اپنی جغرافیائی، معاشی اور سیاسی وجوہات بھی ہیں۔ مابعد جدیدیت کے ایک لازمی سیکٹر یعنی صارفی معاشرہ ہونے کے باوجود اب بھی اردو تنقید نظریات کے جکڑ بند اور فرسودہ فکری ماڈلوں کی نام نہاد سچائیوں کے جال میں الجھی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو تنقید زندہ زندگی سے مربوط ہونے کی بجائے نظریاتی قیاسات اور خیال آرائیوں میں بری طرح پھنسی ہوئی ہے۔ تاہم ڈی کنسٹرکشن اور اس کے طریقہ کار کو سمجھنے کے لیے راقم کی کتاب ”فکرِ اقبال کا المیہ“ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

افشاں کرن

اوڈیسی اور اُردو داستانوں میں مماثلت کا جائزہ

اوڈیسی یونان کی قدیم ترین زرمیہ داستانوں میں سے ایک ہے دنیا کے ادب العالیہ میں اس کا شمار کیا جاتا ہے اوڈیسی ہومر کی تصنیف مانی جاتی ہے ہومر کے بارے میں اب تک یہ ہی معلومات ملی ہیں کہ وہ ایک نابینا گویا اور انتہائی غریب شخص تھا۔ ابن حنیف ہومر کے بارے میں ان الفاظ میں لکھتا ہے:

> ”بعض محققین کے خیال میں ہومر بارہویں صدی ق۔ م اور بعض کے نزدیک وہ نویں صدی ق۔ م میں پیدا ہوا جب کہ کچھ محقق اس کی پیدائش کو ساتویں صدی ق۔ م مانتے ہیں۔ عظیم رزمیہ الیڈ اور اوڈیسی کو ہومر سے منسوب کیا جاتا ہے۔“(۱)

ہومر کون تھا؟ اس کے بارے میں بہت سی تحقیق کی گئی اور اب بھی جاری ہے مگر اس سوال کا مستند جواب ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا ان تمام باتوں کے باوجود ”اوڈیسی“ کو ہومر کی تصنیف ہی تسلیم کیا جاتا ہے یونان میں ہومر کی سوانح عمریاں لکھی گئیں مگر خود یونانی اس کے متعلق کوئی مدلل بات نہیں جانتے۔

اوڈیسی ہومر کی شاہکار تصنیف ہے اس کی اہمیت تمام محققین اور ناقدین جانتے ہیں یہ ایک رزمیہ نظم ہے جس میں ٹرائے کی جنگ سے واپسی پر یونانی سورماؤں میں سے ایک اوڈیسیوس کا ذکر ہے اس نظم کا پہلا حوالہ ۵۵۰ ق۔ م میں ملا اس زمانے میں یونان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا اور ان میں سے کچھ حکمرانوں کا فیصلہ تھا آتھینس پر پسستراتوس کی حکومت تھی۔ اس نے شہریوں کی فلاح و بہبود کے بہت سے کام کیے اسی کے دور میں ”پان آتھینسی“ نامی تہوار منایا جاتا تھا اور اس تہوار کے دن ایک عظیم جلوس اتھینہ دیوی کے مندر جاتا تھا جہاں ہومر کی نظمیں بلند آواز میں پڑھی جاتی تھیں اوڈیسی ۱۲۰۰۰ اشعار پر مشتمل ہے اس میں بہادر اور بے شمار صلاحیتوں کے مالک اوڈیسیوس کی کہانی بیان کی گئی ہے اس کی جلاوطنی اور بے شمار صعوبتوں کا بیان موجود ہے اور اوڈیسیوس تدبر کا نمونہ، مردانہ وجاہت کا پیکر اور مکروفریب میں ماہر کردار ہے اس میں اس کے بیس سالہ سفر اور آزمائشوں سے نبرد آزما ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔

اوڈیسیوس لیڈیز اور انٹی کلیعا کا بیٹا تھا اور جزیرہ اتھاکا کا حکمران تھا یہ بھی ہیلن (اسپارٹا کی شہزادی) کے دعویداروں میں سے تھا مگر مایوس ہو کر پینی لوپی سے شادی کر لی جب پیری ہیلن کو اغوا کر کے ٹرائے لے گیا تو اوڈیسیوس نے ہیلن کی بازیابی کی مہم میں دوسرے یونانی شہزادوں کا ساتھ دیا جنگ ٹرائے سے واپسی کے سفر کا بیان ”اوڈیسی“ میں موجود ہے یعنی اوڈیسیوس کی واپسی کے سفر کا بیان ”اوڈیسی“ کہلاتی ہے جنگ ٹرائے سے واپسی پر وہ افریقہ کے ساحل پر جا نکلا اور غم بھلانے والے پھل (کنول) خوروں کی سر زمین پر گیا اور ایک آنکھ

والے دیو (پولی فیمس) کی ایک آنکھ پھوڑ کر مشکل سے بچ نکلا۔

اس پوری کہانی میں مہم جوئی اور آزمائشوں کا بیان ہے جادوگرنی کے چنگل سے نکلنے، ہمیشہ زندہ رہنے والی دیویوں کا ذکر بھی اس میں ملتا ہے۔ سمندری سفر کی تمام مشکلات اس میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ مختصراً زندگی کے تارچڑھاؤ اور ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی جدوجہد اس میں موجود ہے۔

اسکلا نامی بلا جس کے چھ سر اور بارہ بازو جو ہر وقت ہوا میں لٹکتے رہتے ہیں اس کی پراسراریت کا بہترین خاکہ کھینچا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی نظم ہے جس پر منظوم داستان کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ اس میں دیوی، دیوتا فوق الفطرت عناصر ہمیں جا بجا ملتے ہیں عمدہ کردارنگاری اور منظر نگاری کی گئی ہے داستان کے تمام اجزا اس میں ہمیں واضح نظر آتے ہیں۔

اوڈیسی نظم کا محمد سلیم الرحمٰن نے اس کا اردو نثری ترجمہ ۱۹۶۴ء میں کیا۔ اس کے بعد ہی اردو کا قاری اوڈیسی سے متعارف ہوا۔ اس کا نثری ترجمہ ''جہاں گرد کی واپسی'' کے نام سے کیا گیا۔ اوڈیسی اور اردو داستانوں میں ہمیں مماثلت نظر آتی ہے کیوں کہ فوق الفطرت عناصر، مہم جوئی اور سفر کی مشکلات کے بارے میں ذکر ان میں یکساں ہے۔

اردو میں جو داستانیں لکھی گئیں وہ عربی اور فارسی ادب سے آئی ہیں اور چند منظوم داستانیں طبع زاد ہیں۔ ہندوستانی ادب پر یونانی ادب کے کچھ اثرات ضرور پائے جاتے ہیں، ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''یونان اور ہندوستان کی بعض حکایات مطابقت کی حد تک یکساں ہیں جس سے یہ یقینی
> ہو جاتا ہے موجد کون ہے مقلد کون اس سوال نے محققین کو دو فرقوں میں بانٹ دیا ہے
> یہ خیال صحیح نہیں کہ سکندر کے حملے سے پہلے اہل مغرب ہندوستان سے واقف نہ تھے وہ
> وسطِ ہند کے بارے میں نہ جانتے ہوں لیکن وادی سندھ سے ضرور خبر دار تھے۔
> یونانیوں اور ہندوستانیوں کا سنگم ایشیائے کوچک تھا جہاں تہذیب کے ساتھ ساتھ
> کہانیوں کا بھی لین دین ہوتا تھا۔'' (۲)

داستانوں میں چند باتیں یا اجزا مشترک ہوتے ہیں مگر ان میں جو تہذیب یا ثقافت نظر آتی ہے وہ اپنی زبان، ملک اور قوم کی نمائندگی کرتی ہے۔ اساطیر بھی ان میں موجود ہوتے ہیں، اردو داستانوں کے اجزائے ترکیبی چاہے وہ منظوم ہوں یا نثری ایک ہی ہیں جب کہ ان میں پلاٹ، جزئیات نگاری، محرکات نگاری کا فرق ہوتا ہے اور کرداروں میں تفاوت پائی جاتی ہے۔

اردو داستانیں عربی، سنسکرت اور فارسی کا ترجمہ ہیں ان میں بھی ان تمام عناصر کی کارفرمائی ہے جو عالمی ادب کی داستانوں میں موجود ہیں۔ میر امّن کی تصنیف ''باغ و بہار'' اور شاہ عالم آفتاب کی تصنیف ''عجائب القصص'' ان دونوں داستانوں اور اوڈیسی میں چند مماثلتیں ہیں، عجائب القصص شمالی ہند میں لکھی گئی بہترین داستان ہے۔ تبسم کاشمیری عجائب القصص کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "شاہ عالم ثانی فورٹ ولیم کالج سے پہلے نثر میں داستان گوئی کا وہ اسلوب دریافت کر چکا تھا جہاں ہیئت، معنی اور مفہوم کی ایک جان دار اکائی جنم لیتی ہے، جہاں بڑے بڑے بھاری لفظ لڑھکائے نہیں جاتے بل کہ وہ دوسرے لفظوں سے مل کر ایک صاف ستھری تمثال یا خیال کی صورت بناتے ہیں۔"(۳)

عجائب القصص کا اسلوب بھی باغ و بہار کی طرح رواں، شستہ ہے، مشکل اور ثقیل الفاظ استعمال نہیں کیے گئے اس کو پڑھتے ہوئے قاری بوجھل پن یا اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ اس میں داستان کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ اس میں اور اوڈیسی میں چند عناصر مشترک نظر آتے ہیں۔

اوڈیسی کی طرح "عجائب القصص" میں بھی داستان کا ہیرو شجاع الشمس عشق کی مہم سر کرنے کے لیے روم کی طرف سفر کرتا ہے اور راستے میں بحری جہاز ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ داستان کے اس حصے پر اوڈیسی کے اثرات یا جھلکیاں واضح نظر آتی ہیں اوڈیسی میں اوڈسیوس کی کشتی کی تباہی کی منظر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> "زیوس (دیوتا) نے ایک سیاہ بدلی کو جہاز کے اوپر لا کر بٹھا دیا اس کے سائے سے سمندر پر اندھیرا پھیل گیا جہاز ذرا آگے بڑھا تھا کہ اچانک پچھم سے چنگھاڑتی ہوئی ہوائیں چلنے لگیں اور ان کے طوفانی تھپڑوں سے مستول کو سہارا دینے والی رسیاں ٹوٹ گئیں وہ گرا تو اسکی بلیوں رسیوں اور بادبان کا جہاز کے افقی حصے میں ڈھیر ہو گیا خود مستول سکان گر کے سر پر گرا اور اسکی کھوپڑی چور چور ہو گئی۔ اسی وقت زیوس نے بجلی گرائی۔ بجلی کی چمک سے جہاز کی چول چول ہل گئی اور ہر طرف گندھک پھیل گئی۔ اس دوران اوڈسیوس کبھی ادھر کبھی ادھر دوڑتا آخر ایک بڑی موج آئی اور اس نے جہاز کا ڈھانچا پیندے سے جدا کر دیا تختوں سے الگ ہو کر پیندا موجوں کے ساتھ بہ گیا۔"
> (۴)

اس اقتباس پر غور کریں تو سمندری طوفان کا اندازہ ہوتا ہے جو زیوس (دیوتا) نے چلایا اور اوڈسیوس کو سزا دی کیوں کہ اسکے ساتھیوں نے سورج دیوتا کی بھیڑیں کاٹ کر کھائی تھیں۔ یہ اوڈیسی کے سمندری طوفان کی جھلک تھی بالکل ایسے ہی "عجائب القصص" میں بھی شہزادہ شجاع الشمس بھی سمندری طوفان کا سامنا کرتا ہے:

> "ایک روز قدرت کاملہ الٰہی سے باد مخالف شروع ہوئی کہ جس کے صدمے سے ہر ایک جہاز چھوٹے بڑے تہ و بالا ہونے لگے ---- جتنے جہاز تھے آپس میں ٹکرا کر تختہ تختہ علیحدہ ہوئے جتنے اشخاص تھے مع اجناس غرق دریا ہوئے بادشا زادہ اور اختر سعید ایک تختے پر بہتے ہوئے چلے جاتے تھے۔"(۵)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اوڈیسی کے اوڈسیوس کی طرح "عجائب القصص" کے شہزادہ اور وزیر پر بھی سمندری طوفان سے نقصان اٹھاتے ہیں اور آخر میں دونوں تختے پر بہتے چلے جاتے ہیں جیسے اوڈسیوس اپنے

ساتھیوں کو گنوا کر اکیلا تختے پر بہتا چلا گیا تھا اور بچ نکلا تھا۔

ان دونوں اقتباسات میں طوفان کی وجہ بھی مختلف ہے جو اپنی اپنی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے اوڈیسی میں طوفان کا عاباعث زیوس دیوتا تھا اور وہ اپنی آج سے ۴ ہزار سال پرانی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے جب کہ عجائب القصص میں شہزادہ اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ٹھہراتا ہے کہ اللہ کے حکم سے وہ طوفان چلنا شروع ہوا اب یہاں دو تہذیبوں کے عقائد کی تبدیلی یا اختلاف ہم واضح دیکھ سکتے ہیں کہ چند باتوں کو تبدیل کرنا ممکن نہ تھا وہ اپنی تہذیب کے عقائد کے مطابق ہی رکھی گئیں ہیں۔

فوق الفطرت عناصر داستان کا لازمی جزو ہوتے ہیں اور اوڈیسی میں بھی موجود ہیں یعنی کہ آج سے ہزاروں سال پہلے لکھی جانے والی اوڈیسی میں موجود ہونا اور بعد میں آنے والی داستانوں میں ان کی موجودگی اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ ان کے اثرات ہزاروں سال بعد بھی پائے جاتے ہیں داستانوں میں ان کا اہم کردار ہوتا ہے کہانی کو آگے بڑھانے اور کشمکش، دلچسپی پیدا کرنے میں یہ عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اوڈیسی میں جہاں دیوی دیوتاؤں کا بیان ہے اور انکے ظلم و کرم انسانوں پر ہیں بالکل ویسے ہی بلاؤں اور جادوگرنیوں کا ذکر بھی اس میں موجود ہے کرکی جادوگرنی کے جادو کے بارے میں اوڈیسی میں ان الفاظ میں لکھا گیا ہے۔

> ”کرکی نے انہیں دلان میں لے جا کر کرسیوں اور چٹائیوں پر بٹھایا پھر اس نے ان کے لیے پنیر، جو اور زرد شہد کا جسے پرامنوسی شراب ملا کر ذائقہ دار بنایا گیا تھا آمیختہ تیار کیا مگر اس میں بہت پُراثر دوا بھی ملا دی تاکہ اس کی تاثیر سے وہ اپنا وطن فراموش کر دیں جب انھوں نے اس کے پیش کیے ہوئے پیالے خالی کر دیے تو اس نے انہیں اپنی چھڑی سے چھوا اور فوراً وہ ہو بہو سؤر بن گئے۔ ان کے سُوروں جیسے سر اور سخت بال نکل آئے اور وہ غرانے لگے مگر ان کی سمجھ بوجھ اس کایا پلٹ سے جیسی پہلے تھی ویسی ہی رہی اس لیے جب کرکی نے انہیں ہانک کر باڑوں میں بند کر دیا تو وہ آنسو بہانے لگے۔ “(٦)

ان داستانوں میں موجود جادوگرنیوں کے ظلم و ستم کی طرح مشابہت ہے اور یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے اردو داستانوں میں فوق الفطرت عناصر کا ذکر ہمیں ملتا ہے قاری ان انوکھے اور عجیب و غریب کرداروں کے بارے میں پڑھ کر حیرت زدہ ہو جاتا ہے ”عجائب القصص“ میں بھی دیو اور فوق الفطرت عناصر کا ذکر ہے شہزادہ شجاع الشمس اور وزیر زادہ اختر سعید سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو راستے میں ایک جزیرہ آتا ہے شجاع الشمس اس جزیرے پر جاتا ہے تو انہیں وہاں ایک دیو نظر آتا ہے جس نے پری کو قید کر رکھا ہوتا ہے اور جادو کی مدد سے عجب مدہوشی کی نیند سلایا ہوتا ہے دیو کی شکل و صورت بہت عجیب و غریب تحریر کی گئی ہے اس دیو کے جادو اور انوکھے طریقے کے بارے میں ”عجائب القصص“ میں لکھا ہے:

> ”یہ چھپر کھٹ جو مرصع تھا وہاں ایک عورت دوشالہ اوڑھے ہوئی تھی اس کے سرہانے

> ایک چھڑی دیو نے اٹھا کر پائنتی رکھی اور چھڑی پائنتی کی اٹھا کر سرہانے رکھی بہ مجرد اس حرکت کے وہ عورت (پری) کلمہ پڑھ کر اٹھ بیٹھی۔" (۷)

اس داستان میں دیو کی انوکھی حرکت سے یعنی چھڑی رکھنے اور بدلنے سے وہ عورت (پری) مدہوشی کی نیند سے بیدار ہو جاتی ہے یہ سب جادو کا کمال تھا بالکل ایسے ہی جیسے "جہاں گرد کی واپسی" میں کرکی کے جادو سے اورسیوس کے ساتھی سُور بن گئے تھے۔ "باغ و بہار" میں بھی فوق الفطرت عناصر موجود ہیں جا بجا ان دیکھی مخلوقات کا ذکر ہے باغ و بہار کے چوتھے درویش کی کہانی میں اس کا ذکر موجود ہے جب شہزادہ اور اس کا دادا (باپ کا دوست) اسے لیکر جنوں کے سردار کے پاس جاتا ہے تو ان کے درمیان یہ مکالمہ ہوتا ہے:

> "ایک روز رات کو چلے جاتے تھے جو مبارک بولا کہ شکر خدا کا اب منزل مقصود پر پہنچے میں نے سن کر کہا دادا! یہ تو نے کیا کہا؟ کہنے لگا اے شہزادے جنوں کا لشکر کیا نہیں دیکھتا؟ میں نے کہا" مجھے تیرے سوا کچھ نظر نہیں آتا مبارک نے ایک سرمہ دانی نکالی اور سلیمانی سرمہ کی سلائیاں میری دونوں آنکھوں میں پھیر دیں وہیں جنوں کی خلقت اور لشکر کی تنبوقنات نظر آنے لگیں لیکن سب خوش رو اور خوش لباس۔" (۸)

باغ و بہار میں فوق الفطرت عناصر کی بہتات یا کثرت نہیں ہے صرف پانچویں حکایت اور چوتھے درویش کی کہانی میں ان کا ذکر موجود ہے یہ میر امّن کی خوبی ہے کہ انھوں نے ان مخلوقات کا ذکر صرف کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے کیا ہے نہ کہ اسے مزید الجھانے کے لیے۔

تلاش، جستجو اور سفر بھی داستانوں کا اہم ترین اور اولین جزو رہا ہے کیوں کہ سفر کسی چیز کی تلاش کے لیے داستانوں میں دکھایا جاتا ہے۔ اوڈیسی میں بھی ہیرو گھر کے لیے سفر کرتا ہے، راستے میں آنے والی تمام مصیبتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے اورسیوس اپنے گھر، بیٹے اور بیوی کے لیے پریشان ہو کر ان سے ملنے اور گھر پہنچنے کے لیے ہر طرح کی مشکل سے لڑتا ہے۔ اوڈیسی میں اس کی تلاش اور جستجو کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

> "میں گھر جانے کا آرزومند ہوں مجھے اس خوشی کے دن انتظار رہے گا جب وہاں پہنچ جاؤں میری یہ تمنا ہمیشہ برقرار رہے گی اگر آسمانی طاقتیں میری کشتی کو دور سیاہ فام سمندر پر برباد کر دیں تو کیا پرواہ ہے! میرا دل جفاؤں کا خوگر ہو گیا ہے میں اسے کڑا کر کے یہ بھی سہہ لوں گا۔" (۹)

اودسیوس اپنے گھر ہر قیمت پر واپس جانا چاہتا ہے اور یہ بہت ضروری تھا کیوں کہ وہ ایک بہادر شخص تھا اس کا مقصد تلاش اور سفر اکٹھے تھے وہ ایک خاص مقصد کے تحت ہر بلا اور آفت سے لڑنے کو تیار تھا "باغ و بہار" میں بھی چہار درویش سفر کرتے ہیں مگر ان سب کے سفر کا مقصد مختلف تھا کسی کا مقصد اپنے عشق کی تکمیل ہے کسی کا مقصد دولت حاصل کرنا تھا ہر زبان کے ادب میں داستان کی صنف میں ہمیں سفر اور تلاش کا عنصر واضح نظر آتا ہے۔

باغ و بہار میں پہلا درویش بہن کے کہنے پر تجارت کے لیے سفر کرتا ہے چوتھے درویش کی سرگزشت میں جب درویش اپنے منہ بولے چچا کے ساتھ جنوں کے بادشاہ کے پاس آتا ہے تا کہ وہ اسکی مدد کریں تو جنوں کا سردار (ملک صادق) اسکی مدد کچھ ان شرائط پر کرنے کو تیار ہوتا ہے:

> ”ایک کام ہمارا ہے اگر وہ اس سے ہو سکا اور خیانت نہ کی اور بہ خوبی انجام دیا اور اس امتحان میں پورا اترا تو میں قول قرار کرتا ہوں کہ زیادہ بادشاہ سے سلوک کروں گا اور جو یہ چاہے گا سو وہ دوں گا۔“(۱۰)

تلاش سفر کے عناصر جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ داستان کے خاص جزو ہوتے ہیں اردو داستانوں میں کہانی آگے ہی انکی مدد سے بڑھتی ہے ہیرو کسی نہ کسی چیز کی تلاش میں سفر ضرور کرتا ہے اور پھر اس کے دوران اسے خیر و شر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

”عجائب القصص“ میں بھی ہمیں تلاش کے لیے سفر کرتا ہوا ہیرو نظر آتا ہے شہزادہ شجاع الشمس خواب میں ایک خوبصورت شہزادی ملک نگار کو دیکھتا ہے اور اسے ڈھونڈنے کے لیے سفر کا ارادہ کرتا ہے وہ اس کے حسن سے بہت متاثر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے عجائب القصص میں تلاش کا مقصد عشق مجازی ہے اس سفر کے دوران شہزادہ بہت سی مہمات سر کرتا ہوا وہاں پہنچتا ہے راستے میں شیطانی قوتوں سے لڑتا ہے مگر پھر بھی اس کا حوصلہ بلند رہتا ہے وہ بیچ سفر سے واپسی کا ارادہ بالکل بھی نہیں کرتا بل کہ ہر مصیبت کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔

داستانوں میں ہمیں تہذیب کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں جس دور کی کہانی ہوتی ہے اس دور میں اس ملک کی تہذیب ہمیں اس میں محسوس ہوتی ہے کھانے پینے تعمیرات اور روزمرہ استعمال کی چیزوں سے اس کی جھلک نظر آتی ہے داستانوں کے ذریعے بھی کسی قوم کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے اوڈیسی میں ہمیں آج سے تین ہزار سال پہلے کے لوگوں کا طرز بود و باش کا پتا چلتا ہے تہذیب کی عکاسی اوڈیسی میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> ”ایک باندی خوبصورت سنہرے جگ میں پانی لائی اور نیچے چاندی کی چلمچی رکھ کر انکے ہاتھ دھلوائے اور ایک چوبی میز ان کے سامنے لگا دی نان اور کسی قسم کے لذیذ کھانے بڑی فراخدلی سے حاضر کر دیے۔ اسی اثناء میں گوشت کاٹنے والا اپنے بڑے پرے مختلف قسم کی بوٹیاں چن کر رکابیوں میں لایا اور انکے سامنے لگا گیا اور سونے کے پیالے بھی رکھ دیے۔“(۱۱)

اس اقتباس سے پتا چلتا ہے کہ اس دور میں کھانا کھانے کے آداب کیا تھے کس طریقے سے کھانا دیا جاتا تھا اور ان کے ظروف کس طرح کے تھے اس سے آج سے تین ہزار سال پہلے کے یونانیوں کی تہذیب کی عکاسی ہوتی ہے۔

برصغیر میں لکھی جانے والی داستانوں میں بھی مغلیہ عہد کی تہذیب نظر آتی ہے بادشاہوں، شہزادوں،

شہزادیوں کی پُرآسائش زندگی کے بارے میں ہمیں پتا چلتا ہے "باغ و بہار" میں بھی تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے:

> "باورچی خانے میں دیگیں ٹھنٹھنا رہی ہیں آبدار خانے کی ویسی ہی تیاری ہے کوری کوری ٹھلیاں روپے کی گھڑونچیوں پر صافیوں سے بندھیں ،جھجروں سے ڈھکی رکھی ہیں آگے چوکی پر ڈونگے ،کٹورے بمعہ تھالی ،سرپوش دھرے ،برف کی آبخورے لگ رہے ہیں اور شوربے کی صرائیاں ہل رہی ہیں۔"(۱۲)

بہت سے مورخین کے ادب میں موجود تہذیبوں کے بیان سے بہت سی باتوں اور حقائق کا پتا چلتا ہے کھانے پینے ،آداب معاشرت کا بیان غیر شعوری طور پر داستان میں لکھتے ہوئے آجاتا ہے کیوں کہ داستان میں تخیل اور فوق الفطرت عناصر ہونے کے باوجود مبنی حقائق بھی نظر آتے ہیں اور اس کے بنیادی کردار انسان ہوتے ہیں۔

عجائب القصص میں بھی ہمیں تہذیبی عناصر ملتے ہیں وہ چوں کہ ایک بادشاہ کی تصنیف ہے اور انھوں نے اس میں بادشاہوں کی امراء کی زندگی کو مزید تفصیل سے لکھا ہے ان کے ہاں جزئیات نگاری ہمیں ملتی ہے اس دور کے رسم و رواج کو بھی بیان کیا ہے پیدائش و وفات کی رسوم کو بھی نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے عجائب القصص میں ان الفاظ میں تحریر ہے کہ:

> "چوکی صندل کی بچھا کر غسل چھٹی کا بادشاہ زادی نے کیا اور خلعت فاخرہ گراں بہا مع جواہر بیش قیمت کہ ہر ایک رقم اس کا خراج یک سالہ کشور چین کا تھا بادشاہ زادی نے پہنایا بادشاہ زادے کے تئیں بھی غسل چھٹی کا دے کر پوشاک زیبائے چینی رومی کہ اس کی قیمت سات لاکھ اور بیس ہزار روپے تھی پہنائی اور جواہر مثل لڑی و لٹکن و سرپیچ مرصع اور جیغہ اور نورتن کہ ہر ایک عدد اپنی قیمت میں بیست بیست لاکھ روپے کا تھا زیب جسم بادشاہ زادے کا ہوا۔"(۱۳)

تینوں داستانوں میں ہمیں تہذیب رسوم و رواج ،طرز زبود و باش نظر آتی ہے یہی وجہ ہے کہ ادب میں تہذیب کسی بھی قوم کی پہچان ہوتی ہے۔

بہت سی تفصیلات جزوئیات کی بدولت ہمیں ادب میں مل جاتی ہیں تہذیب کے علاوہ مذہب سے لگاؤ اور مذہبی رسوم کا ذکر بھی داستانوں میں ہوتا ہے اوڈیسی میں بہت زیادہ دیوی، دیوتا کو نذرا اور صدقہ نیاز وغیرہ پیش کرنے کا بیان ہے دیوی، دیوتاؤں کو خوش کرنے ،مصیبتوں کو دور کرنے کی بدولت یونانیوں میں نذر، نیاز کا رواج عام تھا وہ مذہب سے گہرا لگاؤ یا نسبت رکھتے تھے عبادت کا تصور اس دور کے انسان میں بھی موجود تھا اوڈیسی میں نذر و غیرہ دینے اور مذہبی رسومات کی ادائیگی کا ذکر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ایک مذہبی رسم کا بیان ان الفاظ میں ہے:

> "تیستور نے چمکیلا پانی چھڑک کر اور جو بکھیر کر رسم کا افتتاح کیا پھر بچھیا کے سر سے

> بالوں کی لٹ کاٹ کر آگ میں پھینکتے ہوئے اتھینہ سے گڑگڑا کر دعا مانگی جب وہ دعائیں مانگ چکا اور جو بکھیر چکا تو تھراسمید لیس بن یستور نے مردانہ وار آگے بڑھ کر کلہاڑا چلایا۔"(۱۴)

اوڈیسی میں دیوی، دیوتاؤں کو جانور کے عمدہ حصے کا گوشت خون اور قطرات مے دینے کے بارے میں بتایا گیا ہے جس سے ان کے مذہبی امور ان کی تہذیب وغیرہ کا پتا چلتا ہے اسی طرح اردو داستانوں میں بھی صدقہ اور مذہب کا بیان موجود ہے جس سے ایک مسلمان اور انکے عقیدے کا پتا چلتا ہے۔ "باغ و بہار" میں بھی صدقہ وغیرہ دینے کا ذکر موجود ہے یہاں اس سطح پر بھی اوڈیسی اور اس میں مماثلت ہے مذہب سے لگاؤ اس داستان کے کرداروں میں بھی ہے اور وہ مشکل وقت میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور مشکلات کو ٹالنے کے لیے صدقہ دیتے ہیں۔

پہلے درویش کی سیر میں جب بھائی اپنے تمام رشتہ داروں سے دور بہن کے گھر جاتا ہے تو اس کی بہن بھی اس کا صدقہ دیتی ہے اس کو میر امن ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

> "ہمشیرہ کے گھر گیا وہ ماجائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی، تیل ماش اور کالے ٹکے مجھ پر سے صدقے کیے۔"(۱۵)

صدقہ کا تصور مذہب اسلام میں ہے مشکلات، مصائب وغیرہ سے محفوظ رہنے کے لیے صدقہ دیا جاتا ہے۔ یہاں صدقہ دینے والی اشیا مثلاً تیل، ماش وغیرہ اپنی تہذیب، مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں جب کہ اوڈیسی میں گوشت، خون اور مے کے قطرات صدقہ، نیاز کیے جانے کا ذکر ہے۔

داستانوں میں غیبی امداد کا بھی بہت ذکر ہوتا ہے کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے اور انسان کو مشکل ترین حالات سے نکالنے کے لیے غیبی امداد کا استعمال کیا جاتا ہے انسان کی قوتیں اور عقل جب ختم ہو جاتی ہے تو برے حالات سے نکالنے کے لیے غیبی مدد آتی ہے اردو داستانوں اور اوڈیسی میں یہاں بھی مماثلت پائی جاتی ہے "اوڈیسی میں اتھینہ دیوی، اوڈیسیوس کی مدد کرتی ہے جب اس کی عقل اور جسمانی قوت بے بس ہو جاتی ہے اوڈیسی کے آثار ہمیں اردو داستانوں میں بھی نظر آتے ہیں مگر ان میں دیوی کی بجائے کوئی برقع پوش کوئی بزرگ مرکزی کرداروں کی مدد کرتے ہوئے دکھائے جاتے ہیں اتھینہ، اوڈیسیوس کے گھر پہنچنے کے دوران ہر مشکل مرحلے میں اس کی مدد کرتی ہے جب وہ گھر پہنچتا ہے تو خواسگاروں کے ہاتھوں قتل ہونے کے ڈر سے اتھینہ اس کی شکل و صورت بدل دیتی ہے اور اس کی مدد کرتی ہے۔ اتھینہ نے جواب دیا:

> "میں سچ مچ تمھاری مدد کرونگی لڑائی کا وقت آنے دو میں تمھیں بھولوں گی نہیں۔ میں تمھاری شکل اس طرح بدل دیتی ہوں کہ کوئی شناخت نہ کر سکے۔"(۱۶)

اوڈیسیوس کے گھر پہنچنے کے پیچھے اتھینہ دیوی کی مدد بھی شامل ہے جو وقتاً فوقتاً اسے مسائل سے آگاہ کرتی رہی اور اس کی مدد کرتی ہے ہماری اردو کی داستان "باغ و بہار" میں بھی غیبی امداد کا امیدوار ہر دور کا انسان رہا

ہے چاہے وہ اوڈیسی کے دور کا ہو یا برصغیر کی داستانوں کا کردار رہو انسان کی سکت جب ختم ہو جاتی ہے یا اسکی عقل پر بند بندھ جاتے ہیں تو وہ ایک خاص اور عالی ہستی سے امید کرتا ہے جو اس کی مدد کرے اور مصائب سے نکالے باغ و بہار کے چوتھے درویش کی سرگزشت میں غیبی امداد کا بیان موجود ہے:

> ''وہی سوار صاحب ذوالفقار برقع پوش آپہنچا اور بولا کیوں تو اپنی جان کھوتا ہے آدمی پر دکھ درد سب ہوتا ہے۔۔۔تین شخص ایسے ہی آگے گئے ہیں ان سے ملاقات کر اور وہاں کے سلطان سے مل تم پانچوں کا مطلب ایک ہی جگہ ملے گا۔''(۱۷)

باغ و بہار میں برقع پوش مدد کرتا ہے جب کہ اوڈیسی میں اتھینہ دیوی مدد کرتی ہے ان دونوں کا مقصد ایک ہے مگر کردار اپنی اپنی تہذیب، مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں ''عجائب القصص'' میں بھی غیبی امداد کا ذکر ہے جب آسمان پری شجاع الشمس کو لے کر گلفام پری کے پاس جاتی ہے اور وہ اسے طلسمی صندوقچہ اور ایک چھڑی دیتی ہے اس طلسمی چھڑی کے خواص بتائی ہے اور صندوقچہ کی اہمیت بھی بتائی ہے۔

عجائب القصص میں گلفام پری چھڑی کے خواص یہ بتاتی ہے:

> ''اور یہ جو چھڑی بید سبز کی ہے اس کا خواص یہ ہے کہ جہاں ہزاروں جادوگر قوت سے اپنے جادو کی مینہ آگ کا یا پتھروں کا برساتے ہوں اور کسی طور نجات نہ ہو پس اس وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم زبان پر لا کر ایک حلقہ زمین پر نوک سے کھینچ کر اس حلقے میں جا بیٹھے آتش، جادو سرد ہو جاوے اور پتھر برستے وہیں موقوف ہوں۔''(۱۸)

غیبی امداد کا تصور تینوں داستانوں میں موجود ہے اس امداد کی بدولت ہی کہانی آگے بڑھتی ہے اور مزید واقعات سامنے آتے ہیں جہاں اس امداد کا آنا ختم ہو جائے کہانی یا داستان وہیں ختم ہو جاتی ہے، داستانوں میں غیبی امداد کا ایک خاص مقام اور اہمیت ہے۔

اساطیر کا استعمال بھی اوڈیسی میں کیا گیا ہے اور اُردو داستانوں میں بھی اساطیر موجود ہیں۔''باغ و بہار'' عجائب القصص'' میں بھی اساطیر پائے جاتے ہیں۔ اساطیر کیا ہوتے ہیں؟ اس کے معنی بہت سی لغات میں موجود ہیں فیروز اللغات میں اساطیر، اسطورہ کی جمع بتایا گیا ہے یا قصے کہانیاں کہا گیا ہے۔(۱۹) یہ لفظ یونانی زبان سے لیا گیا ہے وہ کہانی جس میں دیوی، دیوتا کے بارے میں بیان کیا گیا ہو وہ اسطور کہلاتی ہے اس کی کئی اقسام ہوتی ہیں اساطیر کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''اسطور یا متھ یونانی زبان کے لفظ مائی تھوس سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی ہے وہ بات جو زبان سے ادا کی ہو یعنی کوئی قصہ یا کہانی کی تخصیص کر دی گئی یوں کہ اسطور اس کہانی کا نام پایا جو دیوتاؤں کے کارناموں سے متعلق تھی یا ان شخصیتوں کی مہمات کو بیان کرتی تھی جو زمین پر دیوتاؤں کی نمائندہ تھیں۔''(۲۰)

داستانوں پر اساطیری رنگ غالب ہوتا ہے اوڈیسی میں بھی اساطیری رنگ موجود ہیں اساطیر بہت سے

موضوعات کو بیان کرتی ہیں اس میں ہمیں یونانی اساطیر ملتے ہیں۔ دیوی، دیوتاؤں کا قہر، مہربانی دونوں اس میں جا بجا موجود ہیں۔ موسمیاتی تغیر فوق الفطرت عناصر، دیوتاؤں کی پیدائش کی اساطیر اس میں موجود ہیں، اوڈیسی میں بادلوں کے سالار زیوس کے قہر کی اساطیر ان الفاظ میں ہیں:

> "بادلوں کے سالار زیوس نے جواب دیا، سورج! فانی انسانوں اور لافانی دیوتاؤں کی خاطر اس زرخیز دنیا پر چمکتے رہو میں ابھی خیرہ کر دینے والی بجلی گرا کر ان مجرموں کے جہاز کو شراب جیسے سیاہ سمندر پر پاش پاش کر دوں گا۔"(۲۱)

اس میں موسمیاتی تغیر کی اساطیر ملتی ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ دیوتاؤں کا غصہ اور غضب شدید موسمیاتی تبدیلیوں کی صورت میں سامنے آتا تھا۔

عجاب القصص میں اور باغ و بہار میں بھی اساطیر موجود ہیں مگر وہ اپنی سرزمین کے ہیں۔ ڈاکٹر قاضی عابد "عجائب القصص" اور اوڈیسی کے اساطیری تعلق کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

> "عجائب القصص" مغل شہزادے جان عالم کی تصنیف ہے اس داستان کا ہیرو شجاع الشمس عشق کی مہم سر کرنے کے لیے روم کی طرف نکلتا ہے راستے میں وہ بلاؤں اور عفریتوں کا شکار ہو جاتا ہے، جہاز ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اس قصے کے اس حصے پر اوڈیسی کی جھلکیاں سی نظر آتی ہیں یہ وہ عناصر ہیں جو ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کی طرف لاشعوری سطح پر سفر کرتے ہیں۔"(۲۲)

اوڈیسی کی مثال یا خود کتابی شکل میں جان عالم کے سامنے نہ تھی مگر اس کے اثرات ہمیں اس تصنیف میں نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کے جس حصے پر بھی موجود تھی اس کے اثرات بلاواسطہ ہندوستان تک پہنچے اور یہاں کے مصنفین نے اس کا اثر قبول کیا۔ "باغ و بہار" جو طبع زاد نہیں بل کہ فارسی کا ترجمہ ہے اس میں بھی برصغیر کی تہذیب کے اساطیر پائے جاتے ہیں اس میں متفرق تہذیبوں کے اساطیر ملتے ہیں خواجہ سگ پرست والے حصے میں کفِ دستِ میدان، قلعہ، ٹیلہ، دروازہ، شہر اور برج سب اساطیری معنویت کے حامل ہیں۔

المیہ بھی داستانوں کا ایک خاص مقصد یا حصہ رہا ہے اوڈیسی ہو یا "باغ و بہار" "عجائب القصص" ان تینوں میں اشتراک المیہ کی بنیاد پر بھی ہے یعنی ان داستانوں میں دکھ، درد اور سانحات رونما ہوتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ یونانی مصنفین نے بھی المیہ کو ادب کا اہم ترین عنصر قرار دیا ہے۔ ارسطو نے اپنی کتاب "بوطیقا" میں اوڈیسی کو المیہ قرار دیا ہے۔

> "اوڈیسی میں بھی بہت سے ایسے ضمنی حصے ہیں جن میں سے ہر ایک جداگانہ عظمت اور وحدت رکھتا ہے۔ اس کی ترتیب ممکنہ حد تک مکمل ہے اور عمل تقریباً واحد ہی ہے۔"(۲۳)

المیہ کی جو تعریف ارسطو نے بیان کی تھی اوڈیسی اس پر پوری اترتی ہے اس کا ہر حصہ یا قصہ اپنے طور پر کامل ہے اس میں کوئی جھول موجود نہیں ہے المیہ کا فائدہ بھی ارسطو نے واضح الفاظ میں بیان کر دیا تھا کہ اس

سے قاری کتھارسس کے عمل سے بھی گزرتا ہے واقعات کے اتار چڑھاؤ سے قاری کے ذہن میں دردمندی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ابن حنیف۔ دنیا کا قدیم ترین ادب (۳۰۰۰ق۔م۔۱۷۵۰ق۔م) کاروان ادب ملتان طبع اول ۱۹۸۲ء ص ۹۔۴۔
۲۔ تبسم کاشمیری۔ ڈاکٹر۔ اردو ادب کی تاریخ (ابتداء سے ۱۸۵۰ء تک) سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور۔ طبع اول ۲۰۰۹ء ص ۴۹۵
۳۔ گیان چند جین۔ ڈاکٹر۔ اردو کی نثری داستانیں۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی طبع دوم ۱۹۶۹ء ص ۳۶۔
۴۔ محمد سلیم الرحمٰن۔ مترجم۔ جہاں گرد کی واپسی مکتبہ جدید۔ لاہور طبع اول ۱۹۶۴ء ص ۲۵۰ تا ۲۵۱۔
۵۔ شاہ عالم۔ ثانی۔ اردو کلاسیکی ادب عجائب القصص مجلس ترقی ادب۔ لاہور۔ ص ۱۰۳
۶۔ محمد سلیم الرحمٰن۔ مترجم۔ جہاں گرد کی واپسی۔ مکتبہ جدید۔ لاہور۔ طبع اول ۱۹۶۴ء ص ۱۹۷ تا ۱۹۸
۷۔ شاہ عالم۔ ثانی۔ اردو کلاسیکی ادب عجائب القصص۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور۔ ص ۹۴
۸۔ ممتاز حسین۔ مرتب۔ باغ و بہار۔ اردو ٹرسٹ کراچی۔ طبع اول ۱۹۰۸ء ص ۲۳۶
۹۔ محمد سلیم الرحمٰن۔ مترجم۔ جہاں گرد کی واپسی۔ مکتبہ جدید۔ لاہور۔ ص ۱۰۴ تا ۱۰۵۔
۱۰۔ رشید حسن۔ صدیقی۔ مرتب۔ باغ و بہار۔ نقوش۔ پبلشرز۔ لاہور۔ طبع اول ۱۹۹۲ء ص ۲۲۵۔
۱۱۔ سلیم الرحمٰن۔ مترجم۔ جہاں گرد کی واپسی۔ مکتبہ جدید۔ لاہورو ص ۲۶، ۲۷۔
۱۲۔ ممتاز حسین۔ مرتب۔ باغ و بہار۔ اردو ٹرسٹ۔ کراچی۔ طبع اول ۱۹۰۸ء ص ۳۰۔
۱۳۔ شاہ عالم۔ ثانی۔ اردو کا کلاسیکی ادب عجائب القصص۔ مجلس ترقی ادب۔ ص ۴۰
۱۴۔ محمد سلیم الرحمٰن۔ مترجم۔ جہاں گرد کی واپسی۔ مکتبہ جدید۔ لاہورو ص ۵۷۔
۱۵۔ ممتاز حسین۔ مرتب۔ باغ و بہار۔ اردو ٹرسٹ کراچی۔ ص ۶۶۔
۱۶۔ محمد سلیم الرحمٰن۔ مترجم۔ جہاں گرد کی واپسی۔ مکتبہ جدید۔ لاہور ص ۲۶۷ تا ۲۶۸۔
۱۷۔ رشید حسن۔ صدیقی۔ مرتب۔ باغ و بہار۔ نقوش۔ پبلشرز۔ لاہور۔ طبع اول ۱۹۹۲ء ص ۲۲۵۔
۱۸۔ شاہ عالم۔ ثانی۔ اردو کا کلاسیکی ادب عجائب القصص۔ مجلس ترقی ادب۔ ص ۲۹۶ تا ۲۹۷۔
۹۱۔ فیروز سنز لیمٹڈ۔ راولپنڈی۔ طبع اول ۲۰۰۵ء ص ۱۹
۲۰۔ وزیر آغا۔ ڈاکٹر۔ تخلیقی عمل۔ مکتبہ اردو زبان۔ سرگودھا۔ بطع اول ۱۹۷۰ء۸ ص ۱۵۔
۲۱۔ محمد سلیم الرحمٰن۔ مترجم۔ جہاں گرد کی واپسی۔ لاہور۔ ص ۲۴۹۔
۲۲۔ قاضی عابد۔ ڈاکٹر۔ اردو افسانہ اور اساطیر۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ طبع اول ۲۰۰۹ء ص ۳۲، ۳۳
۲۳۔ عزیز احمد۔ مترجم۔ ص شاعری 'بوطیقا (Poctics) دردا کادمی شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔ بطع اول ۱۹۶۵ء ص ۱۱۲ تا ۱۱۳۔

☆☆☆☆

ظفر اقبال

کچھ باعثِ تحریر بھی تھا

کہیں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اپنی سوانح لکھنے کی فرمائش مجھ سے سنگِ میل پبلی کیشنز کے مالک ملک نیاز احمد نے کی تھی جو مرحوم ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ان کے اصرار پر لکھنا شروع کی ورنہ میں نہیں سمجھتا کہ میری ادبی زندگی قارئین کے کسی بھی طبقے کے لیے باعث دلچسپی ہو سکتی ہے کیوں کہ میں پوری ایمان داری سے سمجھتا ہوں کہ میں نے اب تک کوئی ایسا قابل فخر کارنامہ سرانجام نہیں دیا جو اس قسم کی کتاب کا جواز ہو سکتا ہو۔

میں کسرِ نفسی سے کام نہیں لے رہا بلکہ امر واقعہ بھی یہی ہے کہ نام نہاد کارگزاری کے بارے میں میری اپنی رائے کو بھی مناسب اہمیت ملنی چاہیے یا کم از کم مجھے اپنے بارے میں حق گوئی کا استحقاق تو حاصل ہونا ہی چاہیے۔

تاہم ایک بات اور بھی ہے جس کا ذکر یہاں ضروری ہے اور وہ ہے میرا ایک طرح کا 'ملامتی رویہ۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں جس کے زیر اثر رہتا ہوں یعنی جو کچھ شاعری وغیرہ کے سلسلے میں مجھ سے سرزد ہو چکا ہے، مجھے اس پر فخر کم اور شرمندگی زیادہ محسوس ہوتی ہے اور میں اپنی تعریف کرنے والوں سے عام طور پر اتفاق نہیں کرتا اور ہمیشہ پچھلی صفوں میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ کوئی بیس، پچیس برس پہلے مجھے بھارت سے ایک سکھ ادیب نے خط لکھا کہ میں آپ کے کلام کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کرنا چاہتا ہوں، مجھے اپنی کتابیں بھجوائیں۔ نمونے کے طور پر موصوف نے ترجمہ کردہ میری کچھ غزلیں بھی بھجوائیں جو کہ بطور خاص بہت عمدہ ترجمے کی مثال تھیں، لیکن مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا بلکہ میں اس کے کسی بھی خط کا جواب تک نہ دے سکا، خطوط کا جواب تو میں ویسے بھی عموماً نہیں دیا کرتا حالانکہ یہ بہت بڑی بدتمیزی ہے، تاہم اس سلسلے میں میرا خیال تھا کہ کتابیں فراہم کرنے کا کام بھی اسے خود کرنا چاہیے کیوں کہ ترجمے کی غرض سے کتابیں بھجوانا بھی کچھ اچھا نہ لگا۔

اس سے چند برس پہلے اوکاڑہ کے نوجوان اور عمدہ شاعر اور افسانہ نگار جاوید مائو میرے پاس آئے اور کہا کہ اقبال صلاح الدین اور میں نے ایک پرچہ نکالنے کی تیاری مکمل کر لی ہے اور اس کا پہلا نمبر آپ کا ہوگا۔ اس لیے آپ اس سلسلے میں تعاون کریں، میں نے کہا، آخر میرا قصور کیا ہے؟! اس نے کہا کہ پرچہ اوکاڑہ سے نکل رہا ہے اور آپ اس شہر کی پہچان ہیں۔ اس لیے میں نے انہیں کہا کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے مرتضیٰ برلاس خانیوال میں ڈپٹی کمشنر تعینات ہوئے اور وہاں سے ان کے فن اور شخصیت کے بارے میں کتاب شائع ہوئی ہے تو میں

نے اس کا مذاق اڑایا تھا کہ اوکاڑہ سے میرا نمبر کیسے نکل سکتا ہے۔ کوئی دس پندرہ روز بعد جاوید مجھے ملا تو بتایا کہ آپ تو رضامند نہیں ہوئے تھے لیکن انھوں نے ایک معروف شاعر اور نقاد کا نام لیتے ہوئے بتایا کہ انھیں اس سلسلے میں خط لکھ کر تعاون کی درخواست کی تو انھوں نے پورے نمبر کا مواد بھیج دیا!

اسی طرح اسلام آباد راولپنڈی کے جریدے ''چہار سُو'' کے ایڈیٹر میرے پیچھے پڑے رہے کہ وہ میرا نمبر نکالنا چاہتے ہیں لیکن میں طرح دے گیا، حتیٰ کہ انھوں نے سید ضمیر جعفری (مرحوم) سے بھی سفارش کروائی جو اس پرچے کے اعزازی مدیر بھی تھے بلکہ برادرم افتخار عارف نے بھی کئی بار فون پر تاکید کی لیکن میں اپنے آپ کو اس پر آمادہ نہ کر سکا۔ اخبارات و جرائد کے مدیر حضرات، یا ادبی صفحے کے انچارج نے متعدد بار انٹرویو کی خواہش ظاہر کی لیکن میں نے معذرت کر دی۔ تاہم کسی نہ کسی حوالے یا بہانے سے کوئی صاحب کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں جب کہ اصولی طور پر میں اس سے کنّی کترانے ہی کی کوشش کرتا ہوں۔ بلکہ ایک مضمون بھی لکھا جس کا عنوان تھا ''انٹرویو سے معذرت''۔ ہو سکتا ہے یہ خود اعتمادی کا فقدان ہی کی کوئی صورت ہو۔

ان حالات میں قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اتنی عمر کو پہنچنے کے باوجود مجھے اپنی نام نہاد سوانح لکھنے کا ایک بار بھی خیال کیوں نہیں آیا۔ اسے تملّق ہرگز نہ سمجھا جائے کیوں کہ مجھے بہرصورت اس پر اصرار ہے کہ شعر و ادب میں میں نے کوئی تیر نہیں مارا، جو لوگ اس کے برعکس خیال کرتے ہیں وہ بے شک میرے ساتھ بحث کریں۔ انھی دنوں میں نے کہیں لکھا تھا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں کسی سہانی صبح کو اٹھوں اور اپنا سارا کلام منسوخ کر دوں۔ بی بی سی پر اس کا خصوصی نوٹس بھی لیا گیا۔ حقیقت یہی ہے کہ جسے میرا کارنامہ سمجھا جاتا ہے میں اسے محض ایک سعی کا ناکام و نا تمام گردانتا ہوں اور یہ بات میں آج نہیں کہہ رہا بلکہ میرے بیانات میں بھی میرا موقف روز اول سے یہی رہا ہے بلکہ میں نے اپنی متعدد کتابوں کے جو فلیپ لکھے ہیں اس کی کسی حد تک گواہی وہ بھی دیں گے جب کہ میری ایک کتاب کے دیباچے میں برادرم شہزاد احمد نے مجھے ردِّ تعلّی کا شاعر بھی قرار دیا ہے۔

شاعری کے بارے میں میرا نقطہ نظر ہمیشہ سے واضح اور صاف چلا آ رہا ہے کہ میں مروج اور عصری شاعری سے کبھی مطمئن نہیں رہا بلکہ مختلف طریقوں اور پینتروں سے اس کے خلاف نہ صرف بغاوت کی بلکہ ناقدین کے مطابق اس کا حلیہ ہی تبدیل کر کے رکھ دیا۔ بعض حضرات اسے حلیہ بگاڑنے سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور یقین کیجیے، میں اب تک اس عمل سے گزر رہا ہوں (واضح رہے کہ یہ تحریر کوئی دس پندرہ سال پہلے کی ہے) اور کسی بھی آخری نتیجے پر نہیں پہنچا۔ مقصد یہ ہے کہ اگر میں نے مروج شاعری سے بغاوت کی ہے تو اس کا منطقی تقاضا تو یہ تھا کہ میں اس کے بدلے میں کوئی اپنی اور بہتر چیز پیش کرتا اور اگر میں نے اس سلسلے میں کوئی سعی کی بھی ہے تو میں اس سے ہرگز ہرگز مطمئن نہیں ہوں، نہ ہی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنے سفر کے اختتام یا

منزل کے قریب پہنچ گیا ہوں بل کہ زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ میں اپنی منزل سے کچھ اور دور ہو گیا ہوں۔

شہزاد احمد نے چند سال پہلے اعلان کیا تھا کہ جب تک میں زندہ ہوں، غزل نہیں مر سکتی اور جو ایک دو جگہ رپورٹ بھی ہوا۔ میں نے اس پر تو مسرت کا اظہار کیا تھا لیکن اپنے بارے میں مجھے ایسی بات سوچنے کا کبھی خواب تک نہیں آیا۔ مجھے ڈاکٹر ابرار احمد کی اس بات سے کسی حد تک اتفاق ہے کہ میں نے ''آب رواں'' کی توسیع میں ایک ہی بڑا کنواں کھودنے کی بجائے لاتعداد گڑھے کھود دیے ہیں۔ شاید ہی وہ کنواں کھود بھی سکتا ہوں گا لیکن میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ ''آب رواں'' کی غیر معمولی پذیرائی کے باوجود مجھے اس کی توسیع میں کوئی کشش نظر نہیں آئی کیوں کہ میں بھی اگر دوسروں کی طرح کوئی چھوٹا موٹا کنواں کھود کر بیٹھ جاتا تو یہ نہ صرف میرے خلافِ طبع ہوتا بل کہ خاصی حد تک شرمناک بھی۔

''آب رواں'' جب شائع ہوئی تو وہ بقول شخصے اپنے عہد سے بہت آگے تھی۔ یہ میری پہلی کتاب تھی اور یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ اس میں کوئی دیباچہ شامل نہ تھا بل کہ فلیپ کی چند سطور میں نے خود ہی لکھ ماری تھیں حالانکہ اس زمانے میں بات نا قابل تصور تھی کہ شاعر کی پہلی کتاب ہو اور وہ وقت کے معتبرین کے دیباچوں اور فلیپ کے بغیر۔ ناصر کاظمی نے خود دیباچہ لکھنے کی خواہش ظاہر کی اور مجھ سے مسودہ بھی حاصل کر لیا اور بتایا تھا کہ دیباچے کا سارا خاکہ ان کے ذہن میں آ گیا ہے جس کا عنوان انھوں نے میرے ہی ایک شعر سے نکالا تھا، شعر یہ تھا:

پھر آج مے کدہ دل سے لوٹ آئے ہیں
پھر آج ہم کو ٹھکانے کا ہم سبو نہ ملا

لیکن میں چوں کہ اپنی افتادِ طبع کے مطابق سرے سے دیباچہ لکھوانے کے حق میں ہی نہیں تھا، چنانچہ انھی دنوں حنیف رامے کے پرچے 'نصرت' میں میں نے ناصر کاظمی کے خلاف ایک مضمون بعنوان ''میرا بائی کا بہنوئی'' چھپوا دیا اور اس طرح دیباچے کا وہ قصہ تمام ہوا۔

ناصر کاظمی گو میرے سینئر تھے اور بہت عمدہ شاعر بھی، لیکن معیار محض عمدگی نہ تھی اس لیے بہت جونیئر ہونے کے باوجود ان کے ساتھ ایک درپردہ چشمک چلتی رہی جس کے چند نشانات ''آب رواں'' اور بعد کے کلام میں بھی موجود ہیں، مثلاً

سبھی تسلیم ہے اے معتقدِ میرؔ مجھے
اپنے بھی شعر کی دکھلا کبھی تاثیر مجھے

میں یہاں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب میں نے ''آب رواں'' لکھی تو اس وقت میرے سامنے جدید شاعری کا کوئی ماڈل نہ تھا۔ ناصر کاظمی کا طوطی بے شک بول رہا تھا لیکن میری ان سے کم کم ہی بن آئی۔ اس کی بنیادی وجہ زبان اور تغزل، دونوں کا اختلاف تھا۔ زبان کا اس طرح سے کہ بے شک میں

نے آب رواں'' میں زیادہ تر مروّج زبان ہی استعمال کی لیکن میں نے محسوس اس وقت بھی کر لیا تھا کہ یہ زبان زیادہ دیر اور دور تک میرا ساتھ نہیں دے سکے گی اور اس کے متعدد اشارے خود اس کتاب میں بھی دستیاب ہیں۔ دوسرے میؔر اور فراقؔ گورکھپوری کے حوالے سے ناصر کاظمی کی ماضی میں مستقل رہائش جب کہ ہجرت کا حوالہ بھی اس کی ماضی پسندی ہی کا شاخسانہ تھا۔

''آب رواں'' کا مسودہ مکمل کر کے میں نے 1961ء میں ''نیا ادارہ'' والے چوہدری نثار احمد کو دے دیا تھا جس روز میں نے مسودہ ان کے سپرد کیا اس دن مرحوم نے قریبی ریسٹورنٹ 'نعمت کدہ' میں لے جا کر خلاف معمول کھانا کھلایا اور معاہدے پر دستخط کروائے۔ یہ کھانا ہی میری رائلٹی تھی! ایک نئے شاعر کو اس کی پہلی ہی کتاب پر رائلٹی دینے کا ویسے بھی کوئی رواج نہ تھا اور نہ ہی مجھے اس کی توقع تھی۔ چوہدری صاحب مجھے ''سویرا'' میں مسلسل بڑی عزت اور محبت سے چھاپ رہے تھے، میرے لیے یہی کافی تھا۔ البتہ جب میری پہلی غزل ''سویرا'' میں شائع ہوئی تو اس وقت ایڈیٹر حنیف رامے تھے اور میری کوئی آٹھ دس غزلوں میں سے ایک منتخب کی جو 'آب رواں' کی بھی پہلی غزل ہے اور کہا کہ دوسری غزلوں میں کئی دیگر ہم عصر شعرا کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔

اس سے پہلے میری غزلیں جناب احمد ندیم قاسمی کے توسط سے روزنامہ ''امروز'' کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوتی رہی تھیں جس کے وہ انچارج ہوا کرتے تھے جو کہ بعد میں اس اخبار کے ایڈیٹر بھی ہوئے۔ اس کے بعد ہفت روزہ 'لیل و نہار'' اور دیگر رسائل میں بھی چھپنے لگیں۔ البتہ سب سے پہلے میری چھ اکٹھی غزلیں جریدہ ''نئی تحریریں'' میں مع تعارفی نوٹ کے شائع ہوئیں جس کے ایڈیٹر قیوم نظر اور سید امجد الطاف تھے۔ میں ان دنوں گریجویشن کر کے گورنمنٹ کالج سے نکلا ہی تھا جب کہ اس سے پہلے میری غزلیں کالج میگزین ''راوی'' میں شائع ہوا کرتیں۔ انہی دنوں جالندھر میں ڈپٹی ہائی کمشنر آن پنجاب (مشرقی) نے ایک مشاعرہ کروایا جس میں قیوم نظر مجھے بھی ہمراہ لے گئے۔ پہلا مشاعرہ تھا جس میں شریک ہوا، جس میں صوفی تبسم، انجم رومانی، قیوم نظر، منیر نیازی، شاؔد امرتسری وغیرہ شامل تھے۔ جاتے ہوئے سفر بس میں اور واپسی پر ٹرین میں ہوا اور مختلف شعرا کے بارے فی البدیہ ہزلیات تخلیق کی اور سنائی جاتی رہیں جس وجہ سے بھی یہ سفر بہت پُر لطف رہا۔

زبان کے حوالے سے میرا نقطہ نظر اسی وقت سے باغیانہ تھا۔ برادرم افتخار جالب، لاء کالج میں میرے ہاسٹل میں میرے ساتھ تھے اور جس کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں، انھوں نے اس سلسلے میں میں نہ صرف مجھے مہمیز دی بلکہ میری رہنمائی بھی کی، تاہم زبان کے حوالے سے میرا تھیسس کم پیچیدہ تھا اور اس نظریے پر قائم کہ اردو زبان علاقائی زبان کے جن سرچشموں سے الفاظ، لہجے اور محاورے وغیرہ کے حوالے سے سیراب تھی۔ اردوئے معلّٰی قرار دے کر چوں کہ وہ اس پر بند کر دیے گئے تھے اس لیے زباں آب رواں کی بجائے ایک جوہڑ کے ٹھہرے ہوئے پانی کی صورت اختیار کرتی چلی جا رہی ہے جس کے نتیجے میں اس کے بعض الفاظ گھسی ہوئی

دونیاں چونیاں ہو کر رہ گئے ہیں اور کئی لفظ اس قدر بوڑھے ہو چکے ہیں کہ وہ اب معانی دینے سے قاصر ہیں مثلاً عظیم، فنکار اور درد وغیرہ۔

’آب رواں‘ میں یہ رویہ اس لیے بھی بروئے کار نہ لایا کہ اگر میری پہلی کتاب ہی اس قدر انحرافی اور باغیانہ ہوتی تو اس کا اعتبار قائم ہونا بے حد مشکل تھا۔ چنانچہ ’آب رواں‘ کی اشاعت کے بعد مجھے یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ زبان کی توڑ پھوڑ کے تناظر میں لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ یہ زبان جانتا ضرور ہے اس لیے اس اکھاڑ پچھاڑ پر کسی حد تک غور بھی کیا جا سکتا ہے

اس پر جو رد عمل ہونا تھا مجھے اس کا پورا اندازہ تھا جب کہ اس عمل پر پہلا اعتراض یہی تھا کہ زبان میں کوئی تبدیلی شعوری طور پر نہیں لائی جا سکتی کہ یہ ایک ارتقائی عمل ہے۔ تاہم یہ بات تاریخ کا حصہ ہے کہ عامۃ الناس اپنی ضروریات کے مطابق خود بھی زبان میں تبدیلیاں لا رہے تھے۔ میں نے اس وقت ’’گل آفتاب‘‘ پر ہی بس نہیں کی بلکہ ماہنامہ ’’دھنک‘ کے کالموں یعنی نثر میں بھی بالخصوص پنجابی زبان کے الفاظ اور لب و لہجے کا استعمال شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ اخباری کالموں کی زبان بھی تبدیل ہونے لگی، حتیٰ کہ مشہور ٹی وی ڈرامہ ’’وارث‘‘ وغیرہ میں بھی پنجابی آمیز زبان کا دور دورہ شروع ہو گیا اور اب عالم یہ ہے کہ بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں میں اس نصف صدی کے دوران زبان کا حلیہ اس قدر تبدیل ہو گیا ہے کہ اب اس کی صورت ہی پہچانی نہیں جاتی۔ بھارت میں ہندی اور سنسکرت کی بھرمار اور پاکستان میں پنجابی اور دیگر علاقائی زبانوں کی نت نئی آمیزش سے اردو وہ اردو نہ رہی جو تقسیم ملک کے وقت مروج اور سکہ بند زبان کہلاتی تھی، حتیٰ کہ قومی زبان ہونے کے باوجود ایک اہل قلم کانفرنس میں پاکستان کی علاقائی زبانوں کو قومی زبانیں اور اردو کو رابطے کی زبان قرار دیا گیا، چنانچہ اردو زبان کی قلب ماہیت کے سلسلے میں جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں شعوری اور غیر شعوری دونوں طرح کی کوششیں شامل تھیں اور اب اردو یا خالص اردو کی حرمت کا سوال اٹھنا فیشن بن ابھر ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆

محمد اظہار الحق

کچھ گھائل دن کچھ وصل کی روشن راتیں

خلیل مصر تھا کہ ہمیں اپنا گاؤں دکھائے۔ مہتاب، عبدالحی اور میں نے ساتھ چلنا تھا۔ عبدالحی ہمارا بہاری دوست تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے ایم اے کو درمیان میں چھوڑا اور حبیب بینک میں ملازمت کرلی۔ جب پاکستان بنا ہے تو وہ چٹا گانگ میں تھا۔ حبیب بینک کے بہت سے لوگوں سے اس کی خیریت کے بارے میں پوچھا لیکن کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ خلیل میرا اور مہتاب کا کلاس فیلو تھا۔ میرے ساتھ محسن ہال میں قیام پذیر تھا۔ کم دودھ کے ساتھ تیز چائے پیتا اور بتاتا کہ یہ ہوتی ہے چائے۔ کتنی ہی بار ہم نے مادھو کی کینٹین سے اکٹھے چائے پی اور سموسے کھائے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں کہاوت یہ تھی کہ ایک خاص تعداد میں مادھو کے سموسے نہ کھائے جائیں تو ڈگری حاصل نہیں ہوتی۔ خلیل کو ہم بھی بنگالیوں کے تتبع میں کھلیل ہی کہتے تھے۔ اس کا پورا نام قاضی خلیل الرحمان تھا۔ اس کے آبائی گاؤں کا نام گھوڑا سال تھا۔ اس دن خلیل نے صبح تین بجے جگا دیا۔ میں نے حسب معمول غسل خانے میں دیر لگائی تو اس نے باہر چیخنا چلانا نہ چھوڑا کہ جلدی کرو ورنہ ٹرین سے رہ جائیں گے۔ آج پروگرام تھا کہ کرتوں اور پاجاموں میں جائیں گے لیکن عبدالحی کہنے لگا کہ اس کا اکلوتا کرتا دھوبی کے پاس پڑا ہے۔ اس لیے سب پتلونیں پہنیں گے۔ ٹرین پر ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت تھی۔ کیا خوبصورت قریہ تھا جو دریا کے کنارے آباد تھا اور کیا دل نشین حویلی تھی۔ کھلا میدان جس پر سبزہ ہی سبزہ تھا۔ آم کے درختوں پر سبز آم لگے تھے۔ باغ میں کٹھل، لیچی، سپاری، کھجور، ناریل، بیل، تال اور بیری کے درخت ہوا سے جھوم رہے تھے۔ درمیان میں تالاب تھا۔ تالاب کے چاروں طرف اترنے کے لیے سیڑھیاں بنی تھیں۔ ہم یہاں بیٹھے رہے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہوا کے سینے سے خوشبو کی شعائیں پھوٹ رہی تھیں۔ حویلی میں بہت سے کمرے تھے۔ بانس کے ڈنڈوں اور تیلیوں سے بنے ہوئے۔ خلیل کا خاندان شہر میں رہ رہا تھا۔ یہاں اس کی بوڑھی دادی چند ملازموں کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ ناشتے میں ہم نے چاول کے پراٹھوں کے ساتھ بنگال کے روایتی رس گلے کھائے اور سیر کو نکل گئے۔ سبز زمین تھی، سبز درخت اور سبز جنگل، ہر شے سبز تھی۔ ایک ناقابل بیان ہریالی، ایک مربع انچ زمین بھی سبزے سے محروم نہ تھی۔ گاؤں ختم ہونے میں آ ہی نہیں رہا تھا۔ ایک گھر کے بعد اس گھر کے کھیت شروع ہو جاتے پھر ایک اور گھر اور اس کے کھیت۔ بانس کا جنگل گھنا تھا، کوئی کوئی

درخت اتنا لمبا تھا کہ اوپر جا کر ایک سمت کو مڑ گیا تھا اور زمین کے متوازی ہوتا ہوا کافی دور کسی اور درخت سے مل گیا تھا۔ ایک عجیب گھاس دیکھی، خلیل نے لاجونتی نام بتایا۔ خوبصورت پتے لیکن چھوتے ہی مرجھاتے اور سکڑ جاتے۔ جہاں بھی دکھائی دیتی میں اور مہتاب جھک پڑتے۔ ذرا سی انگلی لگاتے اور لاجونتی سوکھ کر سکڑ جاتی۔ دریا کے کنارے ایک طرف پٹ سن کی ملیں تھیں، چار پانچ چل رہی تھیں اور دو تین زیر تعمیر تھیں۔

جنگل عبور کر کے ہم خلیل کے ماموں کے گھر پہنچے جو مقامی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ باریش، سادہ سے کرتے اور لنگی میں ملبوس، رواں انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ مشرقی پاکستان کے دور افتادہ گاؤں میں بھی لوگ پڑھے لکھے تھے۔ خواندگی کا تناسب مغربی پاکستان سے کہیں زیادہ تھا۔ انگریزوں کے قدم یہاں شروع ہی میں جم گئے تھے، دوسری وجہ فیوڈلزم کا نہ ہونا بھی تھی۔ ماموں نے چائے پلائی تو ساتھ ہر شے چاول کی تھی۔ چاول کی مڑی، چاول کے ٹکڑے اور چاول کے پکوڑے۔

سارا دن گھوم کر سہ پہر کو گھوڑا سال کی طرف پلٹے۔ اب جو دیکھا تو ایک کتا پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ کافی دیر تک اس نے ہماری معیت نہ چھوڑی۔ ہم نے اسے ڈرایا، دھمکایا پھر ہاتھ بھی جوڑے لیکن وہ ادھر ادھر ہونے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ جب میں اور مہتاب ایک طرف چل پڑے تو اس نے خلیل اور عبدالحی کا ساتھ دیا۔ پھر ہم تین ایک طرف اور مہتاب دوسری طرف چلنے لگا۔ اب وہ مہتاب کے پیچھے چلنے لگا۔

خلیل کی دادی کمرے میں تخت پوش پر بیٹھی تھیں۔ تخت پوش کے ارد گرد ڈبوں اور الماریوں کی قطاریں تھیں۔ مجھے اپنے نانکے گاؤں بکھوال کا وہ اندرونی نیم تاریک کمرہ یاد آ گیا جہاں ماں جی تخت پوش پر بیٹھتی تھیں اور تخت پوش کے ارد گرد ڈبے پڑے ہوتے تھے۔ خلیل کی دادی بہت پیار سے ملیں۔ وہ مسلسل بول رہی تھیں، خلیل نے انہیں مشکل سے سمجھایا کہ ہم بنگالی نہیں سمجھ سکتے تھے۔

”یہ بہت دور سے، ایوب خان کے دیس سے آئے ہیں“

خلیل نے بتایا۔

شام کو سب تاش کھیلتے رہے، سوائے میرے۔ میں جی الانہ کی کتاب ...... ”قائداعظم۔ سٹوری آف اے نیشن“ پڑھتا رہا۔ آنے سے پہلے ہمیں دودھ پلایا گیا۔ شام کو لوٹے تو ٹرین میں دوا اور امٹر ونگ، افتخار اور نیازی مل گئے۔ یہ لوگ برہمن باڑیہ سے آ رہے تھے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی قیام کے دوران کومیلا کا سفر دوبار درپیش ہوا۔ ایک بار محمود عالم کے ہمراہ، جو محسن ہال میں عین میرے کمرے کے اوپر، چوتھی منزل پر رہتا تھا اور دوسری بار سہیل کے ہمراہ، جب وہ اپنا مہمان بنا کر لے گیا۔ سہیل دو کمرے چھوڑ کر، میرے ہی فلور پر رہتا تھا۔ کمروں کی اس پوری قطار میں ہم دونوں ہی کے

کمروں میں رات بھر روشنی رہتی تھی۔ ایک بار میں نے اسے کہا، ہیلو کتابی کیڑے! تو اس نے پلٹ کر جواب دیا ہیلو شب بیدار پرندے!

یہ ۲ جون ۱۹۶۸ء کی ایک رسساتی صبح تھی، جب ہم دونوں ڈھاکہ ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ ''اُلکا'' چھوٹ چکی تھی اور اب جوڑ ین میسر تھی وہ ''گرین ایرو'' تھی۔ کومیلا تک کا سکینڈ کلاس کا کرایہ ساڑھے پانچ روپے تھا۔ مشرقی پاکستان ریلوے سے انٹر کلاس اُڑا دی گئی تھی۔ اب صرف تین درجے تھے۔ فرسٹ، سکینڈ اور تھرڈ، بھکاریوں کی یہاں بھی کمی نہیں تھی۔ ایک بڑے میاں نے تو رواں انگریزی میں بھیک مانگی۔

ٹھاکور پارہ محلے کا یہ مکان اردگرد کے مکانوں میں نمایاں تھا۔ دومنزلہ، پختہ اور وسیع، پچھواڑے میں بہت بڑا سبزہ زار تھا جس کے درمیان میں تالاب تھا۔ گھر کیا تھا، باغ تھا۔ درخت ہی درخت تھے۔ آم کے درخت، ناریل کے درخت، سپاری کے درخت، کٹھل کے درخت اور کیلے کے درخت، سہیل کے والد کومیلا بورڈ آف ایگزامینیشن کے کنٹرولر کے عہدے پر فائز تھے۔ پچپن کے پیٹے میں تھے۔ سفید بھری بھری داڑھی سر پر کپڑے کی سفید ٹوپی، رواں شگفتہ انگریزی میں بات کرتے تھے۔ کہنے لگے جب سے سہیل نے ذکر کیا، تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔

منع کرنے کے باوجود دسترخوان پر چپاتیاں موجود تھیں۔ آم وافر مقدار میں تھے، سہیل نے بتایا کہ ہماری آمد سے پہلے اس کی امی نے کسی کو آم کے پیڑوں کے نزدیک نہیں جانے دیا۔ ناشتے میں چاول کی پھلیاں کھائیں جو دودھ اور آم میں ملی ہوئی تھیں۔ رات کھانے کے بعد شہر میں گھومنے نکل گئے۔ دھرموساگر تالاب کے کنارے دیر تک بیٹھے رہے۔ تقسیم سے پہلے کومیلا دو چیزوں کے لیے معروف تھا۔ For Banks and Tanks۔ بینک تو ہندوؤں کے ساتھ ہی بھارت چلے گئے، تالاب موجود تھے۔ تاہم ہندو کافی نظر آئے۔ پستہ قد، گنجے، دھوتیاں باندھے ہوئے اور چھتریاں پکڑے ہوئے۔ اکثر ننگے پاؤں تھے۔ بھارت کی سرحد یہاں سے تین چار میل کے فاصلے پر تھی۔ کچھ مکان ایسے بھی تھے جن کا ایک حصہ بھارت کو تو دوسرا پاکستان کو ملا۔ اگرتلہ اسی علاقے میں تھا۔

قابل دید مقامات کومیلا میں دو تھے۔ ایک رورل اکیڈمی جس کی وجہ شہرت علامہ مشرقی کے داماد ڈاکٹر اختر حمید خان تھے اور دوسرا اینامتی کے کھنڈر اور ملحقہ عجائب گھر۔ اکیڈمی اور عجائب گھر ساتھ ساتھ واقع ہوئے تھے اور شہر سے تین میل کے فاصلے پر تھے۔ سکوٹر رکشے والا تین روپے مانگ رہا تھا اور سائیکل رکشا ایک روپیہ۔ ہم سائیکل رکشا پر بیٹھ گئے۔ ٹانگیں چلنے لگیں۔ بنیان میں پھنسی ہوئی کاندھے کی ہڈیاں کھڑکنے لگیں اور تین پہیے ہم دو سواریوں کو لیے لڑھکنے لگے۔ راستے میں ہر طرف دھان کے کھیت تھے اور پانی ہی پانی۔ کسانوں نے

قمیضیں اتاری ہوئی تھیں۔ لنگیوں میں ملبوس تھے اور بانس کے بنے ہوئے چوڑے چھاتہ نما ہیٹ سروں پر رکھے ہوئے تھے۔ بارش اور دھوپ دونوں اچانک آتی تھیں۔

رورل اکیڈمی کی عمارت جاپان نے بنوا کر دی تھی۔ خوبصورت اور وسیع و عریض۔ اکیڈمی کے بنیادی کام دو تھے۔ کوآپریٹو سوسائٹی اور کسانوں کی تربیت۔ تعلیم بالغاں کے علاوہ بیج، کھاد اور مشینی اوزار استعمال کرنے کے طریقے سکھائے جاتے تھے۔ سی ایس پی افسروں کی بھی یہی تربیت گاہ تھی۔ ایک برس پہلے آل پاکستان سائنس کانفرنس بھی یہیں ہوئی تھی۔ لائبریری بہت بڑی تھی۔

اب ہم مینامتی کے کھنڈرات کی طرف جا رہے تھے۔ سڑک کچی اور زیر تعمیر تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم رکشے سے اتر جاتے اور رکشے والا اسے دھکیل کر آگے بڑھاتا۔ کھنڈرات آٹھویں صدی عیسوی کے تھے۔ ہم ایک ہندو راجہ کے محل میں کھڑے تھے۔ غالباً تیسری منزل پر۔ دیواریں اب بھی سلامت تھیں۔ صرف چھت نہیں تھی۔ گلیاں، مندر، مندریں، کمرے، دالان، صحن، سیڑھیاں، درباریوں کی نشستیں، سب کچھ موجود تھا۔ نیچے دوسری منزل تھی اور بہت نیچے گہرائی میں پہلی منزل تھی۔ منیر نیازی یاد آتا رہا۔

سن بستیوں کا حال جو حد سے گزر گئیں
ان امتوں کا ذکر جو رستوں میں مر گئیں
صرصر کی زد میں آئے ہوئے بام و در کو دیکھ
کیسی ہوائیں کیسا نگر سرد کر گئیں

عجائب گھر ویسا ہی تھا جیسا ٹیکسلا کا تھا (ٹیکسلا کو بنگالی میں تکھوشلا کہتے ہیں)۔ لیکن اس سے کہیں چھوٹا۔ مٹی کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ مٹی کے چراغ، چراغوں کے سٹینڈ، پکانے اور کھانے کے برتن، بڑے بڑے مٹکے، لوہے کی بھدی بھدی کیلیں اور چھریاں، دھات کے سکے، انگوٹھیاں، پتھر کے بہت سے بُت۔ گوتم بدھ کے بت، شیروں، ہاتھیوں اور گھوڑوں کے بت، تلواریں پکڑے ہوئے اور ڈھالیں تنے ہوئے شہزادوں کے بت۔ سنسکرت میں تحریر شدہ ہندو راجاؤں کے فرمان تھے اور نقش و نگار والی اینٹیں۔

روانگی کے دن سہیل کی امی نے اپنے بیٹے کے دوست کے لیے خاص چاول خاص انداز میں پکائے۔ مرغی، مچھلی اور دال تھی اور آم ...... بہت سے اور میٹھے۔ لٹن سے دوستی ہو گئی تھی جو سہیل کا گول مٹول ننھا بھانجا تھا۔ اس کا باپ سلہٹ میں چائے کے باغ کا منیجر تھا۔ لٹن مجھ سے یہ ضرور پوچھتا کہ اپنار نام کی؟ آپ کا نام کیا ہے؟ میں جواب دیتا ایکلا مانوش، ایک آدمی۔ رخصتی کے وقت درخت سے تازہ ناریل (ڈاب) توڑ کر پلایا گیا۔

واپسی کا سفر بس کے ذریعے کیا، ایسٹ پاکستان روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی بس نے ساڑھے چار

روپے کرایہ لیا، پھروہی دونوں طرف دھان اور پٹ سن کے کھیت، سبزہ ہی سبزہ، پانی ہی پانی اور آدمی ہی آدمی۔ میگنا کا دریا بھرا ہوا تھا، بہت چوڑا، ہر طرف کشتیاں ہی کشتیاں نظر آ رہی تھیں۔ نوکے، بجرے، سٹیمر اور لانچیں۔ بادبانی کشتیاں بھی اور چپوؤں والی بھی۔ داڑھیوں والے بوڑھے مانجھی صرف لنگوٹوں میں ملبوس، کشتیوں میں بچے بٹھائے، ہاتھوں میں چپو پکڑے ہوئے! پٹ سن کے گٹھوں اور موجوں کے ریلوں میں زندگیاں شروع ہوتی ہیں اور وہیں ختم ہو جاتی ہیں۔

میگنا پار کرنے کے لیے بس کو فیری پر چڑھایا گیا۔ یہ وہ ماڈرن فیری نہیں تھی جو میں نے آنے والے دنوں میں یورپ، امریکہ اور کینیڈا میں دیکھی۔ اس فیری میں نشستیں تھیں نہ ریستوران۔ ہماری بس کے علاوہ ایک ٹرک اور دو کاریں بھی فیری پر "سوار" تھیں۔ دوسرے کنارے پہنچنے میں آدھا گھنٹہ لگا۔ بالکل اتنا ہی وقت جتنا طنجہ سے ہسپانیہ کے جنوبی ساحل تک جانے میں لگتا ہے۔ طنجہ سے بھی فیری سمندر پار جاتی ہے لیکن اس فیری میں اور میگنا پار کرنے والی فیری میں اتنا ہی فرق ہے جتنا آج بھی بنگلہ دیش اور یورپ میں ہے۔ کومیلا سے ڈھاکہ تک ساٹھ میل کا سفر تھا۔ تین بار مختلف دریاؤں کو فیری کے ذریعے پار کیا گیا۔

سلہٹ کی سیر ہم نے دیوان عبدالباسط صاحب کی وساطت سے کی جو مشرقی پاکستان کے وزیر تجارت تھے۔ ان سے تعلق مہتاب نے ڈھونڈا۔ ایک صبح مہتاب آیا کہ چلو دیوان صاحب کے دفتر جانا ہے۔ ہم سیکرٹریٹ پہنچے۔ وزیر صاحب بے حد تپاک سے ملے۔ سفید داڑھی! جو قطع و برید کے باوجود بزرگانہ لگ رہی تھی۔ سر کے بال برف جیسے سفید۔ سفید کرتے اور سفید پاجامے میں ملبوس۔ کپڑے کی سفید ٹوپی اور شیروانی دیوار پر لٹکی تھی۔ ہم نے بتایا کہ سلہٹ جا رہے ہیں۔ کہنے لگے ٹھہرو! تمہارے قیام و طعام کا بندوبست کرتا ہوں۔ پھر انھوں نے سلہٹ کے ڈپٹی کمشنر، سلہٹ مسلم لیگ (کنونشن) کے سیکرٹری اور ایسٹ پاکستان انڈسٹریل ڈی ویلپمنٹ کارپوریشن کے چیئرمین کو فون کر کے ہدایات دیں کہ مغربی پاکستانی طالب علموں کو ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا جائے، کھانے کا انتظام کیا جائے، گاڑی مہیا کی جائے اور ایک گائیڈ بھی ساتھ کیا جائے۔

اُلکا ریل گاڑی پر ہم تین تھے۔ میں مہتاب اور خلیل (قاضی خلیل الرحمان)۔ گاڑی اکوڑہ کے مقام پر تبدیل کی۔ سہ پہر تین بجے ہم مبج گاؤں اترے۔ یہ چھوٹا سا ریلوے سٹیشن سلہٹ سے پندرہ میل ادھر ہے۔ دیوان صاحب کے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق ایسٹ پاکستان انڈسٹریل ڈیویلپ منٹ کارپوریشن کے کسی آدمی نے ہمارے لیے ریلوے اسٹیشن پر موجود ہونا تھا۔ پلیٹ فارم کا طواف کرنے پر کوئی آدم نہ آدم زاد اس قبیل کا ملا۔ سٹیشن ماسٹر کے پاس فون کرنے گئے تو معلوم ہوا ٹیلی فون خراب ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے ایک آدمی نے ہمیں کہا کہ اس کے پاس جیپ ہے وہ ای پی آئی ڈی سی کا ہے اور آیا بھی سٹیشن پر ہے اور ہم

چاہیں تو ہمیں لے جا سکتا ہے لیکن بقول اس کے سچی بات یہ تھی کہ وہ ہمارے لیے نہیں آیا، اپنے کسی کام سے آیا تھا۔ مہتاب غصے میں بڑبڑا رہا تھا کہ سیدھے سلہٹ چلے چلو۔ خلیل مونچھوں والے آدمی سے ڈر رہا تھا کہ نہ جانے یہ کہاں لے چلے۔ تاہم میں نے انہیں جیپ میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ڈرائیور مونچھوں کو تاؤ دیتا چار میل دور فیکٹری کے ریسٹ ہاؤس میں لے آیا۔ یہ اعلیٰ نسل کا مہمان خانہ اعلیٰ افسروں کے لیے تھا۔ ایڈمنسٹریٹو افسر نے ایک صاحب کو بھیجا جنہوں نے ہمیں فیکٹری دکھائی۔ ایمونیا گیس کی بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہ پاکستان کی سب سے بڑی کھاد فیکٹری تھی اور ساری خودکار تھی۔ مشینری جاپان کی تھی اور نگرانی امریکہ کی۔

دوسرے دن ہم صبح آٹھ بجے سلہٹ کے سٹیشن پر اترے۔ ڈپٹی کمشنر کا ریڈر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمارے لیے ایک عدد کار وہ سٹیٹ بینک سے مانگ کر لایا تھا۔ سب سے پہلے مسلم لیگ (کنونشن) کے مقامی سربراہ کے گھر گئے وہ صاحب فراش تھے۔ ان کے بھائی نے جو مشرقی پاکستان اسمبلی کے رکن تھے ہم سے سیاسی حالات اور اقتصادی عدم مساوات پر خوب بحث کی۔

ڈپٹی کمشنر، شفیع العالم سی ایس پی، ایک خوش خلق اور ملنسار انسان تھے۔ انھوں نے حکم دیا کہ ہمارے قیام وطعام کا خاطر خواہ بندوبست ہو اور ایک جیپ ہمہ وقت میسر ہو۔ سب سے پہلے شاہ جلال کے مزار پر حاضر ہوئے کہ یہی یہاں کی روایت تھی۔ جوتے اتار کر سیڑھیاں چڑھے۔ ڈی سی کا ناظر ہمارے کہنے کے باوجود اندر نہ آیا۔ ایک طرف تعویز بانٹے جا رہے تھے۔ ملحقہ مسجد میں کوئی نہ تھا۔ خلیل کی طویل دعا ختم ہوئی تو ہم باہر نکلے۔ معلوم ہوا شام کو ہمیں ہندو پاک سرحد دکھائی جائے گی۔

دوپہر کے کھانے کے لیے ریڈر ہمیں ایک ریستوران میں لے گیا۔ ہم نے اصرار کیا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو۔ اس نے معذرت کی اور بتایا کہ وہ ہندو ہے۔ اس دن دُرگا پوجا کے تہوار کا آغاز ہو رہا تھا اور وہ روزے سے تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ہوٹل بھی ہندوؤں کا تھا۔

تمابیل کی بھارتی سرحد سلہٹ سے چالیس میل کے فاصلے پر تھی۔ تقسیم سے پیشتر سلہٹ بنگال کا نہیں آسام کا حصہ تھا۔ آسام بھارت کو ملا تو سلہٹ کے لوگوں نے ریفرنڈم کے ذریعے پاکستان کا انتخاب کیا۔ ہم شیلانگ روڈ پر جا رہے تھے۔ سلہٹ سے ۸۳ میل دور شیلانگ اس وقت آسام کا صدر مقام تھا۔ چار سال بعد، یعنی 1972ء میں، آسام کو دو ریاستوں میں بانٹ دیا گیا۔ نئی ریاست میگھالایا کا صدر مقام شیلانگ بنا اور آسام کا گوہاٹی۔

سڑک کے دونوں طرف اونچے، پہاڑیوں جیسے، مٹی کے ٹیلے تھے۔ ان ٹیلوں کی وجہ سے سلہٹ باقی ملک سے مختلف اور زیادہ خوبصورت لگتا تھا۔ عجیب لینڈ سکیپ تھا۔ ٹیلوں پر گھاس، زمین پر گھاس، درخت، ندی

نالے، کہیں چائے کے باغات کہیں پھلوں کے، کہیں ریسرچ فارم، چرواہوں نے بانس کے بنے ہوئے بڑے بڑے چھاتہ نما ٹوپ پہنے ہوئے تھے اور دھوپ میں پھر رہے تھے۔ پھر سامنے پہاڑ ابھرنے لگے جو تقریباً تین طرف پھیلتے گئے۔ جیپ دوڑتی جا رہی تھی۔ ہم باتیں کر رہے تھے۔ اسسٹنٹ ناظر اور ڈرائیور معلومات بہم پہنچا رہے تھے۔ درخت گھنے ہوتے گئے۔ پھر باغات آ گئے۔ دفعتاً ایک موڑ کاٹا تو جیپ رک گئی۔ آگے سڑک بند تھی۔ سڑک پر لکڑی تنی تھی اس کے اوپر خاردار تار تھی۔ اس سے آگے بھارت تھا اور پہاڑ سرحد کے پار تھے! مہتاب ان دو چمکتے آبشاروں کو دیکھنے لگا جو اس پار بلند پہاڑوں سے گر رہے تھے اور اس شاہراہ کو جو پہاڑوں پر پھیلے ہوئے جنگل کے درمیان ایک لکیر کے مانند چلی گئی تھی۔ جہاں سڑک پر لکڑی اور اس کے اوپر خاردار تار لگی تھی، اس سے آگے، تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر بھارت کی حد بندی تھی اور ایسی ہی لکڑی اور اس کے اوپر تنی تار سے سڑک بند کی گئی تھی۔ درمیان والی جگہ نو مین لینڈ تھی۔ سڑک کے پاس چھوٹا سا محرابی ستون تھا جو سرحد کی نشان دہی کر رہا تھا۔ اس پر 1275 لکھا تھا۔ غالباً یہ سرحد کا 1275 واں ستون تھا! اس طرف پاکستانی چوکی تھی جس پر EPR (ایسٹ پاکستان رئفلز) کے مسلح جوان بیٹھے تھے۔ پاکستانی پرچم لہرا رہا تھا۔ پار بھارتی چوکی تھی مگر درختوں کے جھنڈ میں چھپی تھی۔ دو تین عورتیں، اتنے ہی مرد، اتنے ہی بچے بوریا بستر لیے سڑک کے درمیان بیٹھے تھے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ بتایا گیا یہ مہاجر ہیں، بھارت سے نکال دیے گئے یا خود چھوڑ کر آنا چاہتے ہیں۔ پاکستانی سپاہی اپنے ہاں داخل نہیں ہونے دیتے۔ اب یہ چھپ چھپا کر کسی اور راستے سے اندر گھسیں گے۔ اسسٹنٹ ناظر نے بتایا کہ ویسے تو سختی تھی لیکن سپاہیوں کا موڈ ہو تو دوسری طرف کے لوگوں سے گپ شپ کرتے ہیں۔ کھانے پینے کی اشیا کا تبادلہ ہوتا ہے۔ ناظر کہہ رہا تھا، اس طرف پہاڑ کے پار اچھا خاصا بڑا بازار لگتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کی سطح پر بات چیت ہوئی تو ہمارے لوگ وہاں جانے لگے۔ اسسٹنٹ ناظر صاحب خود بھی ہو آئے تھے۔ ساتھ ایک جوہڑ نما تالاب تھا۔ ایک بچہ مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ ہم نے پوچھا یہ جوہڑ ہمارا ہے یا بھارت کا؟ معلوم ہوا کہ ستون کی رُو سے آدھا یعنی اِس طرف سے ہمارا ہے اور دوسری طرف سے بھارت کا۔

واپسی پر ریسرچ باغ دیکھا جہاں کملا (مالٹوں) کے درخت تھے۔ کالی مرچ، دار چینی اور الائچی کے پودے دیکھے، اناس کا باغ دیکھا، پھر خسیا قبائل کے ہاں گئے جو چینی تھے اور اسی قبیل کی زبان بولتے تھے۔ ان خوبصورت لوگوں کے گھر صاف ستھرے اور سجے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہمیں گھروں کے اندر داخل ہونے سے روک دیا۔ ان لوگوں کے رنگ سفید، زردی مائل تھے۔ سلہٹ کے لوگ ملک کی باقی آبادی سے مختلف نقوش رکھتے ہیں۔ ان کے چہرے نسبتاً چوڑے ہوتے ہیں۔

دوسرے دن ہم چائے کے ایک باغ میں گئے۔ یہ ''خان ٹی اسٹیٹ'' شہر سے تیرہ میل کے فاصلے پر واقع

تھا۔ مالک نوشہرہ (پشاور) کے ایک خان صاحب تھے۔ ان کے بھتیجے نے ہمارا استقبال کیا جو بولتا تھا تو لگتا تھا اردو زبان کو دھکے دے رہا ہے۔ چائے کی جھاڑیوں میں بہت سے مرد اور عورتیں مسلسل ہاتھ چلا رہی تھیں۔ یہ سب لوگ ہندو تھے اور آسام کے تھے۔ یہ نسل در نسل اسی پیشے سے وابستہ چلے آرہے تھے کہ ہر شخص یہ کام نہیں کر سکتا۔ پودے کی چوٹی پر دو تازہ ہرے پتے توڑنے ہوتے ہیں۔ اس سے نیچے کے پتے سخت ہوتے ہیں اس لیے نہیں توڑے جاتے۔ دس دن بعد دو نرم ہرے پتے پھر اُگ آتے ہیں جو پھر توڑ لیے جاتے ہیں۔ ایک مزدور کے ہاتھ سے پتے لے کر ہم نے انہیں غور سے دیکھا اور سونگھا۔ ٹیلوں پر حدِ نظر تک چائے کے پودے تھے جو جھاڑیوں کی طرح تھے۔ خان مسلسل بول رہا تھا۔ اب وہ توسیع کی تفصیل بتا رہا تھا۔ نئے پودے نرسری میں لگتے ہیں۔ پھر جنگل میں درختوں کو آگ لگا کر نئی جگہ بنائی جاتی ہے۔ جہاں نرسری کے پودوں کو منتقل کر دیا جاتا ہے۔ حکومت کے قانون کی رُو سے ہر سال کچھ ایکڑ کی توسیع لازمی تھی ورنہ جرمانہ ہو جاتا تھا۔ پھر خان ہمیں فیکٹری میں لے گیا۔ سب سے پہلے ہرے تازہ پتوں کو کچل کر ان کا پانی نکال دیا جاتا تھا پھر حرارت سے پتوں کو خشک کیا جاتا تھا۔ آخر میں عورتیں ان پتوں کو صاف کرتی تھیں اور مرد لکڑی کی پیٹیوں میں بھرتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک پیٹی آدھی بھر چکی تھی اور ایک مزدور پیٹی میں لاتیں چلا رہا تھا تا کہ مزید پتے ڈالنے کے لیے جگہ بن جائے اصرار کیا تو خان نے بتایا کہ رنگ بھی ڈالا جاتا ہے یہ پیٹیاں چٹا گانگ بھیجی جاتی تھیں۔ جہاں ان کی نیلامی ہوتی تھی اور دساور کو بھیج دی جاتی تھیں۔ چائے کی بڑی پاکستانی کمپنیوں میں سے اصفہانی کا اپنا کوئی باغ نہیں تھا۔ ہاں آدم جی نے ایک دو باغ خریدے تھے۔

خان کے مہمان خانے میں جہاں ہم نے چائے پی، دیواروں پر تصویریں آویزاں تھیں۔ ایک تصویر کے بارے میں اس نے بتایا کہ نایاب ہے۔ اس میں محسود قبیلے کا سردار، انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کی موجودگی میں جواہر لال نہرو کو تھپڑ رسید کر رہا تھا۔ انگریز منع کر رہا تھا اور نہرو کندھے سکیڑے کھڑے تھے۔

(زیرتالیف خودنوشت سے)

☆☆☆☆

سیّد مظہر جمیل

ہمارے مرزا جی

بعض شناسائیاں ایسی عجیب ہوتی ہیں کہ ذرا پتا نہیں دیتیں کہ کب کہاں اور کس طرح جان کو لاگو ہوئی ہیں، اور نہ ہی ان کی گرفت کی اصل نوعیت کا پتا چل پاتا ہے۔ مرزا جی سے تعلقِ خاطر کا معاملہ بھی کچھ اسی نوع کا ہے۔ بس لگتا ہے جیسے ہم ایک دوسرے کو سدا ہی سے جانتے ہیں۔ یاری اور دوست داری کا عالم یہ ہے کہ گویا آپ نے اپنے جملہ حقوق موصوف کے نام ہبہ کر دیے ہوں اور چند فرائض بھی جیسے یہ کہ اگر آپ نے اپنے کسی مسئلے میں انھیں شریک کر لیا ہے تو سمجھیے اب یہ مسئلہ ان کا اپنا پرابلم ہو جاتا ہے اور وہ اسے اپنے طور پر حل کرنے میں تندہی سے لگ جاتے ہیں۔ یہ تو ہوا مخلصانہ گرم جوشی کا ایک پہلو ـــ لیکن دوسری طرف اُن کے استغنا کا بھی عالم ایسا ہے کہ دفتر میں ٹیلی فون کریں تو پتا چلتا ہے مرزا جی باہر نکلے ہوئے ہیں۔ موبائل پر رابطہ کیجیے تو جواب ندارد، اگر فون مل بھی جائے تو صرف ایک فقرہ سنائی دیتا ہے کہ ”بھائی اس وقت ہم کہیں اور بیٹھے ہیں۔ دفتر پہنچ کر آپ سے بات کرتے ہیں۔“ اب آپ لاکھ کوشش کر لیں مگر کامیاب نہیں ہو سکتے کہ کسی طرح ان کے ”کہیں اور“ ہونے کی گتھی سلجھا سکیں اور اُس لمحۂ خاص میں ان کی مصروفیت کا احوال جان سکیں۔ کبھی کبھی تو ان کے دفتر (جسے اُن کے احباب اور خود وہ بھی اسٹوڈیوز سے تعبیر کرتے ہیں) میں خود ان کی موجودگی بھی غیر معمولی ہو جاتی ہے کہ ہوتے ہوئے بھی دستیاب نہیں ہوتے۔

اب یہ بات ہمارے روزمرہ معمولات میں شامل ہو چکی ہے کہ کورٹ سے واپسی کے بعد ہم سب سے پہلے مرزا جی کو فون کرتے ہیں کہ اک ذرا ہلکی پھلکی چخ ہو جائے، اِدھر اُدھر کی ادبی گپ شپ اور اگر طرفین میں سے کسی کو توفیق ہو تو ذرا چٹ پٹی سی اسکینڈل بازی کا دور ہی ہو جائے۔ اس وقت غالباً مرزا جی بھی ہمارے فون کے منتظر رہتے ہیں۔ ان سے دس پندرہ منٹ کی گپ شپ کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ تاہم کبھی کبھی ہمیں ایسی کٹھور سرد مہری کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ الاماں۔ ایسے موقعے پر علیک سلیک کے جواب میں نہایت سرسری اور سپاٹ لہجے میں گفتگو فرماتے ہیں جیسے مداخلتِ بے جا ہو گئی ہو اور چاہتے ہوں کہ اس لمحے تو ہم فوراً ہی ٹل جائیں بل کہ دور دفان ہوں۔ جس کا اندازہ آپ ان کے جوابی فقروں سے لگا سکتے ہیں ”جی جی، جناب سب خیریت ہے۔ آپ کا پیغام ہمیں مل گیا تھا اور درحقیقت ہم آپ ہی کے معاملے پر غور کر رہے ہیں۔ کوئی بات سمجھ میں آئے گی تو جواب دیں گے۔“ اور فون کھٹاک سے بند ـــ اس شتر گربگی اور آڑھے ترچھے

طرزِ گفتگو سے طبیعت اُلجھ نہ جائے تو کیا ہو۔ کبھی ہم مرزا جی کے فون بند کرنے سے قبل جلدی سے پوچھتے ہیں، ''بھائی کیا معاملہ ہے، کیا کوئی خاص مہمان بیٹھے ہوئے ہیں؟'' اُدھر سے پھر ذرا مبہم سا جواب آئے گا، ''جی جی، بالکل صحیح فرمایا آپ نے، ایسا ہی ہے۔'' اِدھر ہمارا اشتیاق بڑھتا ہے اُدھر ان کی پراسراریت۔ ''بھائی کیا کوئی حسینہ، معاف کیجیے کوئی خاص خاتون مہمان تشریف لے آئی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ہمارا سلام بھی پہنچا دیجیے۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اب ان کا جواب سن لیجیے، ''نہیں صاحب، ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی ہے، بس ذرا کچھ کام کا معاملہ ہے، ہم خود آپ سے رابطہ کرتے ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔'' اب ہم لاکھ سوچتے رہیں کہ یا الٰہی ایسا کون سا کام ہے جس میں مرزا جی اس قدر منہمک ہیں کہ انھیں ہم سے روزانہ کی علیک سلیک کی مہلت بھی میسر نہیں۔ اک ذرا گومگو کی کیفیت کے بعد بات بالآخر سمجھ میں آجاتی ہے کہ اُس وقت مرزا جی کے گرد ضرور چند ایسے خاص لوگ تشریف فرما ہوں گے کہ وہ بوجوہ حاضرینِ محفل کی شناخت یا زیرِ گفتگو معاملے کی نوعیت کو آپ سے بھی شیئر نہیں کرنا چاہتے ہوں گے۔ یہ سچ ہے کہ مرزا جی دوستوں کے دوست ہیں اور جن کے دوست ہیں اُن پر جان چھڑکتے ہیں۔ اپنی کم آمیزی کے باوجود دوستوں کے درمیان باہمی اختلاط کی فضا پیدا کرنے کے جتن بھی کرتے رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں بے تکلف محفل آرائیوں کا دائرہ اور دورانیہ ذرا وسیع تر ہو جاتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ ہم انھیں مجلسی آدمی کہنے لگیں، یعنی چوپال لگانے کا شوق انھیں بالکل نہیں ہے۔ کہتے ہیں، ''ہمیں مجمع بازی کا دماغ نہیں۔'' بجا کہتے ہیں، لیکن طبیعت کی کم آمیزی کے باوجود ملاقاتیوں کا حلقہ اُن کے قرب کی خواہش میں مبتلا نظر آتا ہے، ہاں انھوں نے اپنی 'دوستی' کے معیار عمومی میل ملاپ سے الگ بنا رکھے ہیں۔ وہ خود بھی خاص حلقۂ احباب کے دائرے کو محدود بلکہ موہوم رکھنے ہی پر کوشاں دکھائی دیتے ہیں۔ چناں چہ ہم بیس بائیس برس کے تعلقات کے بعد بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ ہم ان کے ہاں کس کھاتے میں پڑتے ہیں۔ ہاں اُن کی توجہ اور تعلق کو ہم اپنے تئیں دوستی کے درجے ہی میں رکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

مرزا جی کی تہ داری کا ایک مثبت پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ اپنے سینے پر کسی فکرمندی کے بوجھ کو محسوس کرتے ہیں اور اس سے نجات پانا چاہتے ہوں تو پہلی فرصت میں مرزا جی سے مشاورت کر ڈالیں۔ اس طرح ایک طرف آپ کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور دوسری طرف ایک سنجیدہ اور ہمدرد شخص کی مشاورت سے فیض بھی حاصل کر سکیں گے۔ اس سلسلے میں ہمارا مشاہدہ یہی ہے کہ مرزا جی سے بہتر راز داں شاید ہی کوئی اور دستیاب ہو سکتا ہو — ویسے ہم خود ان کے کسی معاملے میں شریکِ راز ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ مرزا جی اپنے رویے اور انداز سے بالکل پتا نہیں لگنے دیتے کہ کس وقت موصوف کے دماغ میں کیا کچھ چل رہا ہے۔ اگر آپ نے کسی طرح ان کی پریشانی کا اندازہ لگا ہی لیا ہے تب کہیں وہ کھلتے ہیں کہ ہاں بھائی والدہ کی علالت نے فکرمند کر رکھا ہے یا اور کسی ذاتی مسئلے نے انھیں گھیر رکھا ہے۔ لیکن ہماری دانست میں ایسے مواقع شاذ و نادر ہی آتے ہیں اور جب بھی آتے ہیں تو مرزا جی چپ کا روزہ رکھ لیتے ہیں، اور اکثر ضروری معاملات میں بھی

ہوں، ہاں سے آگے نہیں بڑھتے۔ سحر بھائی (پروفیسر سحر انصاری) تو ان کے اس موڑ پر قدرے تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں، لیکن اس کارگہہ زیست میں نرم گرم حالات اور اچھے بُرے محسوسات سے کسے مفر ہے بھلا۔

جہاں تک ان کی ہمہ گیریت کا تعلق ہے تو اس بات کا پتا کسی بڑی محفل میں شریک ہو کر ہی چلتا ہے کہ موصوف کے دوستوں اور چاہنے والوں کے کتنے مختلف اور متنوع حلقے ہیں جس سے خود اُن کے مزاج کے تنوع اور رنگا رنگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ان کی یادداشت اتنی غضب کی ہے کہ سیکڑوں کے مجمعے میں بھی اپنے ملنے والوں کو ناموں سے پہچان لیتے ہیں۔ اور اگر ملاقاتی ادیب و شاعر ہے تو پھر اس کی تحریر کے حوالے سے کوئی نہ کوئی نکتہ یا فقرہ بھی کہہ دینے سے نہیں چوکتے، جس سے ان کے مدیرانہ کمالات کے علاوہ حاضر باشی اور وسیع مطالعے کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔ برسوں پہلے پڑھی ہوئی کتابوں کے فقرے کے فقرے اس طرح سنا دیتے ہیں جیسے کتاب سامنے کھول رکھی ہو یا گویا کل ہی مذکورہ کتاب کا مطالعہ کیا ہے۔ بعض جویائے علم اس سلسلے میں ان سے رابطہ کرتے رہتے ہیں، خاص طور پر انگریزی ادب کے سلسلے میں، جو کہ اعلیٰ تعلیمی مدارج میں مرزا جی کا نصاب رہا ہے، اور ان کی حاضر جوابی اور بلا کے حافظے کی داد دیتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست تو انھیں Ready Reckoner کہتے ہیں۔ یہ وہ خوبی ہے جس سے ہم خود عمر کی اس منزل میں تیزی کے ساتھ محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ چناں چہ ہمیں مرزا جی سے اس خاص معاملے میں ذرا حسد سا محسوس ہونے لگا ہے اور کیوں نہ ہو کہ باعتبارِ عمر ہمارے اور ان کے درمیان اچھا خاصا جنریشن گیپ موجود ہے جب کہ علمی و ادبی لحاظ سے وہ ہم سے اتنی ہی زیادہ بلندی پر فائز ہیں۔

غالب نے سچ ہی لکھا ہے کہ ''مغل بچے جس پر مرتے ہیں اسے مار رکھتے ہیں۔'' یار لوگوں نے مذکورہ فقرے کو بالعموم غالب کی خوش خیالی، تخلیقی اپج اور بے مثال عبارت آرائی کے خانے میں ڈال رکھا ہے، لیکن ہمارے مرزا جی نے تو دوستوں کے معاملے میں اسے گویا اپنا منشور بنا رکھا ہے۔ چناں چہ جس شخص سے جتنے گہرے مراسم ہوتے ہیں وہ اُسے لکھنے پڑھنے کے کام سے اتنا ہی لادتے چلے جاتے ہیں اور توقعات کی ایک بھاری بھرکم گٹھڑی ہر یار جانی کے سر پر لاد کر کمر پر تھپکی دیتے ہیں اور کسی دور دراز منزل کی طرف روانہ کر دیتے ہیں۔ کسی شام ٹیلی فون آتا ہے اور علیک سلیک کے مراحل طے ہوتے ہی نہایت چونچالی لہجے میں اطلاع دیتے ہیں کہ ''یار وہ فلاں خاتون ہیں نا، ان کی کہانیوں کی کتاب آ گئی ہے۔ بھائی سبحان اللہ، نہایت دیدہ زیب اور شان دار، دیکھیے گا تو ضرور داد دیجیے گا اور افسانے تو آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ اچھے لکھتی ہیں۔ ادھر بہت دنوں سے اچھے افسانوں کی کوئی کتاب شاید آئی بھی نہیں تھی۔'' ہم سامنے کھلی فائل سے سر اُٹھا کر جواباً عرض کرتے ہیں۔ ''مرزا جی خواتین تو کم و بیش سب ہی دیدہ زیب ہوتی ہیں اور جن صاحب کی تعریف آپ جیسا با ذوق آدمی کر رہا ہو اس کے شان دار ہونے میں کس کافر کو شبہ ہوگا۔'' ہماری بات کاٹتے ہوئے کہتے ہیں، ''جناب یہ اوصاف خاتون کے نہیں، کتاب کے بیان ہوئے ہیں—'' عرض کیا، ''خیر کوئی مضائقہ نہیں— جب کتاب

آپ نے چھاپی ہے تو دیدہ زیب تو یقیناً ہوگی، لیکن بڑے بھائی یہ تو بتائیے کہ یہ محترمہ آخر ہیں کون، جن کا ذکرِ خیر اتنے تپاک سے ہو رہا ہے۔" اُدھر سے فوراً ایک تیز فقرہ آتا ہے۔ "یار آپ بھی خوب آدمی ہیں۔ بھئی آپ مل تو چکے ہیں، ان سے ہمارے اسٹوڈیوز میں۔" عرض کیا، "جناب آپ کے نگار خانے میں تو ایک سے ایک بتِ طناز کی زیارت نصیب ہوتی رہتی ہے، جن کی جلوہ سامانیوں سے نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں، لیکن ایسے ہجومِ مہ وشاں میں سے کسی خاص الخاص خاتون کا نام بھلا کیوں کر یاد رکھا جا سکتا ہے۔ بھائی یہ موقع تو خود اپنے آپ کو بھول جانے کا ہوا کرتا ہے۔" جواباً مرزا جی کا خاص بلند آہنگ اور زندگی سے بھرپور قہقہہ سنائی دیا مگر اس دفعہ فقرے کی دھار زیادہ کٹیلی محسوس ہوئی — فرمایا، "مظہر صاحب آپ کی یادداشت کا معاملہ اب خاصا دگرگوں ہوتا جا رہا ہے۔ یار کچھ بادام وادام کھائیے۔ بھائی صاحب! یہ وہی خاتون تو ہیں جن کی تین کہانیاں ہم نے پچھلے برس کے "مکالمہ' میں شائع کی تھیں اور ان پر ایک نوٹ خاصی تعریف و توصیف کے ساتھ جناب ہی نے تحریر فرمایا تھا۔ چناں چہ اب محترمہ کا اصرار ہے بل کہ شدید اصرار ہے کہ کتاب کی تقریبِ اجرا کے موقع پر مضمون مظہر صاحب بھی پڑھیں گے۔" (حالاں کہ مرزا جی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسی کوئی تجویز ہمارے باب میں غیر دوستانہ دھمکی سے کم نہیں ہوا کرتی)۔ چناں چہ اس بار بھی ہم انکار کیا ہی چاہتے تھے کہ انھوں نے ایک ہی سانس میں حکم صادر فرما دیا، "دیکھیے جناب، ہم نے آپ کی طرف سے وعدہ کر لیا ہے اور بس۔ سحر صاحب (پروفیسر سحر انصاری) نے بھی آپ کے نام پہ ڈبل ٹک مارک کیا ہے۔ گویا اس درخواست میں ان کی خواہش بھی شریک ہو گئی ہے۔ تقریب کی صدارت بھی پروفیسر سحر انصاری صاحب ہی کریں گے۔ لڑکا کتاب لے کر چل پڑا ہے۔ بس ایک نظر ڈال لیجیے۔ پچھلی تحریر بھی سامنے ہوگی۔ بس ڈیڑھ دو صفحے مزید کافی ہوں گے۔ دعوت نامہ چھپنے چلا گیا ہے۔' لیجیے چھٹی ہوئی — یہ یک طرفہ گفتگو دراصل اتنے یقین کے ساتھ کی گئی تھی کہ ہمارے ممیاتے ہوئے احتجاج کی گویا کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ یوں بھی مرزا جی کے فرمان سے روگردانی کی کیا مجال ہو سکتی تھی کہ ان کے مرزا خانی تحکم میں اپنائیت کی چاشنی خاصی گاڑھی ہوتی ہے۔

پھر کسی اور دن فون آتا ہے۔ لہجے میں تیزی ہے کہ جیسے بہت عجلت میں ہوں۔ کہتے ہیں، "بھئی وہ آپ نے شمس الرحمٰن فاروقی کی داستان کے حوالے سے "شاہی، ساحری، صاحب قرانی" جو آئی ہے، وہ تو پڑھ لی ہے نا۔" عرض کیا، "ہاں سرسری طور پر تو دیکھ لی ہے، لیکن اسے ذرا دل جمعی سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ سو آج کل وہی کچھ دیکھ رہا ہوں۔" "بس تو پھر ٹھیک ہے اگلے ہفتے آپ کے دفتر میں اس کتاب پر مختصر سی گفتگو ریکارڈ کر لیں گے اور چائے وائے آپ کے ساتھ پی جائے گی۔ یار شمس الرحمٰن فاروقی نے کتاب میں بعض اچھے نکات اُٹھائے ہیں — سحر صاحب نے بھی وعدہ کر لیا ہے۔ ایک آدھ دوست کو اور کہہ دیں گے۔ کیا خیال ہے؟" ہم نے ذرا دھیمی آواز میں عرض کیا، "لیکن برادرِ عزیز آخر اتنی عجلت کی ضرورت کیا ہے بھلا۔" کہنے لگے، "سبحان اللہ! بھئی مکالمہ تیاری کے آخری مراحل میں ہے اور اس شمارے میں اس کتاب پر گفتگو آنی

ضروری ہے۔" "اچھا، مگر ابھی تو ہفتے میں چار پانچ دن باقی ہیں، اس عرصے میں معلوم نہیں کیا افتاد پیش آئے؟" "ارے یار مظہر صاحب، کچھ نہیں ہوگا، کوئی افتاد و وفتاد نہیں۔ اگر ہفتہ سوٹ نہ کرتا ہو تو اتوار یا پیر کو یہ کام ضرور ہو جانا چاہیے۔ ورنہ بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔" سو جناب اس طرح گڑبڑا ہٹ پیدا کر دینے والے واقعات مہینے دو مہینے میں ضرور پیش آ جایا کرتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں انھوں نے اسی طرح کی متعدد ذمہ داریاں کراچی، لاہور، اسلام آباد، ملتان، فیصل آباد اور نہ جانے کہاں کہاں دوستوں میں بانٹ رکھی ہوں گی۔ کسی سے تنقیدی مضمون کی فرمائش کی گئی ہوگی اور کہیں تازہ افسانے لکھوائے جا رہے ہوں گے۔ تازہ واردانِ ادب میں تخلیقی جوہر کی تلاش ایک الگ اور مشکل کام ہوتا ہے اور ہمارے مرزا جی اس معاملے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ چناں چہ "مکالمہ" کے ہر شمارے میں دو چار تازہ دم لکھنے والوں کی تحریریں بطور خاص شامل ہوتی ہیں۔ اپنی سرشت میں وہ خود بھی مشکل پسند اور نکتہ جو واقع ہوئے ہیں۔ ادبی رسالے کو بارہ مصالحہ کی چاٹ بنانے کے قائل نہیں ہیں اور نہ اِدھر اُدھر سے بہت سی نئی پرانی تحریروں کو یک جا مرتب کرنے کی جگالی کو پسند کرتے ہیں، بل کہ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ ہر اشاعت کے مندرجات کی بابت پیشگی پلاننگ کرتے ہیں اور پھر دوستوں کو اپنے طے شدہ پلان کے مطابق رنگ آمیزی کے کام پر لگاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مرتب کیے ہوئے "مکالمہ" کے ہر شمارے کا رنگ چوکھا ہوتا ہے۔ اصل میں اس کی وجہ مبین مرزا کا اپنے پرچے اور ادب سے کمٹ منٹ ہے۔ وہ جن ادبی قدروں پر یقین رکھتے ہیں، اُن کا پوری طرح لحاظ کرتے ہیں۔ ادبی رسالے کو اکثر مدیرانِ گرامی اپنی فلاح کا ذریعہ بناتے ہیں اور اس سے تعلقات کماتے ہیں۔ مبین مرزا کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ "مکالمہ" کے معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش میں تعلقات کی پروا نہیں کرتے، بل کہ خراب کر لیتے ہیں۔ اصل میں پی آر کا تو مرزا جی کے ہاں کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ ہاں وہ پیار کے آدمی ضرور ہیں۔ جس پر پیار آ گیا، اسے اپنا بنا لیا، ورنہ کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے۔ دراصل انھوں نے اپنے لیے خود کچھ حدود وضع کر رکھی ہیں، مثلاً یہ کہ شاعر ہیں اور بہت اچھے شاعر ہیں مگر مشاعرے نہیں پڑھتے۔ لوگ تقریبات میں، سیمیناروں اور کانفرنسوں میں جانے کے لیے تعلقات استعمال کرتے ہیں اور ہمارے مرزا جی آئی ہوئی دعوتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ بس ایک شہر لاہور ہے جہاں جانے سے وہ کبھی انکار نہیں کرتے، ورنہ میں نے انھیں کینیڈا اور برطانیہ کی دعوتوں سے انکار کرتے دیکھا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں برطانیہ کے ایک سیمینار کا بلاوا تھا۔ سحر بھائی نے بھی سمجھایا، ہم نے بھی اصرار کیا مگر مرزا جی کا ایک ہی جواب کہ موضوع ہماری دل چسپی کا نہیں۔ بہرحال ذکر ہو رہا تھا "مکالمہ" کے لیے اُن کے طریقِ کار کا اور ہم بتا رہے تھے کہ وہ اس کے لیے دوستوں کو تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی کام سونپتے رہتے ہیں۔ اس عرصے میں ہم نے فرار کے کچھ نئے راستے نکال لیے ہیں کہ خرابیِ صحت اور عدم الفرصتی وغیرہ کے عذر ان کے لیے کچھ زیادہ لائقِ اعتنا نہیں رہے ہیں۔ لہٰذا اب فوری حکم سے بچنے کے لیے ہم کسی ایسے کام کا

حوالہ دے دیتے ہیں جس کی ان کی نظر میں قدرے زیادہ اہمیت ہوتی ہے اور وہ ہمارے مذکورہ عذر کو سن کر ہاتھ ذرا ہولا کر لیتے ہیں، لیکن اس بہانے کو بھی آخر چند دنوں میں ختم ہو جانا ہوتا ہے جس کے بعد اُن کا مرزا خانی حکم پھر بحال ہو جاتا ہے۔

اس طرح کی دوستانہ تانا شاہی کا رویہ کچھ ہم سے ہی مخصوص نہیں ہے، بل کہ جن جن دوستوں سے وہ بطورِ خاص خلوص برتتے ہیں سب ہی ان کے اس طرفہ طرزِ تپاک کے عادی ہو چکے ہیں۔ اُدھر اسلام آباد میں ڈاکٹر رشید امجد، محمد حمید شاہد، پروفیسر فتح محمد ملک، ڈاکٹر نجیبہ عارف، منشا یاد، (یعنی جب تک وہ حیات رہے) وغیرہم اور لاہور میں ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر امجد طفیل، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ڈاکٹر ضیاء الحسن ہیں۔ ہندوستان میں شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، ڈاکٹر افضال حسین، ڈاکٹر علی احمد فاطمی وغیرہم کے ساتھ یہی معاملہ ہے۔ کسی کو ای میل اور کہیں ٹیلی فون ہو رہے ہوتے ہیں۔ ادھر کراچی میں تو ایک لمبی فہرست ہے۔ ان میں رضی مجتبیٰ، سحر انصاری، ڈاکٹر رؤف پاریکھ، عنبریں حسیب عنبر، باقر نقوی، سلیم یزدانی اور معلوم نہیں کون کون ہیں جو مرزا جی کی مرزا خانی کے خوگر ہو چلے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ وہ خود انتھک محنت کرنے والے آدمی ہیں اور انھیں ہر کام میں پرفیکشن کا خبط چڑھا رہتا ہے اور وہ بھی پابندیٔ وقت کے ساتھ۔ یہ وہ خداداد صلاحیتیں ہیں جو ہر ایک کو بھلا کہاں نصیب ہوا کرتی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ کراچی کی معاشرتی اور کاروباری زندگی کا اپنا مخصوص ڈھب اور چلن بن گیا ہے جس کو افراتفری کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہاں ہفتے میں بہ مشکل چار ساڑھے چار دن کام ہوتا ہے۔ اس پر بھی اکثر جلسے جلوسوں، ہڑتالوں اور دھرنوں نے شہر کی فضا کو خوف و ہراس میں مبتلا کر رکھا ہوتا ہے۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ، ٹریفک جام یا اچانک گولی کا چل جانا اور اسی قسم کی دوسری خرافات اس شہر کے معمولات میں شامل ہو چکے ہیں۔ معلوم نہیں کب کس بات پر بھگدڑ مچ جائے۔ آدمی ہر وقت خود کو دلدل کے کنارے کھڑا محسوس کرتا ہے کہ نہ جانے کدھر سے کوئی دھکا دے دے۔ اردو بازار کے کاروباری ہتھکنڈے، سفاک طور طریقوں اور جان لیوا مسابقتی لوٹ کھسوٹ کے درمیان اگر کوئی شخص کسی اضافی سرمایے اور سہارے کے بغیر محض اپنی ذاتی کاوش، سوجھ بوجھ، محنت، حوصلے اور اپنے کام سے بے لوث وابستگی کے ذریعے باعزت زندہ رہنے کی داد طلب کرتا ہے بل کہ تمام تر مزاحمتوں کے باوجود اعلیٰ ترین ادب پر مشتمل یکے بعد دیگرے ایک سے ایک یادگار اور دیدہ زیب کتابوں کی قطاریں بھی لگاتا اور ادب کی تعمیرِ نو میں اپنا حصہ مسلسل شامل کیے چلے جاتا ہے — تو ایسے آدمی کو ایک کامیاب اور مثالی آدمی تو بہر حال ماننا ہی پڑے گا۔ کم از کم اس بات کی گواہی تو ان منافقین سے بھی مل جائے گی جو بظاہر دوستی کا دم تو بھرتے ہیں لیکن مرزا جی کی مسلسل کامیابیوں پر اندر سے خوش نہیں ہوتے، بل کہ ہر لحہ انھیں نقصان پہنچانے کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اپنی ذات پر مکمل اعتبار کی دولتِ بے پایاں ہی ہوتی ہے جو آدمی کے مزاج میں قناعت و ایثار کی شاداب کیفیت اور سرشاری پیدا کرتی ہے جو ہمارے مرزا جی کے اسلوبِ حیات اور رہن سہن میں بطورِ خاص

نمایاں ہے۔ سلیقہ مندی، خوش لباسی اور خاص نوع کا رکھ رکھاؤ مرزا جی کی شخصیت کے نمایاں جوہر ہیں۔ چال ڈھال کی بابت کم و بیش وہی معاملہ ہے جو ''زہرِ عشق'' میں مرزا رسوا کہہ گئے ہیں یعنی:

اس سن و سال پہ کمالِ خلیق
چال ڈھال انتہائی نستعلیق

مجلسی آداب، خوش گفتاری کے جوہر تو جیسے مرزا جی نے دلّی کی تہذیبی وراثت سے پائے ہیں۔ پھر ملتان اور لاہور کے ثقافتی ماحول سے بھی وہی انداز و اطوار سیکھے جو ان کے فطری مزاج میں جذب ہو سکتے تھے، یعنی صاف گوئی، شگفتہ مزاجی، خوش خلقی، بزرگوں کا احترام اور روزمرہ معمولات میں شائستگی وغیرہ۔ عام میل جول میں بھی نسبتاً سادہ مزاجی اور کشادہ دلی سے کام لیتے ہیں۔ وہ جس شعبے سے وابستہ ہیں اس میں صرف لکھنے پڑھنے والوں ہی سے واسطہ نہیں پڑتا بلکہ مختلف مراحل پر مختلف ہنر مندوں سے بھی نبٹنا ہوتا ہے۔ ہم نے کسی موقعے پر انھیں کسی معاملے میں اُلجھتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ کسی سے سخت گیری کا انداز اختیار کرتے ہوئے پایا ہے۔ اپنے اصولوں کے دائرے میں رہ کر وہ ہر ایک سے نرم زبان میں گفتگو کرنے کے عادی ہیں اور بالآخر زبان کی نرمی اور مٹھاس ہی لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ یہ ان کے کردار کا ایک پہلو ہے، لیکن دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ جن سے ان کے مزاج اور طور طریقے میل نہیں کھاتے، ان سے یکسر کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور اگر نوبت اختلاف کی آ جائے تو اُن کا مغل خون اپنا جوہر اور ہی طرح دکھاتا ہے۔ بس یوں کہیے کہ شمشیرِ براں ہو جاتے ہیں۔

شکل و صورت کی دل کشی، خوش لباسی، شیریں کلامی، منکسر المزاجی اور پُرخلوص دوستانہ سلوک ان کی شخصیت میں غیر معمولی جاذبیت پیدا کرنے والے اوصاف ہیں اور جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسی موہنی شخصیت کے گرد مکھیاں بہت بھنبھنایا کرتی ہیں۔ کبھی کوئی خاتون مرزا جی کے علم و فضل سے فیض پانے کے لیے ان کے دفتر کے چکر پہ چکر لگا رہی ہوتی ہے اور اپنی کتاب کی اشاعت میں مشاورت طلب کرتی ہے، کبھی کسی زہرہ جمال کو کسی کتاب کی تلاش ان تک کھینچ لاتی آتی ہے اور کبھی کوئی اپنی خوش ادائیوں کی تاثیر دیکھنے چلی آتی ہیں اور مرزا جی کو اپنی تخلیقات کا پلندہ دے جاتی ہیں کہ وہ اسے بہ نظرِ اصلاح دیکھ ڈالیں۔ یہاں تک تو سب ٹھیک ہے کہ لکھنے پڑھنے والے لوگ بالعموم زنانہ اور مردانہ کمپارٹمنٹ کے قائل نہیں ہوتے اور کسی ذہنی فتور کے بغیر بھی آپس میں دوستانہ رکھ رکھاؤ اور تعلقات رکھتے ہیں، لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ کبھی کبھی آپ کی خوش طبعی بھی وبالِ جان بن جاتی ہے۔ چناں چہ ایک خاتون جنھیں بزعمِ خویش افسانہ نگاری سے شغف تھا، اکثر صبح سویرے مرزا جی کے دفتر پہنچنے لگیں۔ ایک دن انھوں نے نوید سنائی کہ رات انھوں نے ایک مختصر افسانہ لکھا ہے جسے وہ مرزا جی کو خود سنانے لائی ہیں۔ یہ بالعموم مرزا جی کی مصروفیت کا وقت ہوا کرتا ہے۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ محترمہ افسانہ چھوڑ جائیں اور مرزا جی خود پڑھ کر اپنی رائے دے دیں گے لیکن ان محترمہ نے بھی

ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں اور بالآخر اپنا شہ پارہ سنا کر ہی دو ڈھائی گھنٹے بعد بہ مشکل تمام رخصت ہوئیں۔

شام تک یہ خبر مختلف ذرائع سے ہوتی ہوئی ہم تک بھی پہنچ گئی تھی۔ چناں چہ شام کو ہم نے مرزا جی کی خیریت دریافت کرنے کے لیے انھیں فون کیا کہ افسانہ نگار خاتون کے بارے میں ہمیں کچھ کچھ اندازہ تو ہے ہی کہ ان کے بارے میں بعض لوگ خوش جمال دوستوں کو ردِ بلا کا تعویز باندھنے کا مشورہ دیا کرتے ہیں ”لیکن بھائی افسانہ کیسا تھا؟“ جواباً مرزا جی نے با آوازِ بلند لاحول ولا پڑھ دیا۔ رفتہ رفتہ محترمہ کا یک طرفہ التفات بڑھتا ہی چلا گیا۔ ایک دن ایک خاتون نے نوید سنائی کہ محترمہ نے اپنی بعض سہیلیوں سے کہنا شروع کر دیا ہے کہ مبین مرزا بہت جلد ان سے دوسری شادی کرنے والے ہیں۔ بس پہلی بیگم سے اجازت حاصل کرنا باقی ہے۔ یہ خبر ہمارے لیے بہت تشویش ناک تھی حالاں کہ ہمیں اس خبر کے غلط اور بے بنیاد ہونے کا یقین تھا کیوں کہ مرزا جی کے ذوقِ جمال کا اندازہ تو ہمیں بھی تھا۔ چناں چہ ہم نے اس بات کو محض افواہ بازی کے خانے میں ڈال کر نظر انداز کر دیا تھا، لیکن ان محترمہ نے ایک معرکتہ الآرا کام یہ کیا کہ معلوم نہیں کس طرح مرزا جی کی بیگم صاحبہ کا موبائل فون کا نمبر حاصل کر لیا اور ایک دن انھیں فون کر دیا اور لگیں مرزا جی کی تعریف و توصیف کے قصیدے سنانے اور یہ کہ بیگم مبین آپ بہت خوش قسمت خاتون ہیں کہ مرزا جی جیسا شوہر نصیب ہوا ہے۔ بیگم مرزا بھی تا دیر خوش مزاجی کے ساتھ ان کی بے معنی اور بے ربط باتیں سنتی رہیں، لیکن ایک مصروف خاتونِ خانہ کے لیے دوپہر سے پہلے کا وقت بڑے توڑے کا وقت ہوا کرتا ہے۔ چناں چہ بیگم مرزا نے آخر یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ میں ابھی مصروف ہوں آپ سے پھر کسی وقت فرصت میں گفتگو ہوگی۔ جواباً انھوں نے خواہش کا اظہار کیا کہ آپ اجازت دیں تو میں خود ہی آپ سے ملنے آ جاؤں گی۔ رات جب مرزا جی گھر لوٹے تو بیگم نے سارا قصہ سنا دیا۔ مرزا جی نے انھیں بتا دیا کہ محترمہ ذہنی مریضہ ہیں اور مختلف لوگوں کے بارے میں جن پر وہ یک طرفہ طور پر ملتفت ہو جایا کرتی ہیں اسی قسم کی افواہیں اڑاتی اور بہتان لگاتی پھرتی ہیں۔ آئندہ آپ نہ ان کا فون اُٹھایئے اور نہ اپنے گھر کا پتا بتایئے۔ ہم نے اپنے دفتر میں ان کا داخلہ بند کر دیا ہے— احتیاط بہتر ہے۔ لیکن ہر احتیاط کے باوجود محترمہ ایک دن پوچھتے پاچھتے مبین مرزا کے گھر پہنچ ہی گئیں اور وہاں دو تین گھنٹے صرف کر کے گھر کے لوگوں سے غیر معمولی بے تکلفی کا اظہار بھی فرمایا اور مرزا جی سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ڈنکا بھی خوب پیٹا اور یہاں تک کہہ ڈالا کہ ان کا جی تو اسی گھر میں رہ جانے کو چاہتا ہے۔ ایک طرح سے ان کا یوں مرزا جی کے گھر پہنچ جانا بہتر بھی ہوا کہ اب بیگم مرزا کو ان کے ذہنی مریض ہونے میں شبہ ہی نہیں رہا تھا اور ان کی شکل وصورت اور مجہول سی شخصیت کو دیکھ کر مرزا جی کی بیگم کو ان خاتون کی باتیں بے سروپا ہی معلوم ہوئیں کہ وہ اپنے میاں کی خوش ذوقی اور مزاج سے اچھی طرح واقف تھیں۔

دوسرے دن دوپہر میں آرٹس کونسل سے سحر بھائی کا فون آیا کہ بھائی ایک فوری مشاورت درکار ہے یا تو آپ اِدھر آ جائیں ورنہ ہم آپ کے دفتر آ جاتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا ہمیں آپ کے پاس پہنچنے میں ایک گھنٹا

تو لگ ہی جائے گا کہ گاڑی فوری طور پر دستیاب نہیں، لیکن آپ تشریف لا رہے ہیں تو ہم کھانے پر آپ کے منتظر ہیں۔ چناں چہ تھوڑی دیر میں سحر بھائی اور مرزا جی تشریف لے آئے اور ہمیں پہلی بار ان خاتون کی ستم ظریفیوں کی تفصیل سے آگاہی ہوئی۔ مرزا جی نے بتایا کہ محترمہ روزانہ درجنوں میسیج (ایس ایم ایس) ان کے فون پر بھیجا کرتی ہیں اور اس سلسلے میں انھیں دن اور رات کی بھی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ مرزا جی نے انھیں ضائع کرنے کے بجائے محفوظ کرلیا ہے۔ گزشتہ بیس پچیس دنوں میں انھوں نے سیکڑوں پیغامات بھیجے ہیں۔ مرزا جی نے بتایا کہ اب محترمہ کی ذہنی کیفیت روز بہ روز ابتر ہوتی جارہی ہے اور انھوں نے کھلے عام مرزا جی کے ساتھ اپنے عشق کا اظہار کرنا شروع کردیا ہے اور دوسری شادی کی خواہش بھی (غائبانہ طور پر ہی سہی) زیادہ شدت اختیار کرگئی ہے۔ لہٰذا مسئلہ یہ تھا کہ ان حالات سے اب کیسے نمٹا جائے۔ ہم جانتے تھے کہ جوابی کارروائی میں مسئلہ زیادہ اُلجھ سکتا ہے۔ پہلے تو ہم لوگوں نے اس گمبھیر مسئلے کو ہنسی مذاق میں اڑا دینا چاہا تھا لیکن مرزا جی کی سنجیدگی کے پیشِ نظر فیصلہ ہوا کہ سب سے پہلے محترمہ کے گھر والوں سے رابطہ پیدا کیا جائے اور انھیں پوری صورتِ حال سے آگاہ کردیا جائے اور موبائل میں محفوظ پیغامات بھی انھیں فارورڈ کردیے جائیں کہ وہ اپنی بیٹی کو سمجھائیں۔ حسنِ اتفاق سے محترمہ ہمارے سحر بھائی سے بھی رابطے میں رہتی تھیں اور ان کے بڑے بھائی صاحب جو کسی بینک میں ملازم تھے اور وہ بھی سحر بھائی کو اور شاید ہمیں بھی جانتے تھے، وہ کبھی کبھی آرٹس کونسل کے جلسوں میں بھی آتے رہتے تھے۔ لہٰذا سحر بھائی نے انھیں ہمارے دفتر ہی سے فون کیا اور بتایا کہ آپ کی بہن کے تعلق سے کچھ شکایتیں پیدا ہوگئی ہیں اور اس سلسلے میں جلد از جلد ملنا چاہتے ہیں اور کچھ موبائل میسجز ہیں جو انھیں فارورڈ کیے جارہے ہیں۔ ان صاحب نے دوسرے دن شام کو ہمیں اپنے گھر بلالیا اور ہم تینوں وہاں وقتِ مقررہ پر پہنچ گئے۔ اس عرصے میں بیشتر میسیج بھی انھیں منتقل کیے جاچکے تھے۔ چناں چہ محترمہ کے گھر والوں نے ہماری باتیں نہایت سکون سے سنیں اور کہا کہ جو کچھ آپ لوگوں نے بتایا ہے اس کے درست ہونے میں ہمیں کوئی شک نہیں ہے کہ آج کل ان کی ذہنی حالت بہت خراب چل رہی ہے۔ اس قسم کی حرکت وہ ایک اور صاحب کے ساتھ بھی کرچکی ہیں۔ ان کا علاج شروع کردیا گیا ہے۔ ویسے بھی ایک آدھ ہفتے میں انھیں تبدیلیِ آب وہوا کے لیے کراچی سے باہر بھیجا جارہا ہے——اس کے بعد ان محترمہ کا کوئی تذکرہ سننے میں نہ آیا اور یوں ہمارے مرزا جی کو خودساختہ دوسری بیگم سے نجات ملی۔

مرزا جی کے بزرگوں نے دلّی کے بعد پاکستان میں وطنِ ثانی کے لیے ملتان شہر کا انتخاب کیا۔ مرزا جی کی تعلیم کے ابتدائی مراحل ملتان میں طے ہوئے اور یونی ورسٹی کے مراحل لاہور میں ہوئے۔ انگریزی ادبیات میں پنجاب یونی ورسٹی سے پوسٹ گریجویشن کررہے تھے کہ فائنل ایئر کے امتحان سے پہلے بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر کراچی منتقل ہوگئے اور یہاں کراچی یونی ورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ لاہور میں طالب علمی کے دور کو مرزا جی اپنی زندگی کے بہت خوش گوار زمانے سے تعبیر کرتے ہیں۔

جب زندگی گویا ہر طرح کی فکر و تردد سے آزاد تھی۔ لکھنے پڑھنے کے شوق اور ادبی ذوق کی بارآوری بھی اُسی زمانے میں خوب میسر ہوئی۔ اسی لیے وہ لاہور کے قیام کو نہایت سرسبز اور ہنگامہ پرور دور کہتے ہیں اور جب بھی اس دور کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کی آواز میں کچھ عجب طرح کی کھنک، آنکھوں میں چمک اور طبیعت میں جذباتی وفور نمایاں نظر آتا ہے۔ لاہور کے ذکر پر ایک دن کہنے لگے — ہمارا معمول تھا کہ ہم کلاس وغیرہ سے فارغ ہوتے ہی بس چند لمحوں میں ہم جماعتوں سے پیچھا چھڑا کر سیدھے سراج منیر کے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے دفتر کی طرف دوڑ لگاتے تھے اور پھر دن کا بیشتر حصہ گویا وہیں گزر جاتا تھا۔ سراج منیر سے ہماری بالمشافہ ملاقات ۱۹۸۵ء کے آس پاس ہوئی تھی اور ہمارے ایک بزرگ دوست شہزاد احمد کے توسط سے۔ شہزاد احمد نے اس ملاقات کا جواز بھی خوب نکالا تھا۔ کہنے لگے، چلو آج تمھیں سراج منیر سے ملوا دوں کہ تم دونوں ایک دوسرے کی دوستی سے خوشی محسوس کرو گے۔ اسے بھی بات بات میں نکتہ وری پیدا کرنے کا ایسا ہی شوق ہے جیسا تم میں ہے۔ شہزاد احمد صاحب کی اس گفتگو نے ہمارے دل میں بھی سراج منیر سے ملنے کی تمنا پیدا کر دی تھی اور شہزاد احمد صاحب کی ہم راہی میں وہاں پہنچ گئے اور بس پہلی ہی ملاقات میں سراج منیر سے ایسی دوستی ہوئی کہ اُن کا انتقال ہوئے بھی دو دہائی کا عرصہ گزر گیا اور ہم آج تک اس دوستی کا دم بھرتے ہیں۔

کراچی آنے کے بعد انھوں نے جن بزرگوں کے ہاں پہلے حاضری دی تھی ان میں جمال پانی پتی، مشفق خواجہ، جمیل الدین عالی اور ڈاکٹر جمیل جالبی وغیرہ شامل تھے۔ ایک دن بتا رہے تھے کہ کراچی آنے کے چند ماہ تک بڑی اجنبیت سی طاری رہی کہ لاہور اور کراچی کی علمی و ادبی فضا یکسر مختلف تھی۔ یہاں کوئی مال روڈ تھا اور نہ وہاں کے چائے خانے جہاں ہر وقت کہیں نہ کہیں یاروں کی محفل جمی رہتی۔ بھلا پاک ٹی ہاؤس کا یہاں کوئی نعم البدل کہاں تھا جہاں مختلف الخیال لکھنے والے اور دانش ور باقاعدگی سے جمع ہوا کرتے اور نت نئے موضوعات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ فکری اور نظریاتی اختلاف اور شخصی گروہ بندیوں کے باوجود لکھنے والوں کی گویا برادری موجود تھی اور لوگ اسی طرح باہم میل ملاپ بھی رکھتے تھے۔ لیکن کراچی میں ہم نے محسوس کر لیا تھا کہ یہاں کی فضا پر کاروباری عنصر حاوی ہے اور اداروں کی بجائے ادبی شخصیتوں کی زیادہ اہمیت ہے، جن کے گرد اپنے اپنے حلقے قائم ہیں۔ ہم نے شروع کے چند ماہ تو یہاں کی ادبی فضا کو سمجھنے میں لگا دیے مگر آہستہ آہستہ اس میں جذب ہوتے چلے گئے۔ اب لگتا ہے ہمارے مزاج میں بھی کراچی ہی رچ بس گیا ہے۔''

گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں مرزا جی کو بیٹھے بٹھائے نوکری کی کتنی ہی بار آفر ہوتی رہی اور وہ ہر دفعہ طرح دے کر صاف نکل گئے۔ ہمارے سامنے کا واقعہ ہے، جب اردو کالج، وفاقی اردو یونی ورسٹی بنا تو عالی صاحب اس کی سینٹ کے چیئرمین تھے۔ انھوں نے خود مرزا صاحب کو یونی ورسٹی کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں آنے کی دعوت دی۔ مرزا صاحب نے ڈاکٹر رؤف پاریکھ کا نام تجویز کیا جو اس وقت حبیب بینک کی ملازمت سے الگ ہو چکے تھے۔ تاہم ڈاکٹر صاحب نے اردو لغت بورڈ میں چیف ایڈیٹری کے لیے اپلائی کیا

ہوا تھا۔ اُن کا وہاں تقرر ہو گیا۔ عالی صاحب نے مرزا جی سے کہا یہ انیس ویں گریڈ کی نوکری ہے۔ آپ ذہین آدمی ہیں، جلد پی ایچ ڈی کر کے بیسویں گریڈ میں آ جائیں گے، کر لیجیے۔ مرزا جی کسی طرح تیار نہ ہوئے تو انھوں نے جھنجھلا کر کہا، آپ نے سرکاری نوکری نہیں کی، آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ انیس واں گریڈ کیا ہوتا ہے۔ مرزا جی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا، آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں کہ ہمیں نہیں معلوم کہ انیس واں گریڈ کیا ہوتا ہے، لیکن ہم جاننا بھی نہیں چاہتے کہ انیس واں گریڈ کیا ہوتا ہے اور بیسویں گریڈ کی برکات کیا ہوں گی۔ یہ ہے حضرتِ والا کا مرزا خانی مزاج۔ ایسے شخص کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ ملازمت کی سنہری پیش کش کو طرح دینے کا یہی ایک واقعہ نہیں ہے، ایسے کئی ایک واقعات ہمارے علم میں ہیں، بل کہ ہمارے دوست سلیم یزدانی جو مرزا جی کے قدر داں اور گہرے دوست ہیں، ان کا تو کہنا ہے کہ نوکریوں اور چھوکریوں کو میں نے جیسے مرزا صاحب پر برستے دیکھا ہے کہیں اور نہیں دیکھا۔ ایسے کتنے ہی واقعات کے عینی شاہد ہم بھی ہیں۔ مثلاً یہی کہ جن دنوں ہمارے مہربان جناب مسلم شمیم سینٹ پیٹرک کالج میں پڑھا رہے تھے، انھوں نے بہت چاہا کہ مرزا صاحب بھی وہ کالج جوائن کر لیں۔ اس وقت اس کالج میں اساتذہ کی ضرورت تھی۔ انھوں نے مجھ سے کہا، میں نے اور انھوں نے مل کر مرزا جی سے بات کی۔ انھوں نے اپنے ادارے کی ذمہ داریوں کا، وقت کا اور تدریسی تجربہ نہ ہونے کا عذر تراشا۔ ہر چیز کا حل انھیں پیش کیا گیا مگر وہ ہاتھ آ کے نہ دیے۔ اسی طرح بعض دوستوں نے انھیں ٹی وی چینل پر انگیج کرنے کی کوشش کی، لمز (Lums) سے آفر ہوئی، حال ہی میں اُن کے ایک عزیز دوست نے انھیں اردو لغت بورڈ جوائن کرنے کو کہا مگر مجال ہے کہ وہ ایسی کسی شے پر راضی ہوتے ہوں۔ اصل میں یہ اُن کا مرزا خانی مزاج ہے جو انھیں ”لیس سر“ والی صورتِ حال سے ہمیشہ بچائے رکھتا ہے۔

اب سوچا جا سکتا ہے کہ نوکری میں تو وہ ”لیس سر“ کے جال سے بچنا چاہتے ہیں مگر خواتین کے معاملے میں تو کشادہ دلی سے کام لیتے ہوں گے، بل کہ خوب لیتے ہوں گے کہ آخر مغلائی خانوادے سے ہیں۔ یہ ذوق تو ضرور طبیعت میں آیا ہوگا۔ جہاں تک طبیعت اور ذوق کا معاملہ ہے، ہم نے مرزا جی کو خوش نظر اور خوش ذوق پایا ہے، لیکن اس سچائی سے انکار نہیں کریں گے کہ اس معاملے میں بھی اُن کا مرزا خانی مزاج اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ وہ ملتے سب سے ہیں، بات بھی کرتے ہیں، لیکن اُن کے حلقے میں کوئی آسانی سے داخل نہیں ہو سکتا۔ ہم نے ایک نہیں کئی ایک زہرہ جبینوں اور مہ جبینوں کو اُن کے قریب آنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ کوئی پھولوں کا تحفہ لے کر اُن کے دفتر آتی ہے، مرزا جی شکریے کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں اور پھر اُسی وقت کسی دوسرے دوست کی نذر کر دیتے ہیں۔ کوئی کیک لے کر آتی ہے، مرزا جی، شکریہ کہتے ہیں اور وہ کیک وہیں محفلِ دوستاں کی نذر ہو جاتا ہے۔ کوئی خاتون مٹھائی یا سموسے لیے چلی آتی ہے جن کا کھانا مرزا جی سے زیادہ اُن کے دوستوں کو میسر آتا ہے۔ غرض مرزا جی کا التفات حاصل کرنے کی یہ ساری کوششیں اکارت جاتی ہیں۔ اس صورتِ حال میں مایوس خاتون مرزا جی کو دل ہی دل میں کوسنے دیتے ہوئے رخصت ہو جاتی ہے۔

اصل میں ہمارے مرزا جی کے مزاج میں ایک خاص طنطنہ اور شاعرانہ طبیعت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ خود سری، تمکنت اور ناز آفرینی اوّل الذکر کی دین ہیں، جب کہ حسن پرستی، خوش نظری اور ذوقِ جمال ثانی الذکر کی ودیعت۔ ان دونوں کو مرزا جی کی ذاتی نفاست اور بلند ذہنی سطح نے بھی ایک الگ رنگ دیا ہے۔ اُن کے لیے وہ خاتون قابلِ قبول ہو ہی نہیں سکتی چاہے کیسی ہی قتالۂ عالم کیوں نہ ہو، جو پڑھی لکھی نہ ہو اور اچھی گفتگو نہ کر سکتی ہو۔ مرزا جی کی توجہ خاتون کے حسن و جمال سے زیادہ اس کے ذہنی شعور پر رہتی ہے۔ وہ کردار کی خرابی کو نظر انداز کر سکتے ہیں، تلفظ کی خرابی کو نہیں۔ آپ خود سوچیے، ایسے شخص کے قریب آنے کی خواہش خود کو ہلکان کرنے کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے۔ ہاں اب سنا اور دیکھا گیا ہے کہ گزشتہ کئی برسوں سے ایک خاتون بلا شرکتِ غیرے اس میدان میں جمی نظر آتی ہیں، لیکن یہ موضوع اس سے آگے نہیں چل سکتا کہ ہمیں اپنی جان اور مرزا جی کی دوستی دونوں بہت عزیز ہیں۔

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

ہمارے مرزا جی دوستوں کے دوست ہیں۔ جس محفل میں جاتے ہیں، اپنی آراستہ گفتگو، مثالی ذہانت، غیر معمولی مطالعے اور باکمال حافظے کے بل بوتے پر جلد ہی مرکزِ نگاہ بن جاتے ہیں۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی کا سماں بندھ جاتا ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے کی قید نہیں۔ ہم نے مشتاق احمد یوسفی، مشفق خواجہ، حمید نسیم، افتخار عارف، زہرا نگاہ، فتح محمد ملک، منشا یاد، اسد محمد خاں، رشید امجد، سلیم یزدانی، باقر نقوی، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، گوپی چند نارنگ، قاضی افضال حسین جیسے زعما کی محفل میں مرزا جی کو چہکتے اور گل افشانیِ گفتار کے مظاہرے کرتے دیکھا ہے، اور ان بزرگوں کو دوستانہ بے تکلفی اور محبت کے ساتھ مرزا جی کی جانب ملتفت پایا ہے۔ ایسا ایک بار نہیں، بارہا ان آنکھوں نے دیکھا۔ اصل میں مزاج کے تیکھے پن کے باوجود ہمارے مرزا جی ایک من موہنی شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں اُن کی ذاتی ہنر مندی اور کسبِ فیض کا دخل نہیں ہوگا۔ بے شک ہوگا، لیکن یہ سارا معاملہ کسبِ فیض کا نہیں ہے، اس میں قدرت کی فیاضی کا بھی دخل ہے کہ اُس نے مرزا جی کو جوہر ہی ایسا عطا کیا ہے۔ ہاں اس جوہر کو صیقل انھوں نے خود کیا ہے۔ تاہم بات وہی یعنی: ایں سعادت بزور بازو نیست والی ہے۔

اب لگے ہاتھوں مزاج کے تیکھے پن کی حکایت بھی ذرا سن لیجیے۔ اہلِ گفتگو، فقرہ گوئی کو ہنر مانتے ہیں کہ حاضر دماغی اور حاضر جوابی کا موقع ہوتا ہے۔ مرزا جی فقرے بازی سے شغف تو خاص نہیں رکھتے مگر ہم نے انھیں ایسے ایسے تیکھے فقرے کہتے سنا ہے کہ داد اگر دیں تو کیسے اور جو چپ رہیں تو کیوں کر۔ ابھی چند ماہ قبل کراچی میں کانفرنس چل رہی تھی۔ ایک سینئر شاعرہ اور ادیبہ کہ جو اپنے بے باکانہ مزاج اور دیدہ دلیری کی شہرت رکھتی ہیں۔ چائے کے وقفے میں ملیں مرزا جی کو دیکھا، وہ سوٹ پہنے ٹائی لگائے ہوئے تھے۔ بولیں، ”آج پھر سوٹ۔ ارے تم کیا سوٹ پہنے ہوئے پیدا ہوئے تھے۔“ مرزا جی مسکرائے اور جواب دیا، ”صاحب

دیکھیے، آپ کو بے شک برہنہ مرد پسند ہیں، لیکن ہمیں خوش لباسی کا ذوق ہے۔" ہم تو ایک لمحے کو جھینپ گئے، محترمہ کا منہ بھی ذرا سا ہو گیا۔ ہم نے بعد میں مرزا جی سے کہا کہ "پیارے بھائی! ایسی بھی کیا تنک مزاجی۔ تلوار کی دھار سے تیز فقرہ۔" مرزا جی نے فرمایا، "یار اصل میں انھوں نے کل رات کھانے پر بھی یہی کہا تھا اور ہم طرح دے گئے تھے۔ اب کہا تو ہم نے سوچا ضروری ہے کہ ایک بار جواب دے ہی دیا جائے۔"

آرٹس کونسل کراچی کی پہلی کانفرنس کا واقعہ ہے۔ فکشن والے سیشن میں مرزا جی نے تقریر کی اور خوب دل پذیری کی۔ ہم پہلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے برابر میں فاطمہ حسن بیٹھی تھیں اور ان کے برابر میں گوپی چند نارنگ تھے۔ مرزا جی کی تقریر کی داد دیتے ہوئے فاطمہ حسن نے نارنگ صاحب کو مخاطب کیا اور کہا، "یہ آدمی آگے چل کر آپ ہی کی طرح اعلیٰ پائے کا مقرر بن جائے گا۔" نارنگ صاحب نے تائیداً سر ہلایا اور فرمایا، "ہاں یہ بہت اچھی گفتگو کر رہے ہیں۔" سیشن کے بعد یہ بات فاطمہ حسن نے مرزا جی کو بتائی تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولے، "معاف کیجیے، ہم تو اپنا شمار سنجیدہ پڑھنے لکھنے والوں میں چاہتے تھے۔"

اسی کانفرنس میں ایک روز ہم نے لنچ کے وقفے میں مرزا جی، سحر بھائی، شمیم حنفی، شافع قدوائی، علی جاوید، مسلم شمیم کو ساتھ لیا اور کراچی کلب لنچ کے لیے چلے گئے۔ کھانے کے بعد گپ شپ چل رہی تھی۔ ذرا سی دیر ہو گئی۔ واپس پہنچے تو اگلا سیشن شروع ہوا چاہتا تھا، جس میں شمیم حنفی صاحب اور شافع قدوائی صاحب کو اسٹیج پر بیٹھنا تھا۔ گیٹ پر احمد شاہ ملے جو اس وقت آرٹس کونسل کے جنرل سیکریٹری تھے۔ وہ سخت برہم تھے۔ آتے ہی برس پڑے، "آپ لوگوں کو ذرا احساس نہیں کہ یہاں پروگرام لیٹ ہو رہا ہے۔ ہم پریشان ہو کر مہمانوں کو ڈھونڈ رہے ہیں اور آپ انھیں لیے شہر میں گھوم رہے ہیں۔ اور پھر آپ نے اجازت بھی نہیں لی۔" وغیرہ وغیرہ۔ سحر بھائی تو خاموشی سے آگے بڑھ گئے اور قدوائی صاحب بھی۔ مرزا جی نے بات سنبھالنے کے لیے کہا، "ارے یار ہو جاتی ہے تھوڑی بہت دیر، کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔" احمد شاہ جھنجھلائے ہوئے تھے یا کیا تھا، پھر کر بولے، "نہیں یہ بہت زیادتی ہے۔ یہ تو میری کانفرنس کو سبوتاژ کرنے کی کوشش ہے۔ آپ لوگوں کو ذرا خیال نہیں ہے۔" بس اتنا سننا تھا کہ مرزا جی پلٹ پڑے۔ تیز آواز میں بولے، "احمد شاہ ایسی کوئی قیامت نہیں آئی۔ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ مت بنایئے۔" احمد شاہ نے پلٹ کر جواب دیا، "آپ یہ زیادتی کر رہے ہیں۔ یہ کانفرنس کو سبوتاژ کرنے کی کوشش ہے۔" مرزا جی نے تڑ کی پٹر کی جواب دیا، "اتنی سی بات سے کوئی کانفرنس سبوتاژ نہیں ہو سکتی اور دوسری بات آپ کو سمجھنی چاہیے، یہ کراچی آرٹس کونسل ہے اور آپ یہاں کسی مضافاتی اسکول کے پی ٹی ماسٹر کا رول کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔" خیر، اس بحث کو شمیم حنفی صاحب اور ہم نے بیچ میں پڑ کر ختم کرایا۔ حنفی صاحب نے بعد میں مرزا جی کے مضافاتی اسکول کے پی ٹی ماسٹر والے فقرے کی بہت داد دی۔

افتخار عارف صاحب جب بھی کراچی آتے ہیں، ازراہِ محبت ہمیں بھی یاد کرتے ہیں اور مرزا جی کے تو

خیر وہ پرانے قدر دان ہیں۔ ایک بار آئے ہوئے تھے تو اُن کے اعزاز میں کراچی کلب میں دوپہر کا کھانا ہم نے رکھا۔ چند ایک دوستوں کو اور بھی مدعو کرلیا۔ کھانے کے بعد دیر تک گپ شپ چلتی رہی۔ آخر ایک ایک کر کے سب ہی دوست رخصت ہوگئے اور افتخار عارف صاحب کے ساتھ ہم اور مرزا جی رہ گئے۔ افتخار عارف صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ پان کھایا جائے اور جگہ بھی بتائی کہ پی آئی ڈی سی کے عقب میں جو دکانیں ہیں، ان میں ایک جگہ عمدہ پان ملتا ہے۔ خیر ہم تینوں وہاں چل دیے۔ پان ہم دونوں نے کھایا، مرزا جی گلوری اُٹھانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ افتخار عارف صاحب قصرِ ناز میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سردیوں کے دن تھے اور موسم خوش گوار۔ کہنے لگے کہ ٹہلتے ہوئے چلتے ہیں۔ ہم نے کہا، بسم اللہ، ہم تو روز پیدل سیر کے عادی ہیں۔ گاڑی ڈرائیور کے حوالے پہلے ہی تھی سو چل دیے۔ افتخار عارف صاحب ذرا موڈ میں پرانے قصے سنا رہے تھے۔ مرزا جی کو مخاطب کرتے ہوئے بولے، ’’بھئی اپنے مرزا صاحب، ایک زمانہ تھا کہ کراچی میں گوانی لڑکیاں بہت تھیں اور اس علاقے میں سب سے زیادہ نظر آتی تھیں۔‘‘

مرزا جی مسکراتے ہوئے بولے، ’’جی سنا ہے کچھ اس کی بابت کہ اکثر مہربان مزاج کی ہوا کرتی تھیں۔‘‘ افتخار عارف صاحب کی آنکھوں میں جیسے گئے دن گھوم رہے تھے۔ بولے، ’’اکثر مال دار شرفا ان لڑکیوں کی نگاہِ التفات حاصل کرنے میں کامیاب رہتے تھے۔‘‘ ’’مال دار شرفا!‘‘ مرزا جی نے دُہرایا اور اپنا مخصوص بلند آہنگ قہقہہ لگایا پھر بولے، ’’آپ پر بھی تو توجہ ہوئی ہوگی ایسی کچھ لڑکیوں کی۔‘‘

افتخار عارف صاحب جانے کس موڈ میں تھے۔ ہنس کر بولے، ’’ہمارا پوچھنا کیا اے ساکنانِ شہرِ کراچی۔‘‘ پھر مرزا جی کا بازو پکڑ کر بولے، ’’مبین! ایک زمانہ تھا کہ میرے ساتھ روز ایک نئی لڑکی ہوتی تھی۔‘‘ پھر کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا، ’’اللہ مجھے معاف کرے۔‘‘

مرزا جی نے بلند آواز سے ’’آمین‘‘ کہا اور پھر گویا ہوئے، ’’لیکن افتخار عارف صاحب اس میں ایسی کیا خاص بات ہے۔ ایسے بھی شرفا گزرے ہیں جن کے ساتھ صبح کی حسینہ الگ ہوتی تھی اور شام کی مہ جبیں الگ اور اس کے بعد گھر جا کر اگر بیگم صاحبہ مہربان نظر آتیں تو وہاں بھی تلطف فرما لیا کرتے تھے۔‘‘ افتخار عارف نے مرزا جی کے مغل خانی تیور بھانپ لیے اور قہقہہ لگا کر موضوع بدل دیا۔

کراچی میں کانفرنس تھی، جس میں ایک رات مشاعرہ بھی تھا۔ امجد اسلام امجد صاحب بھی اس میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ مشاعرہ رات کے کھانے کے بعد تھا۔ ایک میز پر انتظار حسین، شمیم حنفی، افتخار عارف اور مسعود اشعر کے ساتھ مرزا جی اور ہم بھی بیٹھے تھے۔ کھانے کے بعد گپ شپ چل رہی تھی۔ منتظمین نے مشاعرہ گاہ میں چلنے کی دعوت دی۔ مرزا جی اُٹھے اور نکل بھاگنے کی ٹھانی۔ برابر والی میز پر امجد اسلام امجد بیٹھے تھے۔ انھوں نے مرزا جی سے کہا، ’’کہاں جا رہے ہیں آپ، آیئے مشاعرے میں چلیے۔‘‘ مرزا جی نے مسکرا کر مشفق خواجہ مرحوم کا فقرہ دہرایا کہ مشاعرے میں زیادہ جانے سے آدمی کا اخلاق خراب ہو

جاتا ہے۔ امجد صاحب بولے، ''اخلاق خراب ہوتا ہے نا تو آپ کو کیا پروا ہے؟'' (یعنی آپ کا اخلاق تو پہلے ہی خراب ہے) احباب نے قہقہہ لگایا۔ قہقہہ مرزا جی نے بھی لگایا اور بولے، ''بھئی اگر پروا نہیں ہوگی تو پھر ہمارا اخلاق بھی آپ جیسا ہو جائے گا۔'' اس جواب پر تو محفل کشتِ زعفران ہی ہو گئی۔

ہمارے مرزا جی کمیٹڈ آدمی ہیں۔ ایک بار اگر کچھ ٹھان لیں تو بس کر گزرتے ہیں۔ حالات، معاملات، مسائل، دُنیا، لوگ — کوئی چیز ایسی نہیں جو اُن کی راہ میں حائل ہو سکے۔ مزاج کا یہی رنگ اُن کی دوست داری اور دشمن داری دونوں میں یکساں طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ ''مکالمہ'' کے صفحات پر چھڑنے والی بحث میں ہم نے انھیں تنہا چو مکھی لڑتے دیکھا اور اس انداز سے دیکھا کہ رشک آیا۔ ''مکالمہ'' مرزا جی کی کمٹ منٹ کا معاملہ ہے۔ اس جریدے کو انھوں نے ایسے ہی عزیز رکھا ہے جیسے کوئی اولاد کو رکھتا ہے۔ اپنے رسالے کو بنانے سنوارنے اور اس کے معیار کو قائم رکھنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے۔ لوگ اپنے پرچے کے لیے اشتہاروں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ مرزا جی کبھی ایسا کرتے ہوئے نہیں پائے گئے، بل کہ ہم نے تو صورتِ حال اس کے برعکس دیکھی۔ نسوانی مصنوعات فروخت کرنے والی ایک کمپنی میں ایک صاحب ادب سے شغف رکھنے والے تھے۔ وہ ''مکالمہ'' کے پسند کرنے والوں میں تھے۔ بارہ تیرہ سال پہلے کی بات ہے کہ بنا مانگے انھوں نے ''مکالمہ'' کے لیے اپنی کمپنی کا اشتہار مرزا جی کو بھجوایا۔ پانچ ہزار کا اشتہار تھا، جو آج بھی ادبی رسالے کے لیے معقول رقم ہے۔ مرزا جی نے اشتہار چھاپنے سے انکار کر دیا کہ اشتہار میں دکھائی گئی خاتون کا نیم برہنہ انداز ان کے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔ ایسی ایک نہیں کئی ایک مثالیں ہمارے سامنے وقوع پذیر ہوئیں۔ لوگوں نے ادبی رسالے سے روپے بھی کمائے اور دوسرے فائدے بھی اُٹھائے، لیکن مرزا جی نے ایسی کسی شے کو توجہ کے قابل ہی نہیں سمجھا۔ سلیم یزدانی صاحب نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ ان کے مزاج میں ایک طرف شاہانہ انداز ہے اور دوسری طرف درویشی بھی پائی جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سفر کے دوران لوگوں کے اصل رنگ ڈھنگ، طبعی مزاج اور طور طریقے کھل کر سامنے آ جاتے ہیں اور روزمرہ کی معاشرتی زندگی میں لوگ خوش اخلاقی کا جو لبادہ اوڑھے پھرتے ہیں، سفر و حضر میں خود بخود اُتر جاتا ہے اور آدمی کی اصل فطرت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اس کہاوت میں یقیناً کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوگی۔ ہم نے مرزا کے ساتھ ایک نہیں کئی ایک سفر کیے اور کئی کئی دن ساتھ رہنے کے موقعے بھی ملے، لیکن مرزا جی کی ہم سفری میں نہ تو ان کے عیب و ہنر کے کوئی خفیہ آثار ہم پر نمایاں ہو سکے اور نہ ان کے شخصی مزاج، برتاؤ اور طور طریقوں میں کوئی ایسا فرق دیکھنے میں آیا جسے روزمرہ کی صورتِ حال سے مختلف کہا جائے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مسافرت میں ہم نے انھیں بھی بھلے مانسوں کی طرح گپ شپ اور ہنسی مذاق کا رسیا پایا ہے۔ ان کے ہمراہ اسلام آباد کا پہلا سفر (۲۰۰۲ء) ہماری کتاب ''آشوب سندھ اور اردو فکشن'' کے حوالے سے ہوا تھا، جس کے محرک ڈاکٹر رشید امجد تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو مذکورہ کتاب بہت پسند آئی تھی اور انھوں نے کتاب کی

تقریبِ اجرا (منعقدہ کراچی) میں نہ صرف بطورِ مہمانِ خصوصی شرکت کی تھی بل کہ ایک جامع کلیدی مضمون بھی پڑھا تھا۔ ڈاکٹر رشید امجد کی تجویز ہی پر حلقۂ اربابِ ذوق کے زیرِ اہتمام اکادمی ادبیات پاکستان (اسلام آباد) کی جلسہ گاہ میں مذکورہ کتاب کی روشنی میں ایک دل چسپ مذاکرہ منعقد ہوا تھا جس کی صدارت پروفیسر فتح محمد ملک نے کی تھی اور اسلام آباد اور راول پنڈی کے بیشتر اہم افسانہ نگاروں نے اظہارِ خیال کیا تھا جن میں محمد منشا یاد، ڈاکٹر رشید امجد، محمد حمید شاہد وغیرہم شامل تھے۔ اس تقریب کے لیے مرزا جی اور ہم اکٹھے گئے تھے۔ دو تین دن قیام کے دوران مرزا جی کو راول پنڈی، اسلام آباد کے ادیب شاعر دوست گھیرے رہتے تھے۔

مرزا جی کے ساتھ دوسرا اور تیسرا سفر بھی اسلام آباد اور لاہور تک رہا تھا۔ ہماری ضخیم کتاب "جدید سندھی —رجحانات، میلانات، امکانات" کو اکادمی ادبیات پاکستان نے سن ۲۰۰۴ء کی بہترین نثری کتاب کے طور پر منتخب کیا تھا اور ہمیں مولوی عبدالحق ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ اس کتاب کی ناشر اکادمی بازیافت ہی ہے۔ چناں چہ اسلام آباد کی تقریبِ اجرا میں ہم دونوں اکادمی ادبیات کے مہمان ہوئے تھے اور ان ہی کے مہمان خانے میں مقیم تھے۔ اس سفر کے دوران راول پنڈی اور اسلام آباد کے احباب نے مشاعرہ رکھ ڈالا جس کے مہمانِ خصوصی بنائے گئے مرزا جی، لیکن وہ مہمانِ خصوصی تو کیا بنتے، مشاعرے میں شرکت ہی پر آمادہ نہ ہوئے۔ جواز یہ کہ "ہم نے برسوں پہلے مشاعرہ پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔" احباب نے بڑا زور لگایا، ہم نے بھی سمجھایا، لیکن وہ بھلا کہاں کسی کی مانتے ہیں۔ وہ تقریب چوں کہ ہم دونوں کے اعزاز میں تھی اور اُس کا پہلا اجلاس فکشن اور معاصر تنقید سے متعلق تھا، لہٰذا اس میں ہم شریک ہوئے۔ دوسرا حصہ مشاعرہ تھا۔ مرزا جی نے اسٹیج سے اُٹھ کر سامعین میں جا کر کرسی سنبھالی۔ اس تقریب کے بعد رشید امجد، محمد حمید شاہد، علی محمد فرشی نے بعض دوسرے احباب کے ساتھ پھر منڈلی جمائی۔ قریبی دوستوں کی اس محفل میں مرزا جی نے شعر سنائے اور ہم پر یہ راز پہلی بار منکشف ہوا کہ موصوف جتنے اچھے افسانہ نگار ہیں اتنے ہی فصیح و بلیغ شاعر بھی ہیں اور جدید شعرا کے درمیان قطعی مختلف اور تازہ استعارہ لکھ رہے ہیں۔ ان ہی کی دیکھا دیکھی ہماری شہ رگ جسے ہم تھپک تھپک کر سلانے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئے تھے پھر پھڑک اُٹھی اور ہم نے بھی اسلام آباد اور راول پنڈی کی متعدد نشستوں میں شرکت سے لطف اُٹھایا۔ دوستوں سے اچھی غزلیں، نظمیں سنیں اور اپنی تک بندی بھی پیش کی۔

اسلام آباد ہی کے ایک اور سفر کے دوران مرزا جی کے علاوہ اسد محمد خاں بھی شریکِ سفر تھے۔ دراصل نیشنل کونسل آف آرٹس کے زیرِ انتظام سعادت حسن منٹو کی پچاسویں برسی کے موقعے پر ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں لاہور اور پشاور کے علاوہ دوسرے شہروں سے بھی متعدد منٹو دوست ادیب شرکت کر رہے تھے۔ اس موقع پر اکادمی ادبیات نے اپنی معمارِ ادب سیریز کے تحت مبین مرزا کی کتاب "منٹو— شخصیت و فن" شائع کی تھی۔ اس تقریب کا ایک سیشن اسی کتاب پر گفتگو کے لیے مخصوص تھا، جس کی صدارت اسد محمد خاں کر رہے تھے، مبین مرزا اور منٹو کی بیٹی نگہت اس کے مہمانِ خصوصی تھے۔ منٹو کی بیٹی کے علاوہ بعض

دوسرے رشتے دار بھی تقریب میں شریک تھے۔ تقریب کے دوسرے حصے میں منٹو کے افسانے ''نیا قانون'' کی ڈرامائی تشکیل بھی پیش کی گئی تھی۔ یہ ہر اعتبار سے ایک یادگار تقریب تھی۔ تقریب کے اختتام پر افتخار عارف نے ہم تین چار لوگوں کو ایک صاحب کے حوالے کیا اور زور دے کر کہا، جلدی سے نیچے چل کر گاڑی میں بیٹھیے ہم لوگوں کو کہیں فوراً پہنچنا ہے۔ چناں چہ تعمیلِ ارشاد میں ہم، مرزا جی اور اسد محمد خاں اپنے میزبان کے ساتھ فوراً نیچے پہنچ کر گاڑی میں براجمان ہو گئے۔ راستے میں پتا چلا کہ ہم لوگوں کی منزل محترمہ کشور ناہید کا دولت کدہ ہے جہاں انھوں نے حسبِ عادت باہر سے آئے ہوئے مہمان ادیبوں کی ضیافت کا اہتمام کیا ہوا ہے۔ کشور ناہید اسلام آباد کے انتہائی پوش علاقے میں ایک نہایت شان دار اپارٹمنٹ میں رہتی ہیں۔ افتخار عارف بھی اسی شان دار کمپلیکس کے دوسرے حصے میں قیام پذیر ہیں۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا ہم مزاج صاحبانِ ادب کا اچھا خاصا حلقہ جمع کیا گیا ہے۔ ابھی ہم گاڑی سے اُتر کر کشور ناہید کے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھے ہی تھے کہ دیکھا کہ زینوں پر، برآمدے میں، راہداری اور اپارٹمنٹ کے بیرونی حصے میں نہ صرف مٹی کے دیوں سے چراغاں کیا گیا تھا بل کہ دروازے پر بھی گیندے اور گلاب کے پھولوں کی لڑیوں سے سجاوٹ کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ اس شان دار استقبال کی ندرت نے سب ہی کو مسرور کر دیا تھا اور وہاں پہنچتے ہی احساس ہو گیا کہ یہ کوئی رسمی دعوتِ طعام نہیں بل کہ ایک چاہت بھری شخصیت کشور ناہید نے اپنے خاص دوستوں کو گھر بلایا ہے جو محبت و یگانگت سے مہک رہا ہے۔ یوں بھی کشور ناہید کے نام کے ساتھ ہی گزشتہ نصف صدی کا ادبی معاشرہ بالخصوص لاہور کی ادبی فضا سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دوست داری، شفقت اور محبت کے عناصر ان میں بڑھے ہی ہیں۔ چناں چہ کشور ناہید نے ایک ایک شخص کا نام بہ نام جس خندہ پیشانی اور خصوصی توجہ کے ساتھ استقبال اور پذیرائی کی وہ بھی خود موصوفہ ہی کا حصہ ہے۔ غرض بیس پچیس خواتین و حضرات ڈرائنگ روم کے ہال میں رل مل کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہال کے ایک کونے میں بادہ گساروں کی محفل جم چکی تھی۔ جب کہ دوسری طرف افتخار عارف کی صدارت میں محتسبانِ بے مقدور نے الگ ایک کونا پکڑ لیا تھا۔ کشور ناہید نے حکم دیا،
''مظہر تم ادھر ساجد کے ساتھ بیٹھ جاؤ اور اسد بھائی کو بھی اپنے ساتھ رکھو۔'' اس عرصے میں مبین مرزا معاملے کی نوعیت سمجھ چکے تھے، چناں چہ وہ افتخار عارف والے گوشے کی طرف لپکے تو ایک مرتبہ پھر کشور نے ہانک لگائی۔

''مبین یہ تم ارغوانی محفل چھوڑ کر اود بلاؤں کی صف میں کہاں جا رہے ہو، چلو ادھر بیٹھو اسد محمد خاں کے ساتھ۔''

اس پر مرزا جی کے بڑھتے ہوئے قدم رُکے، رُخ پھیر کر کشور ناہید کو دیکھا اور بڑی تمکنت سے فرمایا، ''ہم تو آنکھوں سے پینے والے ہیں۔'' محفل کے کئی احباب نے بیک زبان سبحان اللہ کہا۔ کشور ناہید تیوری پر بل ڈال کر بولیں، ''بڑے بے شرم ہو۔ مجھ سے ایسی باتیں کرتے ہو۔'' مرزا جی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا، ''اس میں کیا بات بے شرمی کی ہے، ہم نے تو اپنا ذوق بیان کیا ہے اور معاف کیجیے گا، ایسی بھی کیا خوش فہمی کہ آپ نے یہ کنایہ اپنے لیے جانا۔ روئے سخن آپ کی طرف کیوں کر ہو سکتا، ہم ایسے بھی کور ذوق نہیں۔'' مرزا جی کی اس

جرأت اور حاضر جوابی پر حاضرین نے زوردار ٹھٹھے لگائے اور محفل کی بشاشت میں اضافہ ہو گیا۔ کشور ناہید پہلے کسمسائی اور پھر مسکرا دیں۔ وہ ایک ناقابلِ فراموش شام تھی جو نصف شب تک جاری رہی۔ ہمیں تو پتا ہی نہ چل سکا کہ ہم کب اور کس طرح اپنی قیام گاہ پر پہنچے تھے۔ صبح مرزا جی نے بتایا کہ ایک بجے کے بعد ہم چار پانچ لوگ ایک گاڑی میں لاد کر مہمان خانے پہنچائے گئے تھے۔

اسلام آباد سے واپسی پر دو ڈھائی دن کی ٹھیکی لاہور میں بھی رکھی گئی تھی کہ ہمارے ایک دوست کا اصرار تھا کہ ہم تازہ تازہ قائم کردہ لاہور یونی ورسٹی کا چکر بھی لگاتے جائیں۔ لاہور میں ہمارا قیام یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کے ریسٹ ہاؤس گلبرگ میں ہوا تھا۔ قیام بھی کیا تھا بس شب گساری کے لیے رات گئے پہنچتے تھے ورنہ سارا سارا دن مرزا جی کی رہنمائی میں ادبی حلقوں سے وابستہ لوگوں سے ملنے ملانے اور گپ شپ میں گزر جاتا تھا مثلاً شہزاد احمد صاحب کے ہاں گئے۔ وہ بہت محبت سے ملے۔ مرزا جی سے ان کی بہت دوستی تھی اور عرصۂ دراز سے تھی۔ پھر موضوعاتِ گفتگو کا دائرہ مشترک تھا۔ بیگم شہزاد احمد بھی آ کر مرزا جی سے ملیں اور اہلِ خانہ کی خیریت دریافت کی۔ یہاں سے اُٹھ کر ڈاکٹر تحسین فراقی کے ہاں پہنچے۔ وہ پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج شعبۂ اردو کے سربراہ تھے۔ مرزا جی سے ان کی گہری یاری تھی۔ یہ ڈاکٹر صاحب کے پرتپاک استقبال اور دونوں حضرات کی غیر معمولی بے تکلفی سے ظاہر تھا۔ بس جب ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچ گئے تو پھر کہیں اور جانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا کہ یہیں متعدد صاحبانِ علم و ادب سے نیاز حاصل ہو جاتے تھے۔ ان میں ڈاکٹر جعفر بلوچ سے پُرلطف ملاقات اب تک یاد ہے۔

لاہور میں مرزا جی کی نیابت میں انتظار حسین صاحب کے دولت کدے پر بھی حاضری دی گئی تھی اور ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے ساتھ بھی ایک دل چسپ طویل ملاقات رہی تھی۔ ایک سہ پہر ہم نے تجویز دی کہ ایک چکر اندرونِ لاہور کا بھی لگانا چاہیے کہ بچپن کی یادیں تازہ ہو جائیں اور ممکن ہوا تو لاہوری گیٹ سے داخل ہو کر گلیوں گلیوں کسی دوسرے دروازے سے نکل آئیں گے، دیکھیں ان محلوں میں کیا تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ مرزا جی کو ہماری تجویز پسند آئی، فرمایا، ''بہت خوب، چلیے صاحب ضرور دیکھتے ہیں۔ دیکھنے کی حد تک تو کوئی قباحت نہیں ہے۔'' ہم نے اُن کے لہجے کی معنی خیزی بھانپ لی۔ پوچھا، ''کیا اُس بازار کی طرف سے ٹہلتے ہوئے نکلا جا سکتا ہے؟'' مرزا جی نے قہقہہ لگایا، بولے، ''ٹہلتے ہوئے تو کسی بھی بازار سے نکلا جا سکتا ہے۔'' چناں چہ رات آٹھ بجے ہم مرزا جی کی قیادت و سیادت میں نکل پڑے۔ گھومتے گھامتے بادشاہی مسجد پہنچے۔ ارد گرد دیکھتے ہوئے آگے بڑھے اور اس بازار میں جا پہنچے۔ چوک کے دونوں طرف کے چوبارے نسبتاً زیادہ کشادہ، زیادہ روشن اور آباد تھے۔ لگتا تھا ابھی یہاں رقص و سرود کی محفلیں شروع نہیں ہوئی تھیں، لیکن ہر کھڑکی، جھروکا، گیلری اور چوبارہ روشن تھا۔ بجلی کے قمقموں اور مہتاب رخوں کی تابناکیوں سے نگاہیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ کہیں کہیں سے سارنگی کے سُر اور طبلے کی کھنکھناہٹ سنائی دیتی تھی کہ جیسے آرکسٹرا والے اپنے فن کے

مظاہرے کے لیے تیاری میں لگے ہوں۔

اس چوک کی رونق تو دیدنی تھی مگر کب تک وہاں کھڑے رہتے۔ عرض کیا کہ "اب یہاں آئے ہیں تو گلی کوچے بھی جھانکتے چلیں۔" مرزا جی مسکرائے بولے، "ٹھیک ہے، پر یاد رکھیے گا بات گلی کوچے جھانکنے کی ہو رہی ہے، کوٹھے چڑھنے کی نہیں۔" عرض کیا، "آپ تو دوست دار آدمی ہیں۔ دوستی میں یہ وارننگ کیسی۔" مرزا جی نے قہقہہ لگایا اور ہم نے ساتھ دیا۔ خیر دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ایک پتلی سی گلی میں داخل ہو گئے۔ گلی بہ مشکل سات آٹھ فٹ چوڑی رہی ہو گی اور آنے جانے والوں سے لبالب چھلک رہی تھی۔ ہر طرف موتیے، چمپا، چنبیلی اور گلاب کے پھولوں کی بہاریں دیدنی تھیں۔ یہاں جلوہ سامانیوں کے ساتھ ساتھ ہر دروازے پر مول تول کی کارروائی بھی جاری تھی۔ چھنچھناہٹ اور کھنکھناہٹ کی آواز ذرا کم کم تھی۔ گلی کے ایک موڑ پر جہاں سے دو شاخہ گلیاں نکل رہی تھیں، بہت سی اگربتیاں جلائی گئی تھیں جس کی خوش بو اور دھویں نے پوری فضا کو معطر اور بوجھل بنا دیا تھا۔ ذرا سی دیر میں ماحول نے طبیعت مکدر کر دی۔ کوفت سی ہونے لگی۔ مرزا جی کے چہرے پر بھی کوفت نمایاں تھی۔ دونوں نے بہ یک وقت کہا، "بھائی بس اب باہر نکلنے کی سبیل کی جائے۔" چناں چہ ہم دو شاخہ موڑ سے ایک اور گلی میں داخل ہو گئے جو نسبتاً ذرا کشادہ تھی، لیکن منظر اور کیفیت یہاں بھی وہی تھی۔ دیکھا کہ اس گلی سے بھی دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے سے کوچے اور راہداریاں آ کر ملتی ہیں اور ہر گلی میں ایک جیسا ماحول اور سرگرمیاں دکھائی دیتی تھیں۔ گلی اندر گلی اور کوچہ در کوچہ گھومتے ہوئے آخر پون گھنٹے بھر کی خواری کے بعد ہم لوگ نسبتاً کھلی جگہ میں نکل آئے، جو اس بازار کے پڑوس کے باوجود اس کا حصہ نہ تھی۔ یہاں ہم نے ذرا کھل کر سانسیں لی۔ تب کہیں ہوش ٹھکانے آئے ہیں۔ چناں چہ ہم نے مرزا جی سے گزارش کی کہ بس بھائی آج کے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ ہم تو یہ شان دار تجربہ شاید کبھی نہ بھول پائیں۔ اب مہمان خانے چلنے کی فکر کی جائے کہ وہاں بھی آنے جانے کے کچھ قواعد ہوں گے۔ چناں چہ راستے میں ہم نے کہیں شکم پوری کی اور ریسٹ ہاؤس پہنچے۔ دوسرے دن دس گیارہ بجے کے بعد کہیں اٹھ کر تیار ہوئے کہ پچھلی شب کی مسرور تھکان نے صبح خیزی کی عادت کو بھی تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ دوپہر کو باہر نکلنے لگے تو دیکھا کہ مرزا جی نے ہاتھوں میں دو تین بڑے بڑے تھیلے اُٹھا رکھے ہیں، ہم نے پوچھا، جناب یہ کیا ہے؟ فرمایا کچھ نہیں کپڑے ہیں جو یہاں ایک درزی کو دینے ہیں۔ مزید تفتیش پر معلوم ہوا کہ مرزا جی کے ملبوسات کوٹ پتلون اور قمیص وغیرہ اب تک لاہور ہی میں سلا کرتے ہیں۔ جب کبھی لاہور آنا ہوتا ہے تو ان سلے کپڑے دے جاتے ہیں اور سلے ہوئے جوڑے واپس لے جاتے ہیں۔ لاہور کے زمانۂ طالب علمی سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ ہم نے کہا، گویا آپ پاکستانی ادیبوں کے جواہر لال نہرو ہیں جن کے کپڑے پیرس سے سل اور دھل کر آیا کرتے تھے۔

مبین مرزا صاحب کے ساتھ ایک اور یادگار سفر کی جھلکیاں بھی دیکھتے چلیے۔ یہ سفر کراچی سے لاڑکانہ کے درمیان ہوا تھا۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے سندھ کے ایک معروف اور سینئر ادیب، دانش ور اور سیاسی

رہنما سوبھوگیان چندانی کے سوانحی حالات اور فکر وفن پر ایک کتاب ہم سے لکھوائی تھی۔ سندھ میں اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی تھی اور اس سلسلے میں لاڑکانہ کی بعض ادبی انجمنوں نے مشترکہ طور پر ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا جس کی صدارت اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر نشین افتخار عارف کو کرنی تھی جب کہ مرزا صاحب اور ہمیں گفتگو کرنی تھی۔ حیدرآباد، سکھر، خیرپور کے ادیبوں کی شرکت بھی متوقع تھی۔ تقریب سے ایک دن قبل ہم تینوں بذریعہ جہاز سکھر پہنچے کہ یہاں سے کار کے ذریعے لاڑکانہ پہنچنا تھا۔ چناں چہ صبح سویرے سکھر ائیر پورٹ پر خیر مقدم کرنے والوں میں سندھی اور اردو کے کئی لکھنے والے شامل تھے۔ لاڑکانہ سے بھی کچھ لوگ استقبال کرنے آئے تھے۔ سکھر کے ایک عالی شان ہوٹل میں ہمارے عزیز دوست اور سندھی زبان کے صفِ اوّل کے شاعر فتاح ملک ایڈووکیٹ نے بھاری بھرکم ناشتے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ فتاح ملک چین کے دورے میں افتخار عارف کے ساتھ شریکِ سفر رہ چکے تھے۔ ہم سے تو ان کے تعلقات (قیامِ سکھر کے دوران) ہائی اسکول کے زمانے سے چلے آتے ہیں اور اکثر ہم دونوں طلبہ سرگرمیوں اور ادبی ہنگاموں میں بھی باہم شریک رہا کرتے تھے۔ اب بھی تعلقات اسی طرح وسیع اور گہرے ہیں (بعد میں فتاح ملک صوبہ سندھ کے ایڈووکیٹ جنرل مقرر ہوئے اور اب کراچی میں مقیم ہیں)۔ ناشتے کے بعد متعدد کاروں پر مشتمل ایک قافلہ لاڑکانہ کی طرف روانہ ہوا جس کے آگے پیچھے پولیس اور رینجرز کی حفاظتی گاڑیاں بھی شامل تھیں۔ اس اہتمامِ خاص سے بھلا ادیبوں کا جلوس کب نکلا ہوگا۔ ہم لوگوں کو شہر کے سب سے عمدہ ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ جب کہ افتخار عارف کے قیام کا بندوبست سرکاری سرکٹ ہاؤس میں کیا گیا تھا جو اعلیٰ درجے کے بیوروکریٹ اور مقتدر حضرات کے لیے مخصوص ہوا کرتا ہے۔ افتخار عارف اس انتظام پر زیادہ خوش نہ تھے اور ہم لوگوں کے ساتھ ہی رہنے پر مصر تھے، لیکن مشکل یہ تھی کہ پورا سرکٹ ہاؤس رینجرز کے کرنلوں اور جرنلوں کے قبضے میں تھا اور منتظمین بہ مشکل تمام ایک کمرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ ادھر ہوٹل میں بھی کوئی عمدہ کمرہ دستیاب نہ تھا۔ آخر ہم نے سمجھایا کہ بھائی یوں تو ہم سب دن بھر ساتھ ہی ہوں گے بس رات کا قیام الگ الگ رہے گا۔

دوپہر میں لنچ کا اہتمام لاڑکانہ پریس کلب کی طرف سے کیا گیا تھا۔ جہاں استقبالیہ تقاریر بھی ہوئیں اور افتخار عارف سے شاعری کی فرمائشیں ہوتی رہیں۔ شام کو کتاب کی تقریب بھی توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہی۔ دن بھر کی مصروفیت نے خاصا تھکا دیا تھا اور جب ہم نے رات گئے افتخار عارف کو سرکٹ ہاؤس پہنچایا ہے تو گویا لاڑکانہ گہری نیند سو چکا تھا۔ دوسرے دن ہماری فلائیٹ شام سات بجے تھی جس کے لیے چار بجے لاڑکانہ سے نکلنا تھا، لیکن صبح سویرے موہن جودڑو کا چکر لگانا بھی ضروری تھا۔ لہٰذا دس بجے دو تین گاڑیوں میں موہن جودڑو پہنچے۔ آثارِ قدیمہ کی گلیوں میں مٹر گشت کرنے کے بعد میوزیم کا مشاہدہ کیا گیا۔ محسوس ہوا کہ یہ تاریخی اور تہذیبی آثارِ قدیمہ متعلقہ محکموں کی نگہداشت سے محروم چلا آتا ہے اور تباہ حال چیزیں مزید تباہی کی جانب گامزن ہیں۔ لاڑکانہ سے واپسی کے لیے گڑھی خدا بخش کا راستہ اختیار کیا گیا تھا کہ راستے میں بھٹو

صاحب اور بے نظیر بھٹو کے مزارات پر حاضری بھی دی جا سکے۔ ایسا ہی ہوا۔ مرزا جی اور افتخار عارف کی سرکردگی میں ہم نے بھی ان کے ایصالِ ثواب کے لیے خشوع وخضوع کے ساتھ دعائیں مانگیں اور راستے میں بھی ان دونوں عوامی رہنماؤں کی خوبیوں خامیوں پر گفتگو ہوتی رہی۔

اس سفر کی دل چسپ یادوں میں مرزا جی اور افتخار عارف کی گفتگو اور آپس کی چھیڑ چھاڑ تھی۔ مرزا جی کھانے کے بعد میٹھا نہیں کھاتے، ویسے بھی کم کھاتے ہیں، لیکن کھانے کے بعد تو بالکل ہی نہیں۔ اِدھر یہ کہ ہر کھانے کا اہتمام شاہانہ ضیافت کے طور پر ہو رہا تھا۔ میٹھا اس کا لازمی حصہ ہوتا۔ افتخار عارف ہر بار کوشش کرتے کہ مرزا جی ان کے ساتھ میٹھے میں شریک ہوں، لیکن مرزا جی اپنے اصولوں کے پکے اور ایسے پکے کہ دُنیا چاہے اِدھر کی اُدھر ہو جائے پر اُن کا انکار اقرار میں نہیں بدل سکتا۔ ایک عشایئے کے بعد مہمانوں کو قلفی بھی پیش کی گئی۔ قلفی ایسی عمدہ اور لذیذ کہ جواب نہیں۔ افتخار عارف نے دل کھول کر قلفی کی تعریف کی اور مرزا جی کو کھانے کی دعوت دی۔ مرزا جی نے شکریے کے ساتھ معذرت کی۔ افتخار عارف بضد کہ چکھ تو لو اور یہ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ افتخار عارف نے ہاتھ میں تھاما ہوا قلفی کا پیالہ اُٹھا کر میز پر رکھ دیا اور مجھ سے بھی رکھنے کو کہہ دیا پھر مرزا جی سے مخاطب ہوئے، ”لیجیے مرزا صاحب، اگر آپ نے ہمارے ساتھ آج قلفی نہ کھائی تو ہم پر قلفی کھانا حرام ہوا۔“ مرزا جی نے پہلے مسکرا کر اور پھر تشویش سے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ پھر ہمیں قلفی کھانے کو کہا۔ اب یوں ہوا کہ مرزا جی سمجھاتے ہیں کہ ہم دونوں کو قلفی کھانی چاہیے اور خواہ مخواہ کی بحث میں نہیں پڑنا چاہیے، مگر افتخار عارف ہیں کہ اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ قلفی تو آپ کے ساتھ ہی کھائیں گے۔ بڑی ردوکد کے بعد آخر مرزا جی نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی اور فرمایا، ”اچھا بھائی منگوایئے قلفی۔“ اب جو قلفی کھائی تو انھوں نے بھی اسے لاجواب کہا اور ایک پر اکتفا نہ کیا، بل کہ دوسری منگوا کر کھائی۔ ہم دونوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ دوسری بار قلفی منگوانے پر افتخار عارف نے کہا، ”یہ مغل بچے واقعی غضب ہوتے ہیں۔ جسے پسند کر لیں اُسے چٹ کرنے پر اُتر آتے ہیں۔“

مرزا جی تہ دار شخصیت کے مالک ہیں۔ طبیعت میں گہرائی ہے۔ اُن کے رکھ رکھاؤ، وضع داری، تہذیب و شائستگی اور شان و شوکت میں کلاسیکل روایت کو باآسانی دیکھا جا سکتا ہے اور یہ چیزیں چھوٹے سے چھوٹے کام سے لے کر بڑے بڑے مرحلے تک اُن کے ہاں نظر آتی ہیں۔ مطالعہ اور حافظہ دونوں بے مثال ہیں۔ بات کے دھنی ہیں۔ گفتگو کا ملکہ رکھتے ہیں۔ بہت کم آمیز آدمی ہیں۔ ان کے ہاں شرفِ باریابی آسانی سے نہیں ملتا، لیکن ایک بار کسی سے ربط وضبط ہو جائے تو پھر عمر بھر قائم رہتا ہے۔ رشتوں کو نبھانا خوب آتا ہے۔ ملنے ملانے والوں کا حلقہ بڑا ہے، لیکن یہ بڑا حلقہ مرزا جی نے نہیں بنایا ہے، لوگ اُن کی طرف خود کھنچتے ہیں، لیکن اُن کے دوستوں کا حلقہ بہت مختصر، بہت محدود ہے، کم سے کم پچھلے دس بارہ سال میں ہم نے تو ان کے دوستوں کے حلقے میں اضافہ ہوتے نہیں دیکھا۔

پیدا کہاں ایسے پراگندہ طبع لوگ

ڈاکٹر نجیبہ عارف

جگہیں، چہرے، یادیں اور خیال

۲۵ نمبر بس کی کھڑکی سے ایسٹ لندن کا علاقہ ایک طرح سے ایشیائی ملک ہی لگتا ہے۔ ٹرانسپورٹ کا اعلی نظام تو ضرور موجود ہے اور انڈر گراؤنڈ ٹیوب لائنوں، ٹرینوں اور بسوں کا جال بچھا ہے لیکن ہر طرف ایشیائی پن بکھرا ہوا ہے۔ الفرڈ (Ilford) اور گرین سٹریٹ (Green Street) کے علاقے میں آ کر تو لگتا ہے کہ انارکلی یا اچھرے پہنچ گئے ہیں۔ میں شاہدہ باجی کے گھر سے نکل کر رومفرڈ روڈ (Romford Road) پر صبا اور ثاقب کے گھر میں منتقل ہو گئی تھی۔ دراصل شاہدہ باجی کا گھر پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرنے کے حوالے سے زیادہ آرام دہ نہیں تھا۔ ہر روز، سنٹرل لندن تک پہنچنے کے لیے سوا سے ڈیڑھ گھنٹہ درکار ہوتا۔ پھر ان کا اصرار رہتا کہ میں اتنی سردی میں بس اسٹاپ پر کھڑے رہنے کی بجائے، ان کی اسٹیشن چھوڑ آنے کی دعوت قبول کر لوں۔ مجھے روز صبح انھیں یہ تکلیف دینا گوارا نہ تھا۔ اس لیے ان کی اور تمام گھر والوں کی محبت اور خلوص کے باوجود، میں نے اسد سے کہا کہ میرے لیے کوئی اور کمرہ ڈھونڈ دے۔ اس نے مجھے یہاں ٹھہرا دیا تھا۔ ثاقب اسد کے پرانے دوستوں میں تھا اور ان کے ہاں ایک کمرہ خالی بھی تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ یہ جگہ پبلک ٹرانسپورٹ کے حوالے سے انتہائی عمدہ تھی۔ گھر کے دروازے سے نکلو تو چند گز کے فاصلے پر دائیں اور بائیں دونوں طرف بس اسٹاپ تھے، جہاں سے ۲۵ نمبر بس سیدھی سنٹرل لندن تک جاتی تھی۔ اور اگر زیر زمین ٹرین پکڑنا چاہو تو دو بسیں ہر تین تین منٹ کے بعد یہاں سے گزرتی تھیں جو پانچ منٹ میں سٹریٹفرڈ اسٹیشن پہنچا دیتی تھیں۔ سٹریٹفرڈ لندن کے بڑے ریلوے اسٹیشنوں میں سے ایک تھا جہاں سے ٹرینیں، ٹیوب اور بسیں شہر کے کونے کونے میں جاتی تھیں۔ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے یہاں لندن کا سب سے بڑا شاپنگ مال ویسٹ فیلڈ بھی تعمیر ہوا تھا جو لندن اولمپکس ۲۰۱۲ کی یادگار ہے۔ یہ جدید ترین شاپنگ مال پورے لندن کی باسیوں کو یہاں کھینچ لاتا ہے۔ اسی سے منسلک سٹریٹفرڈ سنٹر بھی ہے، جہاں سے کم قیمت اشیا بھی خریدی جا سکتی ہیں۔

رومفرڈ روڈ ایک خاصی کشادہ سڑک ہے جس کے دونوں طرف کبھی گھر ہوں گے لیکن اب ان میں سے بیشتر گھر کسی نہ کسی کاروباری مرکز میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ کئی ایک تو مہمان خانے بن چکے ہیں، کچھ نجی اسکولوں میں تبدیل ہو چکے ہیں، مثلاً ہماری بلڈنگ سے چند گز آگے مسلم لڑکیوں کا ایک بہت مشہور اسکول ہے۔ تھوڑا سا اور آگے جائیں تو گرین اسٹریٹ نامی بازار ہے جہاں دکانوں کے نام اور بورڈ بھی اردو یا ہندی میں ہیں۔ شیشوں کے اندر ڈمیوں نے شلوار قمیص، غرارے، پاجامے اور ساڑھیاں زیب تن کر رکھی ہیں۔ ریستورانوں میں حلوہ پوری اور پائے نہاری کے بورڈ لگے ہیں۔ شام کے بعد تکے کبابوں کی خوشبو پورے علاقے میں پھیل

جاتی ہے اور ہر چار قدم کے فاصلے پر کوئی نہ کوئی "حلال بچر" مل جاتا ہے۔ فٹ پاتھ پر چلنے والوں میں کوئی "فارنر" کم ہی نظر آتا ہے۔ ایشیائی اور نیگرو چہرے ہی ہر طرف دکھائی دیتے ہیں اور اگر آپ کو انگریزی نہیں آتی تو فکر کی کوئی بات نہیں، اردوے معلّی، ہندی، لاہوری، امرتسری، حیدرآبادی، تیلگو، جس لہجے میں چاہیں، بات کریں۔ راستہ پوچھیں، کھانے پینے کی معلومات حاصل کریں، خریداری کے بارے میں ہدایات لیں۔ شاید کسی زمانے میں یہ اعزاز صرف ساؤتھ ہال کو حاصل تھا، اور بلا شبہ اب بھی ایشیائی، خصوصاً سکھ برادری کے افراد کی سب سے زیادہ تعداد وہیں ملتی ہے لیکن ایسٹ لندن کا یہ علاقہ بھی ایشیائی اور افریقی برادری کا گڑھ بن چکا ہے۔

اسی سڑک کے شروع میں یونی ورسٹی اوف ایسٹ لندن کی عمارت بھی ہے۔ یہ وہی یونی ورسٹی ہے جہاں کبھی عارف زیرِ تعلیم رہے تھے۔ مجھ سے میرے نئے پتے کے بارے میں سنتے ہی وہ مضطرب ہو گئے۔ گوگل کر کے انھوں نے اس سڑک کا سارا احوال دیکھ لیا اور حیران ہوتے رہے کہ اکیس بائیس برس میں یہ جگہ کس قدر بدل گئی تھی۔

میں جس اپارٹمنٹ میں منتقل ہوئی تھی، وہ یونی ورسٹی اوف لندن سے ذرا آگے واقع ایک بلڈنگ کی چوتھی منزل پر تھا۔ اس کے بالکل متصل ایک نرسنگ ہوم تھا جو دراصل متروک بوڑھوں کی جائے پناہ تھی۔ آتے جاتے میں اس نرسنگ ہوم کے کشادہ صحن میں ضرور جھانکتی، جہاں ہر وقت ایک نہ ایک ایمبولینس گاڑی کھڑی رہتی تھی، مگر کبھی کسی مکین کی شکل نظر نہ آئی۔ ثاقب نے بتایا کہ کرسمس یا کسی اور تہوار کے علاوہ، یہاں کبھی کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا گیا۔ بس یہ ایمبولینس ہی یہاں حرکت اور زندگی کی واحد نشانی ہے۔

"پتا نہیں، زندگی کی یا زندگی کے اختتام کی۔۔۔" سہم کر میں نے سوچا۔

بلڈنگ کی سیڑھیوں کی دائیں جانب والی کھڑکی سے کئی بار میں نے اس عمارت کے اندر جھانکنے کی کوشش کی مگر مجھے کبھی کوئی چہرہ دکھائی نہ دیا۔ روز میرا جی چاہتا کہ دروازہ کھٹکھٹا کر اندر چلی جاؤں اور جا کر ان بوڑھوں سے باتیں کروں، ان کی کہانیاں سنوں۔ ان کی زندگی کے تجربوں کا نچوڑ کیا ہے؟ عمر بھر کی جد و جہد، بھاگ دوڑ اور تگ و دو کا حاصل کیا ہے؟ اگر انھیں دوبارہ موقع ملے تو وہ کیسے جینا چاہیں گے؟ یہاں ان کا دن کیسے گزرتا ہے اور رات کس طرح کٹتی ہے؟ کس کس کا انتظار رہتا ہے؟ کون کون سے چاند ان کی یادوں کے آسمان پر دمکتے ہیں؟ وہ سب کہاں ہیں جن سے انھوں نے محبت کی تھی؟ جنھوں نے ان سے محبت کے دعوے کیے تھے؟ دنیا اب انھیں کیسی لگتی ہے؟

یا پھر کچھ بھی نہ پوچھوں، شاید یہ سب ان کی آنکھوں میں پہلے ہی سے لکھا ہوا ہو۔ میں بس ان کے پوپلے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر انھیں احساس دلاؤں کہ وہ ابھی زندہ ہیں۔ ان کی لٹکتی ہوئی جھریوں کو انگلی کی پوروں سے چھوؤں اور چپ چاپ ان کے پاس بیٹھی رہوں۔ یہاں تک کہ وہ مجھے اپنا ساتھی سمجھ لیں۔

"لیکن کب تک۔۔؟ اگر تمھیں وہ اپنا ساتھی سمجھ بھی لیں تو کیا، تمھیں بھی تو جانا ہے۔ تمھارے بھی تو سو

کام ہیں۔ کب تک بیٹھی رہوگی، آخر اٹھ جاؤ گی۔ پھر وہ اور تنہا ہو جائیں گے۔ تمھیں یاد کریں گے۔ کہیں گے، ایک ایشیائی آئی تھی، بڑی ہم درد تھی، بڑی محبتی تھی، تمھاری انا کو تسکین مل جائے گی مگر ان کے درد کا مداوا نہیں ہو گا۔ چھوڑ دو یہ ڈھونگ ۔ ۔ ۔ ۔ اب تو تم خود اس نرسنگ ہوم میں رہنے والی عمر کے کنارے پہنچ گئی ہو بی بی! کارِ جہاں میں مداخلت کے ارادوں سے باز آجاؤ۔ زندگی کو اپنی رفتار، اپنے انداز سے چلنے دو۔ یہ کائنات تمھارے خیالوں، تمھارے عزائم کی پرواز تک محدود نہیں ہے، اس کی منطق کو سمجھنے کی خواہش رکھنا تو جرم نہیں ہے، کوشش کرنے میں بھی کوئی ہرج نہیں، لیکن اپنی حدود سے باخبر رہنا بھی تو ضروری ہے۔"

یکے بعد دیگرے، اندر والے سے کئی طمانچے کھا کر میں نے سیڑھیوں کی دائیں ہاتھ والی کھڑکی سے نظر ہٹالی۔ بائیں جانب گاڑیوں کی ورکشاپ تھی جہاں ہر وقت استعمال شدہ گاڑیاں فروخت کے لیے کھڑی رہتیں۔ ان میں نہایت قیمتی اور عمدہ گاڑیاں بھی ہوتیں اور بالکل کھٹارہ، چوں چوں کا مربہ قسم کی کاریں بھی۔ یہاں کار خریدنا مشکل نہیں ہے، کار رکھنا مشکل ہے۔ پٹرول کی قیمت تو جو ہے سو ہے، سب سے بڑا مسئلہ پارکنگ کا ہے۔ نہ تو آپ ہر جگہ گاڑی کھڑی کر کے جا سکتے ہیں، نہ ہر جگہ پارکنگ لاٹ موجود ہیں اور جہاں ہیں، وہاں بھی گھنٹے کے حساب سے پیسے دینے پڑتے ہیں۔ غلط پارکنگ کر کے تو دیکھیں، یا پھر ٹکٹ لیے بغیر گاڑی پارک کر جائیں۔ واپسی پر آپ کی گاڑی پر چالان کا ٹکٹ چسپاں ہوگا۔ سپاہی منتظر ملے گا نہیں تو ڈاک کے ذریعے گھر کے پتے پر چالان کا نوٹس موصول ہو جائے گا۔ مقررہ مدت کے اندر جرمانہ جمع نہ کروایا تو جرمانے کی رقم دگنی ہو جائے گی اور پھر بھی نہ جمع کروایا تو بس سمجھ لیجیے کہ برے دن آگئے۔ ڈرائیونگ لائسنس کا حاصل کرنا ویسے ہی انتہائی دشوار ہے۔ میرے وہاں ہوتے ہوئے، میں نے کئی نوجوانوں کو تیسری تیسری بار ڈرائیونگ ٹسٹ میں ناکام ہوتے دیکھا۔ اور یہ ناکامی معاشی طور پر بھی بہت مہنگی پڑتی ہے۔ ٹسٹ کی فیس، پھر اگر مشق کرنی ہو تو تربیت کی فیس، اور یہ سب ہو جائے تو ٹسٹ کی تاریخ لینا ایک اور مرحلہ ہے۔ اگر آپ کام کرتے ہیں، اور تقریباً سبھی کام کرتے ہیں تو اپنی چھٹی کے دنوں میں تربیت لینے اور ٹسٹ دینے کے لیے کئی کئی ہفتے انتظار کرنا پڑ سکتا ہے۔ اسی لیے جب ایک دفعہ ڈرائیونگ لائسنس مل جائے تو ہر شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جس سے لائسنس پر زد پڑتی ہو۔ قانون کی پابندی کی دوسری بڑی وجہ جرمانے کی رقم ہے جس سے جان چھڑانا ناممکن ہے۔ سزا میں بغیر کسی معقول وجہ کے نرمی ہوتی ہے نہ کوئی استثنا ملتا ہے۔ بعض اوقات لوگ کسی جرمانے کے فیصلے کے خلاف اپیل کر دیتے ہیں لیکن ایسی اپیلیں بھی صرف اس وقت کامیاب ہوتی ہیں جب ملزم کے مؤقف میں واقعی صداقت ہو، جسے ثابت بھی کیا جا سکے۔ بصورتِ دیگر، جرمانہ بھرنا ہی پڑتا ہے۔

مغرب میں قانون کے احترام کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہاں قانون کے نفاذ میں کوئی رو رعایت روا نہیں رکھی جاتی۔ غلط موڑ کاٹ کر، ٹریفک کا اشارہ توڑ کر، یک طرفہ سڑک کے قاعدے کی خلاف ورزی کر کے، کوئی بچ نہیں سکتا۔ خودکار کیمرے جگہ جگہ نصب ہیں، اس لیے یہ خیال کہ سپاہی کو جل دے کر نکل جائیں گے، وہاں

کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ سزا کا خوف ہی ہے، جس نے وہاں کے شہریوں کو قانون کے احترام کی عادت ڈال دی ہے۔ انھیں یقین ہے کہ جہاں قانون توڑیں گے، وہیں اس کی سزا مل جائے گی۔

ہمارے ہاں بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایشیائی لوگوں میں شاید کوئی پیدائشی نقص Manufacturing Fault ہے جس کی وجہ سے ہم قانون کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور ان مغربیوں کی اس قابلِ قدر ادا کے پس پشت ان کی شخصی عظمت اور برتری پنہاں ہے، مگر مجھے لگتا ہے کہ انھیں قانون کے احترام کی ایسی تربیت دی جاتی ہے کہ یہ ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے اور یہ عادت ،مکافاتِ عمل یا جزا و سزا کے قانون کے نفاذ سے پیدا ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں قانون سرے سے بے نیاز ہے اور اگر کبھی حرکت میں آئے بھی تو کمزور کی گردن دبوچ کر ہی نہال ہو جاتا ہے۔ اس لیے قانون کی پابندی فخر کی بجائے ،کمزوری کا اظہار سمجھی جاتی ہے۔ وہاں قانون کی حکم رانی ہے اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ قانون توڑنے کی سزا مل کر رہے گی۔ ہمارے ہاں بھی، جہاں جہاں قانون کی بالادستی یکساں طور پر تسلیم کی جاتی ہے، وہاں قانون شکنی عادت نہیں رہتی، شرمندگی بن جاتی ہے۔ پاکستان میں اب ایسے کچھ ہی ادارے رہ گئے ہیں؛ لیکن جو ہیں، ان کا نظم و ضبط کسی طرح بھی مغربی معاشروں سے کم تر نہیں۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ مغرب، خاص طور پر انگلستان جا بسنے والے ہمارے لوگوں کی ایک بڑی تعداد، قانون کی اس سخت گیری کے باوجود، کسی نہ کسی طرح چور راستے ڈھونڈنے میں لگی رہتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں، روزمرہ کے معاملات میں، معاشرتی اقدار کی پاس داری میں، ایشیائی اور افریقی برادری کی اکثریت اپنے مغربی ہم وطنوں سے اب بھی پیچھے ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایسے خاندان جو نصف صدی سے انگلستان میں رہ رہے ہیں اور جن کی تیسری چوتھی نسل یہاں جوان ہو رہی ہے، ان میں سے بھی بیشتر ابھی تک اس معاشرے کی اقدار سے ہم آہنگ نہیں ہوئے۔ یہ ایک انتہائی پیچیدہ اور الجھا ہوا معاملہ ہے جس کی کئی جہتیں ہیں اور جس کا مظاہرہ قدم قدم پر دیکھنے کو ملتا ہے۔

الفرڈ اور ایسٹ لندن کے دوسرے علاقوں کو جانے والی ٹیوب سب سے زیادہ گندی اور بدحال نظر آتی ہے۔ گھستے ہی احساس ہو جاتا ہے کہ کوئی مسئلہ ضرور ہے۔ اگر ڈبے میں زیادہ تعداد میں افریقی بیٹھے ہیں تو ایک تیز بو بھی دماغ کو پریشان کرنے کے لیے موجود ہوتی ہے۔ بو نہ ہو تو بھی، ایشیائی اور افریقی دونوں طرح کی سواریاں پاؤں پھیلا کر بیٹھتی ہیں، اونچی آواز میں باتیں کرتی ہیں، خواتین اور بزرگ شہریوں کی مخصوص نشستوں پر ڈھٹائی سے براجمان رہتی ہیں، ٹشو پیپر، ڈبے اور خالی بوتلیں وہیں پھینک دیتی ہیں۔ دیواروں پر کچھ لکھنے یا خالی لکیریں کھینچنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ شاید لندن ٹرانسپورٹ والے بھی اب عادی ہو گئے ہیں اور انھوں نے ان ٹرینوں اور ان کے مسافروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ سب سے سست رفتار اور پرانی ٹرینیں، انھی علاقوں میں بھیجی جاتی ہیں۔

بسوں کا حال بھی زیادہ مختلف نہیں ہوتا؛ پرانی یا خستہ حال تو نہیں ہوتیں لیکن سٹریٹ فرڈ سے جوں ہی آپ ۲۵ یا ۸۶ نمبر کی بس میں سوار ہوتے ہیں، آپ کو علم ہو جاتا ہے کہ معاملات اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ سب

سے پہلے تو بس سٹاپ پر وہی دھکم پیل دیکھنے کو ملتی ہے جو شاید پیرودھائی کے کسی ویگن اسٹینڈ پر ملتی ہوگی۔ نہ کسی بوڑھے کا لحاظ، نہ خواتین کا احترام، ہر ایک کہنی مار کر دوسرے سے پہلے بس میں سوار ہونا چاہتا ہے اور اچھی نشست پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ مصروف اوقات میں تو خاص طور پر تہذیب اور شائستگی کا فقدان نظر آتا ہے۔ پھر بس کے اندر کا ماحول۔ اگر کوئی شخص دو نشستوں میں سے ایک پر بیٹھا ہے تو دوسرے مسافر کے آنے پر اسے بیٹھنے سے روکنے کے لیے کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر کھسکنے کی بجائے، باہر والی نشست پر پھیل کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب دوسرا یا تو اس کے گھٹنوں سے رگڑ کھا کر اگلی نشست تک پہنچے یا کوئی اور نشست تلاش کرے، ورنہ کھڑے رہنے میں ہی عافیت خیال کرے۔ بعض گورے بھی ایسی حرکتیں کر جاتے ہیں لیکن ان کی تعداد نسبتاً بہت کم ہوتی ہے۔ بس میں سوار ہونے کا قاعدہ یہ ہے کہ سب مسافر اگلے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہیں، ڈرائیور کو اپنا پاس دکھاتے یا ٹکٹ خریدتے ہیں اور جب اپنا اسٹاپ آ جائے تو پچھلے دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔ لیکن میں نے کئی بار دیکھا کہ کوئی مسافر موقع پا کر چپکے سے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا اور اگر سفر کے دوران انسپکٹر سے بچ نکلا تو اپنے اسٹاپ پر اتر گیا۔ البتہ اگر انسپکٹر کے ہاتھ لگ جائے تو اگلے پچھلے سب حساب پورے ہو جاتے ہیں۔ ایسی حرکتیں بھی عموماً ایشیائی یا افریقی ہی کرتے ہیں۔ ان میں ہندوستانی، پاکستانی، بنگالی اور سری لنکن سب شامل ہیں۔

ایک اور عجیب بات، جو میں نے خاص طور پر نوٹ کی، ایشیائی بچوں کی طبیعت ہے۔ ان میں سے اکثر جب ضد پر آتے ہیں تو زور زور سے روتے اور چلاتے ہیں، ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، حتیٰ کہ بس کے فرش پر لیٹ جانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ گورے بچے بھی ضد کرتے ہیں مگر ان کی ناگواری کا اظہار ان کے چہرے کے تاثرات سے ہوتا ہے، جسمانی حرکات سے نہیں۔ چیخنے چلانے اور ہاتھ پاؤں مارنے کی نوبت نہیں آتی۔ ان کی مائیں اپنے بچوں کو گھرکتی بھی ہیں اور محبت کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ مگر ہم ایشیائیوں کی طرح ان دونوں باتوں میں حد سے نہیں گزر جاتیں۔ نہ ان کا لاڈ پیار اس قدر بلند آہنگ ہوتا ہے، نہ غصہ اور خفگی اتنی تیز اور شدت بھری۔

یہ کیا فرق ہے؟ میں دیر تک یہ سوچتی رہتی کہ ہماری اور ان کے مزاج میں آخر کیا فرق ہے اور اس فرق کا سبب کیا ہے؟ پہلے میرا خیال تھا کہ موسم اور آب وہوا کا فرق اس کا سبب ہے۔ ہم گرم علاقوں اور استوائی خطوں کے رہنے والے لوگ اپنے سبھی جذبوں میں شدت اور حدت کا اظہار کرتے ہیں، وہ سرد اور برفیلی فضاؤں میں رہتے ہیں، اس لیے ان کے مزاج بھی ٹھنڈے ہیں مگر یہاں آ کر ایک اور سوال سامنے آن کھڑا ہوا۔ یہ لوگ جو کئی دہائیوں سے یہاں کے باسی ہیں اور ان کی اولادیں جو یہیں پیدا ہوئیں، پلیں بڑھیں، آخر ان کے مزاج میں تبدیلی کیوں پیدا نہیں ہوئی؟ کیوں آج بھی ایسٹ لندن جانے والی بس کا ماحول، پنچھوں کی ملیاں جانے والی بس کے ماحول سے ملتا جلتا ہے؟ یہ لوگ اس مغربی معاشرے میں جذب کیوں نہیں ہوئے؟ کیوں کسی سخت کوکڑو کی طرح اب تک الگ تھلگ پڑے ہیں۔ دور سے نظر آ جاتے ہیں، صاف پہچانے جاتے ہیں۔

یہی سوال بعد میں ایک روز لیڈز سے واپس آتے ہوئے ٹرین میں رضا علی عابدی صاحب سے پوچھا تو انھوں نے تفصیل سے اس کا جواب دیا۔ نقل مکانی کر کے آنے والے ایشیائیوں اور کئی پشتوں سے یہاں رہنے والے ایشیائیوں کا فرق سمجھایا اور یہ بھی بتایا کہ یہاں تعلیم یافتہ ایشیائی زیادہ تر وہی ہیں جو اپنے اپنے ملکوں سے تعلیم حاصل کر کے روزگار کی تلاش میں یہاں آ کر بس جاتے ہیں، وہ اس معاشرے سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور یہاں کے کلچر اور قانون کی پاس داری بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس مکالمے کی تفصیل پھر کبھی سہی۔

فی الحال تو مجھے صرف یہ بتانا تھا کہ رومفرڈ روڈ سے ۲۵ نمبر بس میں سوار ہوں تو سنٹرل لندن کے ہولبورن اسٹیشن تک پہنچنے میں کم از کم پچاس منٹ لگتے ہیں۔ میں ہمیشہ ڈبل ڈیکر بس کی اوپر والی منزل میں سامنے کی نشست پر بیٹھ جاتی اور کسی ٹورسٹ بس کی سیر کا سا لطف لیتی رہتی۔ شروع شروع میں تو دھیان باہر ہی رہتا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ دلچسپی کم ہونے لگی تو میں نے بیگ سے کتاب نکال کر اس کا مطالعہ شروع کر دیا اور جب اتنے لمبے سفر سے بالکل اکتا گئی تو سٹریٹفرڈ اتر کر سنٹرل لائن پکڑنے لگی جو صرف بیس منٹ میں ہولبورن پہنچا دیتی ہے۔ لیکن شروع کے دنوں میں واقعی اس بس کی سیر کا لطف آیا۔ ایک دن میں نے یوں ہی وقت گزاری کے لیے بس کے مختلف اسٹاپوں کے نام نوٹ کرنے شروع کر دیے، پھر دل ہی دل میں ان کا اردو ترجمہ کرنے لگی تو محسوس ہوا کہ یہاں بھی سڑکوں اور گلیوں کے نام اسی طرح خودرو پودوں جیسے ہیں، جیسے ہمارے ہاں ہوتے ہیں۔ مثلاً:

بشپس گیٹ یعنی مولوی دروازہ
بریڈ سٹریٹ، گلی ناناں والی
تھریڈنیڈل سٹریٹ، سوئی دھاگا گلی
ایڈم کورٹ: آدم حویلی
بو روڈ، کمان والی سڑک

سوچتی ہوں، یہاں کے ہوں یا وہاں کے، شہروں، گلیوں اور محلوں کے نام بھی ایک باقاعدہ تحقیق کے متقاضی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی تو خوش آب، اب خوشاب بن گیا ہے۔ کراچی کبھی کلاچی ہوتا تھا اور پشاور پخاور تھا۔ غالب کے محلّہ بلی ماراں، کو اکیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے، ولیم ڈیلرمپل جیسے محقق بھی بلی ماراں (cat-killers) پڑھنے اور لکھنے لگتے ہیں۔ زبان کی تبدیلی کا عمل سماجی ارتقا کا اشاریہ ہوتا ہے۔ اب لکڑی کے شہتیروں کو بلی کہنے کا رواج کم ہو گیا ہے اور بلیوں کی مدد سے کشتی کھینا تو بالکل ہی دور از کار بات لگتی ہے۔ کم از کم شہری اور صنعتی معاشروں میں تو اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ اس کی نسبت بلی مارنا جدید phenomenon ہے۔ اس کی کئی توجیہات ہو سکتی ہیں۔ ادب، فلسفے اور نفسیات کے حوالے سے بھی کئی علامتی مفاہیم زیر غور لائے جا سکتے ہیں۔ اساطیری تناظر میں بلی کی اپنی ایک معنویت ہے اور عامل بابوں اور جادو ٹونے کے ماہر

پروفیسروں کے ہاں اس کی افادیت کچھ اور ہے۔ ویسے اب یہ بھی سننے میں آ رہا ہے کہ غالب کے محلے کا اصل نام بلّی ماراں ہی تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لندن یونی ورسٹی

لندن میں پہلے دو ہفتے بہت مصروفیت کے عالم میں گزرے۔ سوآس میں نیا سمسٹر شروع ہوا تھا اور ہر طرف سے ورکشاپوں، سیمیناروں اور لیکچروں کے دعوت نامے موصول ہو رہے تھے۔ روز نئے نئے لوگوں سے ملاقات ہوتی، دن میں کم از کم ایک پروگرام میں، میں بھی شریک ہو جاتی۔ سب سے دلچسپ سیمینار اوکسفرڈ یونیورسٹی کے ایک میوزیم کی نگران، ڈاکٹر ملائکہ کمیرا کا تھا جس کا موضوع تھا:

Trans-cultural Architecture: Identity, Practice and Syncretism in Goa

ڈاکٹر ملائکہ نے بہت سی تاریخی تصویروں کے ذریعے دکھایا کہ گوا میں تعمیر ہونے والے گرجے ابتدا میں مغربی طرزِ تعمیر کا نمونہ تھے، آہستہ آہستہ ان پر مقامی اثرات غالب آتے گئے اور یوں گوا کے ۱۵۰ سے زیادہ چرچ جو ۱۵۱۰ء سے ۱۹۶۱ء کے درمیان تعمیر ہوئے، مندروں اور مسجدوں کے طرزِ تعمیر کی آمیزش سے ایک منفرد انداز اختیار کرتے گئے۔ اس سیمینار سے گوا کے فنِ تعمیر پر نوآبادیاتی عہد، بالخصوص پرتگالیوں کے اثرات سے متعلق کئی ضمنی باتیں بھی معلوم ہو گئیں۔ مثلاً یہ کہ گوا میں پرتگالیوں نے مقامی آبادی پر تبدیلیِ مذہب کے لیے کتنا دباؤ ڈالا تھا۔ پرجوش عیسائی پادریوں اور مبلغین نے ''کفار'' کو ''ایمان'' کی روشنی سے منور کرنے کے لیے کتنے پاپڑ بیلے تھے۔ عیسائیت قبول کرنے والوں کو کیسے اس معاشرے میں تحفظ، خوش حالی اور مناصب سے نوازا جاتا تھا اور جو لوگ اپنے عقیدے پر سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ ہوتے انھیں کس طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا۔ بعض اوقات پورے پورے گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹا دیے جاتے، ان کی عبادت گاہیں، مسجدیں ہوں یا مندر، خاک کا ڈھیر بنا دی جاتیں اور اس خاک سے کلیسا تعمیر کیے جاتے۔

''یہ بابری مسجد ڈھانے والے اور مغل بادشاہوں کے ہندوؤں کی عبادت گاہیں مسمار کرنے کا غوغا کرنے والے، کبھی ان کلیساؤں کے بارے میں حرفِ شکایت تک زبان پر نہیں لائے؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟'' میں نے اپنے ہم ذات کو چڑایا۔ ''اس لیے کہ مذہب ہمیشہ سیاست کا کھلونا رہا ہے۔'' اس نے مدبر بن کر مختصر سا جواب دیا اور خاموش ہو گیا۔

ایک اور دلچسپ سیمینار ڈاکٹر جیمز کیرن نے دیا۔ ڈاکٹر جیمز کچھ عرصہ پہلے ہی سوآس کے شعبہ جنوب ایشیائی زبان و ثقافت میں جنوب ایشیا میں اسلامی مطالعات کے لیکچرار کے طور پر تعینات ہوئے تھے۔ انھیں اردو اور پشتو دونوں زبانوں سے خاصی واقفیت ہے اور افغانستان اور پاکستان ان کے تحقیق کے خاص موضوع ہیں۔ پاکستان سے ان کی دلچسپی کا ایک ثبوت ان کی پاکستانی بیگم بھی ہیں جو فیصل آباد سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا یہ سیمینار بھی، پشاور میں مقیم، جمعیت علمائے پاکستان سے تعلق رکھنے والے، مولانا بجلی گھر سے متعلق تھا۔ ڈاکٹر

جیمز کیرن کو گلہ تھا کہ دسمبر ۲۰۱۲ میں مولانا بجلی گھر کی وفات کی خبر نہ تو پاکستانی میڈیا پر توجہ حاصل کر سکی اور نہ ہی اہل علم و تحقیق نے انھیں اپنے مطالعے کا موضوع بنانے کی کوشش کی، حالاں کہ ان کے خیال کے مطابق شاید ہی کسی فرد واحد نے پشتو بولنے والے افراد پر اتنے گہرے اثرات مرتب کیے ہوں، جتنے مولانا بجلی گھر کے ہوئے۔ ان کا یہ گلہ ان معنوں میں تو بجا تھا کہ یہ نام میرے لیے قطعاً اجنبی تھا اور میں نے پاکستانی اخبارات اور میڈیا میں کبھی اس شخصیت کا ذکر پڑھا نہ سنا۔ اسی لیے میں نے ان کا لیکچر بہت دلچسپی سے سنا۔

مولانا بجلی گھر کا تعلق درہ آدم خیل کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے تھا اور وہاں وہ ایک مدرسے میں مذہبی تعلیم دیتے تھے۔ ان کی سیاسی اور تاریخی وابستگیوں کی داستان تو بہت طویل ہے تاہم ان کی وجہ شہرت طنز و مزاح پر مبنی وہ تقریریں ہیں جن کے ذریعے وہ لوگوں کو اسلامی تعلیمات کی طرف راغب کرتے تھے اور ڈاکٹر جیمز کے بقول، ان کی یہ تبلیغی کوششیں نتائج اور اہمیت کے اعتبار سے رسمی اور سنجیدہ تبلیغ سے کسی طرح کم نہیں۔ اس لیکچر میں انھوں نے تاریخی اور علاقائی حوالوں سے اسلام کی غیر رسمی تبلیغی کوششوں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

انھی دنوں ایک ورکشاپ تعلیمی مقاصد کے نتائج کے متعلق بھی ہوئی جس کا اہتمام ایک پروفیسر صاحب نے کیا تھا۔ اس ورکشاپ میں تدریس کو ادارے کے مجموعی مقاصد سے ہم آہنگ کرنے کے لیے تجاویز اور تدابیر پر بحث ہوئی۔ یہ ایک انتہائی رسمی، غیر دلچسپ اور بے نتیجہ سی ورکشاپ تھی۔ جو باتیں کہی گئیں وہ سبھی اساتذہ کے علم میں تھیں۔ غالباً اس کا سب سے زیادہ فائدہ خود ورکشاپ کروانے والے پروفیسر صاحب ہی کو پہنچا کہ ان کے ذاتی کوائف نامے میں ایک اور کارروائی کا اضافہ ہو گیا۔ ہم پاکستان میں تو ایسی سرگرمیاں دیکھنے کے خوب عادی ہیں جو محض کارروائی ڈالنے کے لیے ہوتی ہیں۔ بل کہ ہمارے ہاں سرکاری جامعات میں ایسی سرگرمیاں اتنی کثرت سے ہوتی ہیں کہ سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ اس قسم کی کارروائی کی ایک مثال تو وہ سیمینار، لیکچر یا کانفرنسیں ہوتی ہیں جن میں سامعین کی نشستیں بھرنے کے لیے بعض اوقات کلرکوں، نائب قاصدوں اور عملے کے دیگر افراد کو زبردستی کرسیوں پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ ان کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ ہر تقریر کے بعد تالیاں بجا دیں۔ اگر کہیں طالب علموں پر زور چلتا ہو تو انھیں، ان کی کلاسوں سے نکال کر زبردستی ہال میں بھیجا جاتا ہے جہاں اساتذہ ان کی حاضری لگاتے ہیں اور حاضر نہ ہونے والے طالب علموں کو ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ پورے پروگرام کے دوران طالب علم یا تو اونگھتے رہتے ہیں یا سر جھکا کر فون یا کاغذ پر ایک دوسرے کو پیغامات لکھتے اور کارٹون بناتے ہیں۔ اگر کہیں طالب علم سرکشی کر جائیں تو ان کے اساتذہ کی خوب شامت آتی ہے کہ وہ اپنے طالب علموں میں علمی ذوق پیدا نہیں کرتے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ جب اساتذہ کا انتخاب اور ترقیاں ان کی علمی قابلیت کی بجائے خوشامد، جعل سازی اور سیاسی وابستگی کی بنا پر ہوتی ہوں تو خود ان میں علمی ذوق کتنا ہوگا اور کہاں سے آئے گا؟

اسی طرح کی بعض کارروائیاں، کبھی کبھی ہائر ایجوکیشن کمیشن اوف پاکستان کے زیر انتظام معاملات میں

بھی نظر آتی ہیں جن میں رسمی کاغذی کارروائی مرکزی اہمیت اختیار کر جاتی ہے اور اصل مقصد کہیں پس پشت چلا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایچ ای سی نے معیار کی بلندی کی ضمانت کے لیے یہ طے کر لیا ہے کہ پی ایچ ڈی کے مقالے، جانچ کے لیے کسی ترقی یافتہ ملک کے ماہر کو بھیجے جائیں اور اسی عمومی حکم کے ذیل میں اردو کے مقالے بھی آتے ہیں۔ ان ''ترقی یافتہ ممالک'' میں اکثر پروفیسر وہی ہیں جو خود پاکستان یا بھارت سے پی ایچ ڈی کر کے گئے ہیں۔ مگر اس قانون کے تحت ان نوجوان پروفیسروں کی رائے کو خود ان کے اساتذہ کی رائے پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ خود اردو کے طالب علم، اساتذہ اور محقق اس صورت حال پر خوش ہیں کیوں کہ باہر سے ہر مقالے پر نہایت عمدہ رپورٹ آ جاتی ہے۔ جب کہ پاکستان میں بعض سینئر اساتذہ معیار پر اصرار کرتے ہیں اور بعض سیاسی و دیگر گروہ بندیوں کے باعث بغض کا اظہار کرتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں محقق کو فائدہ اسی میں نظر آتا ہے کہ مقالہ کہیں باہر بھیج دیا جائے۔ حیف! صد حیف!

ایک اور مزے کی بات یہ ہے کہ مقالات میں نقل (plagiarism) کی روک تھام کے لیے ایچ ای سی بہت حساس معلوم ہوتا ہے، چناں چہ ایک ایسا مشینی نظام متعارف کرایا گیا ہے جو نقل کی روک تھام میں ممد ہے۔ لیکن اس کا سب سے مضحکہ خیز پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی مقالہ اردو میں لکھا گیا ہے تو ایچ ای سی plagiarism کا کھوج لگانے کے لیے فرمائش کرتا ہے کہ پہلے اس مقالے کو انگریزی میں ترجمہ کروا کے لائیں۔ پھر ترجمے کو اس مشینی نظام کے ذریعے پرکھا جاتا ہے۔ اس سے بھی دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ ایچ ای سی کے نزدیک plagiarism سے مراد صرف اور صرف انٹرنیٹ کے مواد سے نقل کرنا ہے، چناں چہ جو لوگ مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مواد سے نقل کر لیتے ہیں، انھیں پکڑنے کا کوئی طریقہ نہیں اور ایک بار انھیں ڈگری مل جائے تو اسے کوئی واپس نہیں لے سکتا۔ اور سب سے عجیب بات تو یہ ہے کہ انسانیات اور معاشرتی سائنسوں میں پیسے دے کر تحقیقی مقالے لکھوانے کا رواج عام ہے۔ پہلے بھارت میں یہ وبا پھیلی اور اب پاکستان میں بھی اس کی مقبولیت میں دن رات اضافہ ہو رہا ہے۔ بعض مضامین، مثلاً اردو میں پی ایچ ڈی کا مقالہ ایک لاکھ روپے میں اور ایم فل کا پچاس ہزار تک میں لکھا جاتا ہے، لکھنے والے بھی انہی جامعات کے اساتذہ ہیں جو ڈگریاں تفویض کرتی ہیں۔ سیاں بھئے کوتوال۔

اساتذہ کو اگلے گریڈ میں ترقی پانے کے لیے ایچ ای سی کے منظور شدہ مجلات میں تحقیقی مقالات شائع کروانے پڑتے ہیں۔ یہ کہانی بھی اپنا ایک الگ ذائقہ رکھتی ہے۔ عام طور پر، یا کم از کم اردو جیسے شعبوں میں، صرف جامعات کے جرنل ہی منظور شدہ جرائد کی فہرست میں شامل ہوتے ہیں۔ اب جامعات میں جو ایک دفعہ کسی نہ کسی طرح صدر شعبہ مقرر ہو گیا، وہی اس جرنل کا مدیر بھی ہو گا۔ یونیورسٹی کی سیاست اور گروہ بندی کی فضا کس سے مخفی ہے۔ نتیجہ یہ کہ سینئر اساتذہ کرام اپنے بچے جموروں کے مقالات چھپوانے اور دوسروں کے مقالات چھپنے سے رکوانے کے لیے سارا زور صرف کر دیتے ہیں۔ مرد حضرات ہی نہیں، نوجوان خواتین کے مقالات بھی ان کے مربی پروفیسروں کی پرچی کی کرامت سے شائع ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک شاید پھر بھی

قابل قبول ہوتا، مگر ستم تو یہ ہے کہ ان میں ایسے مقالات بھی شامل ہوتے ہیں جو دس ہزار روپے ادا کر کے ”فاضل“ محققین سے لکھوائے جاتے ہیں۔ جن کے ناموں سے یہ مقالات شائع ہوتے ہیں، ان سے اگر، مضمون میں شامل چند الفاظ کے معانی ہی پوچھ لیے جائیں تو پول کھل جائے لیکن اتنی محنت کرے کون۔ انھی مقالات کے مجموعے ملک کے معتبر ادبی اداروں سے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ اب مغز کو بھس سے علیحدہ کرنے کی کھکھیڑ کون کرے۔ دھاندلی، جھوٹ، بناوٹ، منافقت اور بد دیانتی کی دلدل ہے جس میں ہر ایک دھنستا چلا جا رہا ہے۔ اور ستم یہ کہ کارروائی ہر جگہ پوری ہوتی ہے۔ اصول وضوابط کے مطابق تمام بے ضابطگیاں عمل میں لائی جاتی ہیں۔ ایسے میں جو لوگ محنت اور علم وتحقیق پر یقین رکھتے ہیں، وہ روز بروز گوشہ نشینی پر مجبور ہوتے جا رہے ہیں یا اپنے لیے کسی اور میدان عمل کے متلاشی رہتے ہیں۔ فیض صاحب یاد آ گئے:

ہاں جو جفا بھی آپ نے کی قاعدے سے کی
ہاں ہم ہی کاربند اصول وفا نہ تھے

اس لیے سوآس میں یہ ورکشاپ بھی بری نہیں لگی۔ کم از کم سچ مچ کے اصلی پروفیسر اس میں شریک تھے۔ انھوں نے سوال کیے، انھیں جواب دیے گئے اور بحث مباحثے کی فضا جعلی نہیں، اصلی تھی۔ البتہ ایک بات میں نے یہاں بھی اور آئندہ باقی یونیورسٹیوں میں بھی بطور خاص محسوس کی کہ یہاں بھی طالب علموں میں ذوق و شوق کچھ ایسا خاص نہیں۔ ہر سیمینار میں سات آٹھ سے زیادہ سامعین نہیں ہوتے۔ مگر اس سے مایوس ہو کر یہ لوگ اپنی سرگرمیاں ترک نہیں کر دیتے۔ نہ ہی کلرکوں اور نائب قاصدوں کو بٹھا کر جعلی ماحول بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چاہے گنتی کے چار لوگ ہی کیوں نہ ہوں، سیمینار ہو جاتا ہے۔ البتہ موسیقی یا فلم سے متعلق اگر کوئی پروگرام منعقد کیا جائے تو ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی۔ جیسے میرے یہاں ہوتے ہوئے ایک بار شبانہ اعظمی اور جاوید اختر کو آنا تھا۔ جاوید تو نہ آ سکے لیکن شبانہ آ گئیں۔ ان کی گفتگو کا موضوع تھا: Can film be used as an instrumet for social change۔ ہال میں ایک بھی نشست خالی نہ تھی۔ انتظامیہ کو اپنے مہمانوں کے لیے خاص طور پر نشستیں محفوظ کرنا پڑیں۔ شبانہ نے بہت عمدہ اور پر مغز گفتگو کی۔ وہ آئیٹم سونگ اور مردوں اور عورتوں کی جسمانی نمائش کو ان کے فن پر ترجیح دینے کے رجحان سے نالاں نظر آئیں اور آرٹ اور اس کے متعلقات کی اہمیت پر بات کرتی رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ بھارت میں آئیٹم سونگ کے رجحان کے باوجود، آرٹ فلمیں بھی بنتی ہیں اور دیکھی بھی جاتی ہیں لیکن آرٹ فلموں کا مقابلہ کمرشل فلموں سے نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ آرٹ کے قدر دان تعداد میں ہمیشہ کم ہی ہوتے ہیں۔

ہائیڈل برگ تک

ایک سستی یورپین ہوائی کمپنی کے چھوٹے سے جہاز کی اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے جب میں نے فرینکفرٹ ائرپورٹ پر ٹیکسی کرتے جہاز کی کھڑکی سے جھانکا تو فضا میں سفید سفید ذرات اڑتے ہوئے نظر آئے۔

”شاید یہ بھی فضائی آلودگی کی کوئی قسم ہے!“ میں نے جل کر سوچا۔

دراصل اس ہوائی کمپنی کا تجربہ بالکل خوش گوار ثابت نہیں ہوا تھا۔ یہ ائر لائن ان چند فضائی کمپنیوں میں سے ایک ہے جو یورپ کے اندر کم سے کم قیمت میں سفر کرنے کے لیے بہت مشہور ہیں۔ مگر سستا ٹکٹ خریدنے والوں کے لیے بار بار رونے کے مواقع بھی وافر ہیں۔ ایک تو ہر ملک اور شہر میں ان کے ائرپورٹ اصل شہر سے بہت دور بل کہ بیشتر تو کسی دوسرے قریبی شہر میں ہوتے ہیں۔ وہاں تک جانے آنے کے لیے ٹرانسپورٹ کا خرچ بھی ٹکٹ میں شامل ہو جاتا ہے۔ پھر ان کے کچھ خفیہ اخراجات بھی ہوتے ہیں جو صرف ٹکٹ خریدنے کے بعد ہی منکشف ہوتے ہیں۔ البتہ جو لوگ ایسی سستی ائر لائنوں پر سفر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں، وہ پہلے سے خود کو متوقع حملوں سے بچانے کے لیے تیار کر لیتے ہیں اور یوں فائدے میں رہتے ہیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ پہلی بار سفر کرنے والا لازماً کہیں نہ کہیں مار کھا جاتا ہے؛ سستی ٹکٹ سراب ثابت ہوتی ہے اور تکلیف مفت میں اٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن غلطی میری تھی۔ میں نے اپنے پروگرام کو زیادہ سے زیادہ مؤثر اور کارگر بنانے کے لیے کوشش کی تھی کہ پاکستان سے چلنے سے پہلے ہی دیگر ممالک کے سفر کی تاریخیں بھی طے کر لوں تاکہ ہر کام منصوبہ بندی اور سوچے سمجھے پروگرام کے مطابق عمل میں آئے۔ (اپنی فطرت کے خلاف عمل کا یہی نتیجہ ہونا چاہیے تھا، جو ہوا) اسی خیال کے تحت میں نے ہائیڈل برگ، ایڈنبرا اور روم یونی ورسٹی میں اپنے سیمیناروں کی تاریخیں میزبانوں کی مشاورت سے طے کر لی تھیں اور کسی سے مشورہ کیے بغیر جرمنی کا ٹکٹ بھی خرید لیا تھا۔ یہ ٹکٹ انٹرنیٹ پر مختلف کمپنیوں کے کرایوں کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد سب سے کم قیمت سمجھ کر خریدا گیا تھا، مگر جوں ہی میں نے کریڈٹ کارڈ کا نمبر درج کیا تو اگلے ہی لمحے فون کی گھنٹی بجی اور معلوم ہوا کہ ۲۰ پونڈ کٹ گئے ہیں۔ یہ ۲۰ پونڈ اس کمپنی کا کمیشن تھے جو اس ائر لائن کے ایجنٹ کے طور پر اس کی ٹکٹیں بیچ رہی تھی۔ خود پر غصہ آیا کہ براہ راست ائیر لائن کی ویب سائٹ سے رجوع کیوں نہ کیا مگر غلطی اپنی تھی، اس لیے غصہ پینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اگلا صدمہ اس وقت پہنچا جب سفر سے ایک ہفتہ پہلے برقی خط موصول ہوا کہ ائیر پورٹ جانے سے پہلے اون لائن بورڈنگ پاس حاصل کرنا ضروری ہے۔ جو بغیر بورڈنگ پاس کے ائرپورٹ پہنچے گا، اسے بھاری جرمانہ ہوگا۔ اور جب بورڈنگ پاس حاصل کرنے کے لیے اپنا اکاؤنٹ کھولا تو معلوم ہوا کہ اس خدمت کے لیے ائر لائن ۲۰ پونڈ وصول کرتی ہے۔ گویا ۲۰ پونڈ جانے اور ۲۰ پونڈ آنے کے، کل ملا کر ۴۰ پونڈ ہو گئے۔ اب اس کمپنی اور دیگر ہوائی کمپنیوں کے کرایے میں کوئی فرق نہ رہا۔

پھر ایک اور خط ملا کہ اگر آپ کے پاس کوئی سامان ہے تو اس کی بکنگ کے لیے علیحدہ فیس وصول کی جائے گی۔ صرف ایک مخصوص ناپ کے دستی بیگ کی اجازت ہے، اس کے علاوہ کمپیوٹر، کیمرہ، حتیٰ کہ خواتین کا پرس بھی ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ جس ناپ کے بیگ کی اجازت تھی، اس میں بمشکل کمپیوٹر، کیمرہ، پرس اور ایک آدھ کپڑوں کا جوڑا سما سکتا تھا۔ خیر میں نے فیتے سے ناپ ناپ کر بیگ کے بارے میں خوب اطمینان کر لیا اور پھر انتہائی ضرورت کی چند چیزیں جو اس میں سمائیں، رکھ لیں، کیوں کہ مزید پیسے دینا مجھے گوارا نہ تھا۔ پھر یہ تسلی بھی تھی کہ ماموں سلیم اور سعیدہ باجی فرینکفرٹ میں موجود ہیں وہ نہ صرف مجھے لینے آئیں گے بل کہ ضرورت کی

اشیا بھی فراہم کر دیں گے۔

جانے کا دن قریب آیا تو معلوم ہوا کہ اس ہوائی کمپنی کے جہاز جس ائر پورٹ سے اڑتے ہیں وہ لندن سے تقریبا ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر ہے اور وہاں لندن کا پبلک ٹرانسپورٹ کارڈ نہیں چلتا۔ وقفے وقفے سے ایک ٹرین ضرور وہاں جاتی اور آتی ہے مگر اس کا یک طرفہ ٹکٹ سترہ پونڈ فی کس ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اپنے پاکستانی ماحول میں بیٹھ کر میں نے جس جہاز کی بکنگ کرائی تھی اسے سات بجے صبح روانہ ہونا تھا اور کم از کم ایک سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ائر پورٹ پہنچنا بھی لازم تھا۔ مجھے تو اسلام آباد ائر پورٹ کی عادت تھی جس کے پھیرے میں اور عارف دن اور رات کے ہر حصے میں لگا چکے ہیں۔ اسلام آباد میں رہنے کی وجہ سے ہمارا گھر ہمیشہ سے بیرون ملک جانے اور آنے والے مسافروں کا پہلا ٹھکانہ رہا ہے۔ اگر سڑکیں قدموں یا ٹائروں کے نشان یاد رکھ سکتیں، تو ائر پورٹ کے راستے ہمیں اپنا ہی کوئی مقام سمجھتے۔

لیکن یہاں لندن میں صبح ساڑھے پانچ بجے ائر پورٹ پہنچنے کے لیے گھر سے چار بجے نکلنا ضروری تھی، وہ بھی اس شرط پر کہ اس وقت کوئی ٹرین مل جائے۔ جنوری کی سرد اور تاریک راتیں اور یہ مہم جوئی! میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ابھی لندن آئے مجھے دو ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے۔ راستوں کے بارے میں خود اعتمادی ابھی نہیں آئی تھی۔ لندن کے محفوظ شہر ہونے کا جتنا چرچا تھا، اتنا ہی غوغا غیر محفوظ ہونے کا بھی تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے حماد کا، جس نے مجھے ہفتے کے روز صبح چار بجے ائر پورٹ چھوڑ آنے کی ہامی بھر لی۔ حماد نہ صرف رفعی کا بلکہ اس کی سب سہیلیوں کا بھی برادرِ خورد ہے، اور میں تو رفعی کی بھی باجی ٹھہری۔ حماد کا استحصال اپنا حق سمجھ کر کیا۔ اسے بھی ساڑھے چار بجے اپنی ملازمت پر پہنچنا تھا، اس لیے اس نے مجھے ائر پورٹ کے باہر اتارا اور میں نے اسے تسلی دی کہ اب پہنچ جاؤں گی۔ ساڑھے پانچ بجے تک کا وقت میں نے سٹنسرڈ ائر پورٹ (Stanstard) کی راہداریوں، ہال کمروں اور دکانوں میں گھوم پھر کر گزارا۔ کبھی بیگ کھول کر اپنا لیپ ٹاپ نکالتی اور اسے ائر پورٹ کے وائی فائی سے منسلک کرنے کی کوشش کرتی، کبھی کوٹ اتار کر ہاتھ میں پکڑتی، بازو تھک جاتے تو پھر پہن لیتی، کبھی ادھر ادھر گھومتے رنگ رنگ کے چہروں کو دیکھتی اور ان میں مشابہت تلاش کرنے کی کوشش کرتی اور کبھی آنے والے وقت کے بارے میں سوچنے لگتی۔

خدا خدا کر کے ساڑھے پانچ بجے ائر لائن کا کاؤنٹر کھلا۔ ایک طرف سامان بک کروانے والے مسافروں کی قطار تھی اور دوسری طرف صرف دستی سامان ساتھ لے جانے مسافر کھڑے تھے۔ میں دوسری قطار میں لگ گئی۔ دونوں قطاروں کے سرے پر لوہے کا ایک پنجرہ سا پڑا تھا جس پر لکھا تھا کہ دستی سامان کا حجم معلوم کر لیجیے تا کہ آپ کو بعد میں کوئی پریشانی نہ ہو، کئی مسافر اپنا دستی سامان اس میں ڈال کر دیکھ رہے تھے۔ لیکن میں مطمئن تھی کیوں کہ میں نے فیتے سے خوب اچھی طرح ناپ کر بیگ منتخب کیا تھا۔ ایک طرف چینی، جاپانی یا کوریائی لڑکیاں فرش پہ تھلی مار کر بیٹھی تھیں اور اپنے بیگ سے کپڑے نکال نکال کر دوسرے بیگ میں منتقل کر رہی تھیں۔

"شکر ہے، خدا کا، مجھے گھر میں ہی اس قاعدے کا علم ہو گیا تھا۔ ائر پورٹوں پر یوں بیگ کھول کر کپڑے

ادھر سے ادھر کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے! ہم ایشیائی لوگ تو اس بات کو کافی شرم ناک بھی سمجھتے ہیں۔ ‘‘میں نے دل میں سوچا اور کاؤنٹر تک پہنچ گئی۔

ایک درمیانی عمر کی سپاٹ چہرے والی خاتون وہاں بیٹھی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا، کمپیوٹر کے کچھ بٹن دبائے، میرے بیگ پر نظر ڈالی اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کر دیا۔

میں نے سکھ کا ایک لمبا سانس لیا اور سیکیورٹی کی مشینوں سے گزرنے کے بعد ایک اور لمبی قطار میں لگ گئی۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک انتہائی کرخت چہرے والی خاتون قطار کے دونوں طرف منڈلاتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے ائر لائن کا یونی فارم پہن رکھا تھا اور وہ نجانے کس اصول کی بنا پر کچھ مسافروں کو منتخب کر کے انھیں قطار سے باہر لے جا رہی تھی۔

’’پتا نہیں، کہاں لے جا رہی ہے؟‘‘ میں نے بے پروائی سے سوچا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے۔ پھر وہ میرے قریب آئی اور اشارے سے مجھے قطار سے باہر آنے کو کہا۔ میں نے بہت بے آرامی محسوس کی کیوں کہ میں قطار کے درمیان کھڑی تھی۔ ایک دفعہ باہر نکلنے کا مطلب تھا کہ قطار کے آخر میں لگنا ہو گا۔

’’کیوں؟ کیا ہوا؟‘‘

’’تمھارا بیگ مقررہ ناپ سے بڑا ہے۔‘‘

’’جی نہیں، میں نے خود اسے فیتے سے ناپا ہے۔ یہ ۵۵x۴۰x۲۰ سنٹی میٹر ہی تو ہے۔ ائر لائن کی ویب گاہ پر یہی ناپ درج ہے۔‘‘

’’ناپ تو یہی ہے لیکن یہ بیگ اس ناپ سے بڑا ہے۔‘‘

’’ہو ہی نہیں سکتا، میں نے خود ـــــ‘‘

’’اسے اس پنجرے میں ڈالو!‘‘ اس نے میری فریاد پر کان دھرے بغیر ہدایت دی۔

میں نے بیگ کو پنجرے میں ڈالا، وہ کم از کم چار انچ اس سے باہر نکل آیا۔

’’دیکھا؟‘‘

’’مگر یہ تو پہیوں کی وجہ سے اونچا ہو گیا ہے۔ دیکھو چار انچ کے تو اس کے پہیے ہیں۔‘‘

’’ہم پہیوں سمیت ہی ناپتے ہیں۔‘‘

’’کیا؟ پہیوں سمیت؟ مگر کیوں؟ یہ کیا بات ہوئی؟ یہ بھی کوئی انصاف ہے ـــــ‘‘

’’ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ ائر لائن کے قوانین اٹل ہیں۔‘‘ اس کا چہرہ اتنا سخت، سپاٹ اور بے لچک تھا جیسے لکڑی سے بنا ہو۔ اس کی طرف دیکھ کر ہی یقین آ جاتا تھا کہ یہ کچھ نہیں سنے گی۔

’’اچھا تو پھر اب ـــــ؟‘‘

’’اب یہ کہ، یہ بیگ جہاز پر نہیں جا سکتا۔‘‘

“تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟”

“بیگ کو بک کرواؤ اور ساٹھ پونڈ جرمانہ ادا کرو”

“جرمانہ کس چیز کا؟”

“وقت پر بک نہ کروانے کا۔”

“ساٹھ پونڈ؟ میں نے جب ٹکٹ خریدنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس کی قیمت ۴۸ پونڈ تھی۔ اب تک اس کی قیمت ۱۰۰ پونڈ سے زیادہ ہو چکی ہے اور اب آپ ۶۰ پونڈ جرمانہ مانگ رہی ہیں۔ میں ہرگز نہیں دوں گی۔ یہ سخت بے انصافی ہے۔”

“تمھاری مرضی ہے، نہ دو، مگر پھر یہ بیگ تمھارے ساتھ نہیں جا سکے گا۔”

“مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ ائر لائن اس طرح دھوکا دیتی ہے۔”

“ائر لائن نے کوئی دھوکا نہیں دیا۔ ہم نے بیگ کا مقررہ ناپ ہر جگہ لکھ رکھا ہے۔”

“مگر یہ تو نہیں لکھا کہ بیگ کے پہیے بھی اس کے ناپ میں شامل ہوں گے۔”

میں نے جلدی جلدی قطار میں کھڑے مسافروں کے دستی سامان پر نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سب کے بیگ اپنی ساخت میں میرے بیگ سے مختلف تھے۔ ان بیگوں کے پہیے باہر نکلے ہوئے نہیں تھے۔ میں نے اس قسم کے بیگ پہلی بار دیکھے تھے اور ان کی افادیت اور معنویت اب میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یقیناً یہ بیگ بھی اسی کمپنی کے کسی ذیلی تجارتی ادارے نے تیار کیے ہوں گے۔ یا ان کے کسی رشتے دار کے کارخانے میں تیار ہوتے ہوں گے۔ استعماری نظام میں اسی طرح عوام کی خدمت اور سہولت کے نام پر انھیں بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ یہ تجارتی کمپنیاں ہی تو ہیں تو جو ہماری قدروں، روایتوں، حتیٰ کہ شخصیتوں کا بھی تعین کرتی ہیں۔ کبھی آئے دن معمولی سے ردوبدل کے بعد ایک نیا ماڈل پیش کر کے، کبھی بدلتے موسموں کے ساتھ بدلتے فیشن کا روپ بھر کے۔ میرے اندر تلخی بھر گئی تھی۔

میری فیلوشپ کی رقم لندن میں رہن سہن اور دیگر اخراجات کے لیے تو کافی تھی، مگر یہ یورپ کے سفر اس کی گنجائش سے باہر تھے۔ اسی لیے عارف نے چلتے ہوئے مجھے کچھ یورو خرید دیے تھے اور میں نے “پائی پائی” کا حساب لگا کر جرمنی، روم اور پیرس کا پروگرام بنا لیا تھا۔ یہ ائر لائن نہ صرف میرے اس معاشی پروگرام کو الٹ پلٹ کرنے کے درپے تھی بل کہ مجھے ایک اور فکر بھی لاحق ہو گئی تھی: میں پیرس سے روم کا ٹکٹ بھی اسی ناتجربہ کاری کی حالت میں ایسی ہی ایک اور سستی کمپنی سے خرید چکی تھی۔ لہٰذا ہر دھچکے پر میں جتنی رقم اس ائر لائن کو ادا کرتی تھی، اتنی ہی رقم یورو میں تبدیل کر کے اس دوسری ائر لائن کے ٹکٹ میں شامل کر دیتی اور میرا بجٹ کچھ اور شدت سے لنگڑانے لگتا۔

لیکن فی الحال تو اپنے استعمار دشمن جذبات پر قابو پا کر اس مسئلے سے نمٹنا باقی تھا۔

“اچھا، چلو کوئی اور رستہ بتاؤ!” میں نے سٹپٹا کر ہار مان لی۔

‘‘دوسرا رستہ یہ ہے کہ اس بیگ کو یہیں پھینک دو!’’

‘‘اور سامان کیسے لے جاؤں؟’’

‘‘ہماری ائر لائن کا بیگ خرید لو، اس کے ناپ کی میں گارنٹی دیتی ہوں۔’’

‘‘دیکھا، دیکھا! میں نے کہا تھا نا؟’’ اندر سے آواز آئی جسے نظر انداز کرنا ہی مناسب تھا۔

‘‘اور وہ کتنے کا ہے؟’’ میں نے ذرا امید سے پوچھا۔

‘‘اچھا والا ۸۹ پونڈ کا اور عام سا ۴۹ پونڈ کا۔’’ میں نے جلدی سے حساب کتاب کیا اور نئے بیگ کی قیمت میں پرانے بیگ کی قیمت کو جمع کیا تو ساٹھ پونڈ ادا کرنے میں ہی عافیت نظر آئی۔

‘‘پرس کھولتے ہوئے مجھے خیال آیا، کہ واپس بھی تو آنا ہے۔

‘‘تو کیا واپس آتے ہوئے پھر ساٹھ پونڈ ادا کرنے ہوں گے؟’’ میں نے حواس باختہ ہو کر پوچھا

‘‘اگر تم نے اون لائن سامان بک نہ کروایا تو۔۔’’

‘‘اور اگر اون لائن کروا دیا تو۔۔؟’’ میں نے سانس روک کر پوچھا۔

‘‘تو پھر صرف پندرہ پونڈ!’’ اس نے مشینی انداز میں جواب دیا۔

میں نے انتہائی بوجھل دل سے پرس کے اندرونی خانے سے پونڈ نکالے جو یونہی احتیاطاً ساتھ رکھ لیے تھے، ورنہ جرمنی میں استعمال کے لیے تو پونڈ کی ضرورت نہیں تھی۔

اس نے رسید میرے ہاتھ میں تھمائی اور بیگ مجھے واپس پکڑا کر کہنے لگی، ‘‘جہاز میں جا کر عملے کو دے دینا!’’

میں واپس مڑ کر قطار کے آخری سرے کی طرف بڑھنے لگی تو اسی خاتون نے بڑھ کر ایک دروازہ کھول دیا۔

‘‘ادھر آجاؤ، تمھارے پاس ترجیحی بورڈنگ پاس ہے’’۔ اس نے ایک مختصر سی قطار کی طرف اشارہ کیا۔

مگر اس کی اس مہربانی نے بھی مجھے کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ یہ درست ہے کہ اس قطار کو جہاز کی طرف جانے والے راستے پر سب سے پہلے داخل ہونے کا موقع ملا گیا لیکن جب تک لمبی قطار کے باقی مسافر نہیں پہنچ گئے، ہم جہاز میں داخل نہیں ہو سکے۔

‘‘جب انتظار ہی کرنا ہو تو قطار لمبی ہو یا چھوٹی، کیا فرق پڑتا ہے۔ ترجیحی بورڈنگ پاس! ہنھ! سب ڈھکوسلے ہیں’’۔ میں نے جلتے کڑھتے ہوئے سوچا اور ایک بار پھر حساب لگایا کہ اگر میں ہیتھرو سے آنے والی کوئی بڑی ائر لائن منتخب کرتی تو اس سے کم پیسوں اور کہیں کم تکلیف میں پہنچ سکتی تھی۔ حماد کو بھی تکلیف نہ دینی پڑتی اور میزبانوں کو بھی، کیوں کہ فرینکفرٹ ائر پورٹ پر اتر کر مجھے معلوم ہوا کہ اس جگہ کو فرینکفرٹ صرف اس ائر لائن والے ہی کہتے ہیں، دراصل یہ فرینکفرٹ سے تقریباً دو گھنٹے کی مسافت پر امریکی فوج کا چھوڑا ہوا پرانا ہوائی اڈہ ہے جو خالی اور ویران پڑا تھا اور اب ان سستی یورپی فضائی کمپنیوں کے زیر استعمال ہے۔ لیکن ماموں سلیم، سعیدہ باجی اور طارق اپنی محبت میں مجھے لینے اتنی دور تک آ پہنچے تھے۔

پہلی برفباری

پاکستان سے لندن کے لیے روانہ ہونے سے پہلے، جب سفر کی سب تفصیلات طے ہو گئی تھیں تو میں نے سوآس کو اپنے پروگرام سے تحریری طور پہ آگاہ کر دیا۔ جواب میں پروفیسر مائیکل ہٹ (Michael Hutt) کا ایک برقی خط موصول ہوا۔ مائیک نیپالی زبان و ادب، سیاست اور ثقافت کے ماہر اور سوآس کے شعبہ زبان و ثقافت کے سربراہ ہیں۔ انھیں یہ ذمہ داری سنبھالے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ یہ خط خیر مقدم کے رسمی اظہار کے لیے لکھا گیا تھا لیکن آخری چند سطروں میں بطور خاص ہدایت کی گئی تھی کہ لندن ان دنوں غیر معمولی طور پہ سرد ہے، اس لیے میں بہت سے گرم کپڑے اور اچھی قسم کی چھتری ساتھ رکھنا نہ بھولوں۔

میں نے اپنے کمپیوٹر پہ اسلام آباد کے ساتھ ساتھ لندن کے موسم کا حال بھی آویزاں کر دیا تھا اور روز کے روز، تازہ ترین موسمی تبدیلیوں سے باخبر رہتی تھی تاکہ کوئی اچانک صدمہ نہ پہنچے۔ سب لوگ مجھے سردی سے ڈراتے تھے تو میں کچھ کچھ ڈر بھی جاتی تھی، کیوں کہ اس سے پہلے میں نے کبھی سردیوں میں کسی سرد ملک کا سفر نہیں کیا تھا، لیکن برفباری دیکھنے کا شوق اس ڈر کو امید میں بدل دیتا تھا۔

مجھے اس شوق کی حدت پہلی بار کرشن چندر کا ناول ''دوسری برفباری سے پہلے'' پڑھ کر محسوس ہوئی تھی۔ یہ اوائل نوجوانی کے دن تھے اور کرشن چندر ان دنوں بہت خیال انگیز معلوم ہوتا تھا۔ کچھ اسلوب کا سحر اور کچھ تخیل کی بے تاب اڑانیں، برف باری کے تصور سے کچھ ایسا رومان وابستہ ہو گیا تھا کہ لگتا تھا برف باری کے موسم کا سامنا ہوتے ہی دل پہ انوار کی بارش ہونے لگے گی، فرشتوں کے پر جلتے ہوئے نظر آئیں گے اور زمین سے آسمان تک ہر طرف پھیلے ہوئے سفید گالوں میں میرا وجود یوں لپٹ جائے گا کہ اس کی کثافت لطافت میں بدل جائے گی، سیاہی کو سفیدی ڈھانپ لے گی اور روح اندر سے شانت ہو جائے گی۔

لیکن یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ پچھلے اکیس برس سے اسلام آباد میں رہنے کے باوجود، مجھے کبھی برف باری دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ حالانکہ مری جیسا پہاڑی مقام میرے گھر سے صرف ۵۲ کلومیٹر کے فاصلے پہ ہے، جہاں ہر سال سردیوں میں شدت سے برف پڑتی ہے۔

لیکن ہوا یوں کہ جب میں لندن پہنچی تو کڑاکے کی سردی کا جو موسم دسمبر میں قبل از وقت ہی رونما ہو گیا تھا، ایک دو ہفتے اپنی شدت دکھا کر ختم ہو چکا تھا۔ سردی تو بے شک تھی اور وہ روایتی ابر آلود دھندلا پن بھی موجود تھا جو لندن کی پہچان سمجھا جاتا ہے، لیکن برف کا امکان دور دور تک نہ تھا۔ میں نے بڑے اطمینان سے پہلے دو ہفتے گزار دیے۔ اگلے دو ہفتوں کے لیے، ۱۲ جنوری کی صبح مجھے جرمنی روانہ ہونا تھا کہ خبر ملی، میرے بعد لندن میں برف پڑے گی۔ مایوسی کی برف سی میری امید کے دیے پر بھی پڑ گئی۔

یہی وجہ ہے کہ جب جہاز (نام نہاد) فرینکفرٹ ائر پورٹ پہ ٹیکسی کر رہا تھا تو باہر فضا میں تیرتے سفید ذرات مجھے فضائی آلودگی معلوم ہوئے۔ چھوٹا سا جہاز تھا اور پچھلی صدی کا ہوائی اڈہ۔ عین میدان کے بیچ کھڑا ہو گیا اور ایک چھوٹی سی سیڑھی دروازے سے اچک کر باہر گر گئی۔ پاکستان میں تو ہم اس قسم کے سفر کے عادی

ہیں لیکن یورپ میں ناک بھوں چڑھانے کا ہمیں حق تھا۔ اس لیے ہونق صورت بنائے باہر نکلی تو یہ ذرات اڑاڑ کر میرے بالوں اور گالوں پر گرنے لگے۔ عمارت کی طرف ابھی چند قدم ہی چلی تھی کہ محسوس ہوا ہاتھ سن ہو گئے ہیں۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو زمین پر ان سفید ذرات کی تہہ سی جمتی نظر آئی۔

’’برف باری!!!‘‘ میرے اندر کسی گل ہوتے دیے کی لو پھڑپھڑائی۔

’’نہیں نہیں، برف باری نہیں ہے! کوئی صنعتی علاقہ ہوگا، کسی چیز کے ذرات ہوا میں اڑ رہے ہیں۔‘‘ میں نے اندر والے ہم ذات کو چڑایا۔

عمارت کے اندر پہنچتے پہنچتے مجھے احساس ہو چکا تھا کہ یہ ذرات برف کے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پانی کے قطرے جو سردی کی شدت سے جم کر برف بنتے جا رہے تھے۔ میں نے ہال کی بڑی بڑی کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر دیکھا، زمین پر ان ذرات کی ایک پتلی سی تہ جم گئی تھی۔

’’اچھا تو یہ ہوتی ہے برف باری!!‘‘ میرا جی چاہا، ان مغربی سیاحوں کی طرح جو صرف ٹورسٹ بسوں میں بیٹھ کر سیاحت کرتے ہیں، ڈائری پر لکھ دوں ’’seen‘‘۔

کچھ بھی نہیں ہوا۔۔۔ وہ سب کچھ، جو برف باری کے تصور سے وابستہ تھا، اب بھی کسی پرستان کے منظر کی طرح دسترس سے بہت دور تھا۔ میرا اندر ویسے کا ویسا ہی تھا۔ سخت اور بے لچک، کثیف اور سیاہ۔ ایک اور بت ٹوٹ گیا۔ ایک اور امید سے جان چھوٹی، ممتاز مفتی یاد آ گئے جو ایسے موقعوں پر کہا کرتے تھے:

بھلا ہوا میری گاگر ٹوٹی
میں تو پانی بھرن سے چھوٹی

لیکن اگلے دو ہفتوں میں مجھے فرینکفرٹ اور ہائیڈل برگ کو برف سے مکمل طور پر ڈھکا ہوا دیکھنا بھی نصیب ہوا۔ میں نے درختوں سے لٹکتے ہوئے سفید فانوسوں کی روشنی میں رات کی کئی ساعتیں گزاریں۔ برف کی سفید چادر پر ٹھٹھرے ہوئے پاؤں رکھ کر گزرنے کا تجربہ بھی کیا اور رات کو دیر تک جاگ کر شہر پر اترتے ہوئے نرم نرم گالوں کا نظارہ بھی کیا۔

فرینکفرٹ تو میرے لیے راستے کا ایک پڑاؤ تھا۔ اصل منزل ہائیڈل برگ تھی جہاں ڈاکٹر کرسٹینا صبح کے نو بجے، اپنی چھتری سنبھالے اسٹیشن پر منتظر کھڑی تھیں۔ کرسٹینا ہائیڈل برگ یونی ورسٹی کے شعبہ ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ میں اردو کی سینئر لیکچرر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے علم، تحقیق، تدریسی مہارت اور اردو سے وابستگی کے باعث کئی پروفیسروں سے زیادہ صاحبِ علم ہیں۔ ان کا پروفیسر نہ ہونا بھی ان کی درویشانہ بے نیازی ہی کی ایک مثال ہے کیوں کہ اپنی خاندانی مصروفیات کے باعث، جن میں بیٹی، شوہر اور والدہ کی دیکھ بھال شامل ہے، وہ جرمن یونی ورسٹیوں کی ان رسمی کارروائیوں کو پورا کرنے پر توجہ نہ دے سکیں، جو پروفیسر بننے کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ انھوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہوگا۔ جو شخص انسانی رشتوں کو پیشہ ورانہ ترقیوں پر ترجیح دیتا ہے، اس کے اندر ضرور کوئی ’’گھادرویش‘‘ چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ اب اگر کرسٹینا میری یہ

بات سن یا پڑھ لیں تو ہنس پڑیں گی اور کہیں گی، ”یہ تم نے کیا الل ٹپ لکھ دیا ہے۔“ لیکن کرسٹینا سے اپنی چند ایک ملاقاتوں ہی میں مجھے کئی بار ان کے اندر ایک پرخلوص روح کی حرارت اور گداز نظر آیا۔ بظاہر سنجیدہ اور دوٹوک بات کہہ دینے والی لیکن دراصل خیال رکھنے والی، حساس اور ہمدرد۔

مجھے یاد ہے کرسٹینا سے میری پہلی ملاقات، ۲۰۰۸ میں، پروفیسر جمال ملک کے گھر میں ہوئی تھی۔ یہ ایفرٹ میں میری پہلی شام تھی اور ہم پروفیسر جمال اور ان کی خوش طبع بیگم بشریٰ ملک کے بہت نفاست سے سجے ہوئے گھر کے لکڑی کے ٹیرس پر بیٹھے تھے۔ یہ ٹیرس بھی بس ایک چھجا سا تھا جسے انھوں نے اپنی خوش ذوقی کا ایک اور ثبوت دینے کے لیے خود تعمیر کرایا تھا۔ پروفیسر جمال ملک ہر سال ایفرٹ یونیورسٹی میں اردو سیکھنے کے شوقین یورپی طالب علموں کے لیے دو تین ہفتے کے ایک مختصر کورس کا اہتمام کرتے تھے۔ کرسٹینا اور رامتہ المنان اسی کورس کے لیے ہائیڈل برگ سے آئے تھے اور میں پہلی بار پاکستان سے شریک ہوئی تھی۔ اس کورس کے دوران ہم نے تین ہفتے اکٹھے ایفرٹ یونی ورسٹی میں گزارے تھے۔ اکٹھے خریداری کی تھی، چائے اور کافی پی تھی، کھانے بنائے اور کھائے تھے اور خوب سیر و تفریح بھی کی تھی۔ اس کے بعد چند ایک بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھی کرسٹینا سے ملاقات ہوئی اور اب پھر میں دو ہفتے کے لیے ان کی مہمان تھی۔

کرسٹینا نے اسٹیشن سے ہی مجھے رعایتی نرخوں پر کئی ٹکٹ خرید دیے تھے تاکہ مجھے بس اور ٹرام کے سفر کے دوران مشکل نہ ہو۔ یونی ورسٹی پہنچ کر انھوں نے مجھے انسٹی ٹیوٹ کی آخری منزل پر واقع وہ مختصر سا سوئٹ دکھایا جس میں انھوں نے میری رہائش کا بندوبست کر رکھا تھا۔ کچن کی الماریوں میں ضروری سامان، اور کھانے کی میز پر تازہ پھولوں کا گل دستہ پہلے سے سجا ہوا تھا۔ یہ کرسٹینا کی محبت کا اظہار تھا۔ اگلے دو ہفتے اسی احساس کی معیت میں گزرنے والے تھے۔ ہائیڈل برگ یونی ورسٹی کے ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ میں یہ دن کئی حوالوں سے یادگار رہے۔

☆☆☆☆

گلزار حسنین

واہ رے اندلس

ہزاروں سال قبل بہت سے انسانوں کا عقیدہ تھا کہ سورج دیوتا دن کے ختم ہونے پر مر جاتا ہے اور اگلی صبح دوبارہ زندہ ہو کر نمودار ہوتا ہے۔ لوگ جن میں مصری بھی شامل تھے یہ سمجھتے تھے کہ رات کے وقت سورج دیوتا جسے وہ ''راع'' کہتے تھے۔ زمین کے نیچے بہتے دریائے ظلمات کے اندر سے سفر کرتا ہوا دوبارہ نمودار ہوتا ہے۔ جہاں اسے ہزاروں قسم کے عفریتوں اور بلاؤں سے واسطہ پڑتا ہے مگر وہ اپنی طاقت سے انھیں نیچا دیکھا کر دنیا میں طلوع ہوتا ہے۔ مصر میں پروہیت تمام مقبروں میں شام کو دعائیہ عبادت کرواتے کہ سورج سلامت رہے اور الصبح سورج کے سلامت رہنے پر شکرانے کی عبادت ہوتی۔ قرطبہ کی زمین پر میرے قدم پڑے اس وقت سورج دریائے ظلمات کے سفر پر روانہ ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ یا اپنی موت کو سامنے پا کر دہشت سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ بادل اس کے اردگرد تھے جن سے وہ چند لمحے قبل ہی باہر آیا تھا۔ بس کسی ٹرمینل کی بجائے قرطبہ کے مرکزی گیٹ کے ایک ہوٹل کے سامنے رکی تھی۔ ڈرائیور اتر کر بس سے مسافروں کا سامان باہر نکالنے لگا۔ فرانسیسی دو لڑکے اور تین لڑکیاں جو بس میں میرے قریب بیٹھے تھے۔ اترتے ساتھ ہی لپک کر قریب پڑے ایک بینچ پر بیٹھے اور پھر سگریٹ نکال کر پینے لگے۔ شاید ان کا نکوٹین لیول اتنا گر گیا تھا کہ اگر فوراً تمباکو نوشی نہ کرتے تو صحت جواب دے جاتی۔ وہ اتنے انہماک اور لگن سے سگریٹ پی رہے تھے جیسے ہمارے ہاں روزہ افطار ہوتے ساتھ اشیا خورد و نوش کی طرف ہم متوجہ ہوتے ہیں۔ اپنا بیگ وصول کرنے کے بعد اسے کندھے سے لٹکایا اور ٹھکانے کی تلاش میں اُسی سڑک کو جس کی ایک ذیلی سڑک پر بس رکی تھی عبور کر کے چلنا شروع کیا۔

سو گز اندازۃً چلنے کے بعد فٹ پاتھ کے ساتھ گھنے درختوں میں گھرا ہوا ایک خوشنما اسٹال نظر آیا۔ اس میں مختلف مشروبات۔ حلال و حرام دونوں اتنے سلیقے سے سجے ہوئے تھے کہ پیاس دامن گیر ہو گئی۔ اس اسٹال پر پہنچنے سے قبل میری نظر فصیل قرطبہ پر پڑی جوان درختوں کے عقب اور پیچھے سے نظر آرہی تھی۔ دیوار قرطبہ کا ایک قدیم دروازہ بھی سامنے تھا۔ مجھے یہ سوچ کر مسرت ہوئی کہ میں قرطبہ کی جانب روانہ ہوا وہ گیٹ لاہور کی قدیمی فصیل میں واقع بھاٹی گیٹ سے کچھ مشابہ تھا اگرچہ بھاٹی گیٹ سے چھوٹا تھا۔ دیوارِ قرطبہ پر چھوٹے چھوٹے برج بنے ہوئے تھے۔ گیٹ سے چند گز الٹے ہاتھ سیاہ رنگ کا ایک قد آدم مجسمہ آویزاں تھا جو اپنے

لباس سے کسی رومن کا معلوم پڑتا تھا اس مجسمے کے قریب ایک پلی تھی کیوں کہ فصیل کے ساتھ ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ اس پل کے ساتھ بنے چبوترے پر میں بیٹھ گیا۔ مجسمے کے خدوخال سے متانیت ٹپک رہی تھی۔ پیار کا پیغام اس کے چہرے پر تھا۔ یہ کسی رومن شہنشاہ کا نہیں ہوسکتا۔ میں نے سوچا۔ وہ مجسمہ اتنا پرسکون لگ رہا تھا جسے ان گھنے درختوں کے نیچے صدیوں سے کھڑا سو رہا ہو۔

ساتھ رکھے بیگ کو کھول کر میڈرڈ سے خریدی وہ کتاب نکالی جس پر قرطبہ کی سیاحت کے بارے میں معلومات درج تھیں اور قدیم حصہ شہر کے کوچہ و بازار کے چند نقشے بھی موجود تھے۔ جس جگہ میں بس سے اترا تھا وہ دریائے کبیر جسے وادی الکبیر کہتے ہیں سے دور نہ تھی۔ اس لیے نقشہ دیکھ کر وادی الکبیر کا تعین کر کے ساتھ دکھائی گئی فصیل اور ایک گیٹ کے ساتھ ایسا وہ بت کی نشاندہی سے معلوم ہوا کہ میں قرطبہ کے مشہور گیٹ ''باب المدور'' کے سامنے بیٹھا ہوں اور وہ مجسمہ روم کے بدنام زمانہ شہنشاہ نیرو کے انتہائی شفیق استاد ''سنیکا'' کا ہے جو قرطبہ میں پیدا ہوا تھا ''سنیکا'' کا شاگرد نیرو جب شہنشاہ روم ہوا تو کسی بات پر ناراض ہو کر اپنے نامور اور فلسفی استاد کو خودکشی کرنے کا حکم دیا چنانچہ حلیم طبع ''سنیکا'' نے زہر پیالہ لبوں سے لگا لیا تھا۔ ''باب المدور'' کے ساتھ ''ہوٹل البغداد'' کا چھوٹا سا بورڈ لگا تھا جس پر درج تھا کہ البغداد ہوٹل فقط سو گز کے فاصلے پر ہے۔ قرطبہ میں ہوٹل البغداد میں ٹھہرنے سے اچھا خیال کیا ہو سکتا تھا ''باب المدور'' سے گزر کر پتھر سے بنی تنگ سڑک پر تھوڑا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک دیوار پر چھوٹا بورڈ آویزاں تھا جس پر بنا تیر کا نشانہ سیدھے ہاتھ جانے والی گلی کے اندر ہوٹل البغداد کو ظاہر کر رہا تھا۔ طرز تعمیر مشرقی تھی۔ ہر گھر میں ڈیوڑھی موجود تھی۔ ایک گھر کے ڈیوڑھی سے بورڈ لٹک رہا تھا جس پر انگریزی اور عربی زبان میں ''ہوٹل البغداد'' درج تھا عمارت کی ڈیوڑھی کے اندر ہی بغل میں ہوٹل کا استقبالیہ بنا ہوا تھا اور ایک نوجوان لڑکا صوفے پر بیٹھا کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جب اسے میں نے بتایا کہ مجھے کمرہ چاہیے تو اٹھ کر کاؤنٹر کے پیچھے گیا اور کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا ''کمرہ کتنے دنوں کے لیے چاہیے۔''

''پہلے تم بتاؤ۔ یومیہ کرایہ کیا ہوگا''

اس نے کچھ توقف اختیار کیا میرا جائزہ لیا۔ شاید میرے مالی استعداد کا اندازہ لگا رہا تھا۔ کرایہ بتانے سے قبل پوچھا کہ میرا تعلق کس ملک سے ہے۔

''پاکستان'' میں مختصراً کہا۔

اس نے جواباً خوش دلی سے کہا ''بہت اچھا''

''تم سے میں پندرہ سو پسیٹو لوں گا''

''نہیں! چودہ سو پسیٹو''

''ٹھیک ہے تم چودہ سو پسیٹو ہی دے دینا۔ لیکن کتنے دن قرطبہ ٹھہرو گے''

''فقط دو دن''

میں نے اپنا پاسپورٹ اسے دکھایا۔ ہوٹل کارڈ بھر کر واپس کیا۔ دو ہزار پیسیو ادا کیے۔ اس نے چابی نکالی اور مجھے کمرہ دکھانے چل پڑا۔

''تمہارا نام کیا ہے''

''طارق''

کیا تم مسلمان ہو؟

''الحمداللہ''

''اور تم''؟

''الحمداللہ میں بھی مسلمان ہوں''

''کیا تم قرطبہ کے ہی رہائشی ہو'' میں نے غلام گردش میں چلتے ہوئے طارق سے پوچھا۔

''میں اردن کا باشندہ ہوں اور عمان یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہوں۔ یہ ہوٹل میرے چچا نے ایک کرائے کی جگہ پر بنا رکھا ہے۔ میں دو ماہ کی چھٹی پر اسپین آیا ہوں اور یہی ہوٹل میں رہ کر چچا کا ہاتھ بٹا رہا ہوں۔''

بڑی خوشی ہوئی تمھیں مل کر میں تھوڑا آرام کرلوں پھر تم سے باتیں ہونگی۔

کمرے میں دو بیڈ پڑے تھے ایک طرف چھوٹا سا سنگھار میز اور ایک کرسی۔ فرش پر لگی خوبصورت کئی ٹائلز عمر رسیدگی کے سبب بندھن سے آزاد ہو چکی تھیں۔ ان پر چلتے ہوئے عجیب احساس ہوتا۔ ان کا سیمنٹ شاید اکھڑ چکا تھا۔ کمرے میں موجود کھڑکی شیشے یا جالی کی بجائے لکڑی کی تھی۔ اسے کھولا تو خوشگوار ہوا کا جھونکا آیا۔ باہر لوہے کی گول سلاخیں لگی تھیں جیسے دیہاتی گھروں میں لکڑی کی کھڑکیوں میں لگی ہوتی ہیں۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے رہائشی علاقے کے درمیان ایک بلند چوکور مینار نظر آ رہا تھا۔ مینار کی آخری منزل پر گھنٹا لٹک رہا تھا اور اوپر گنبد پر ایک فرشتے کا مجسمہ پر سمیٹے ایستادہ تھا۔ کسی گرجے کا مینار ہوگا'' میں نے کھڑکی کے سامنے سے ہٹتے ہوئے سوچا۔

بیڈ پر لیٹ کر کمبل اوڑھ لیا کیوں کہ کافی خنکی تھی۔ ٹھنڈ کے باوجود کھڑکی میں نے بند نہ کی۔ میری خواہش تھی قرطبہ کی فضا کا نظارہ کرسکوں چاہے بادل ہی نظر آتے رہیں اور میرے زیادہ سے زیادہ اس شہر کی تازہ ہوا اپنے اندر سمولیں۔ وہ شہر جو کبھی یورپ میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ اس کی صبحوں میں بے نظیر تازگی ہوتی تھی۔ اس کی دوپہر لوگوں کی زندگی کی جد وجہد میں مصروفِ عمل دیکھتی شام میں وہ سحر تھا کہ جو یہاں آیا یہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ یہاں کی راتیں سرور و شادمانی سے عبارت تھیں۔ آج ایسا کچھ نہیں۔ ہر شے بدل گئی۔ میں سوچتا رہا اور شام قرطبہ کے سحر نے مجھے نیند کی آغوش میں دے دیا شاید اب اس سحر کی رسائی نیند سے آگے کہیں نہیں۔

بلند مینار پر لگے گھنٹے کے بجنے سے میں بیدار ہوا کھلی کھڑکی سے گھنٹے کی آواز لرزتی ہوئی اندر آ رہی تھی۔

میں پلنگ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ہمسایہ گھر میں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ رات کی تاریکی میں اس روشنی میں ہلکی بارش کے قطرے موتیوں کی طرح گرتے نظر آ رہے تھے۔ فاتح اندلس طارق بن زیاد ہسپانوی بادشاہ ریڈرک کو شکست دینے کے بعد شہروں کو فتح کرتا جب طلیطلہ کی جانب روانہ ہوا تھا تو اس نے مغیث الرومی کی قیادت میں سات سو سواروں کا ایک دستہ قرطبہ کو فتح کرنے روانہ کیا۔ اگست 711ء کی ایک ایسی ہی رات تھی۔ جب وہ سوار دریائے کبیر کے کنارے ترائی کی جھاڑیوں میں گھوڑوں سے اترے۔ شام سے ہی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ وہ گھوڑے باندھ کر دم لینے کو اپنی عبائیں سروں پر تان کر درختوں سے ٹیک لگائے بیٹھ گئے۔ چند جانباز سپاہی شہر کے حالات معلوم کرنے روانہ کیے گئے واپسی پر وہ ایک چرواہے کو پکڑ کر ساتھ لائے جو شاید قرطبہ سے ملحقہ کسی دیہات میں رہتا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شہر کے اکثر باشندے فرار ہو چکے ہیں اور حاکم شہر کے پاس زیادہ بڑی فوج نہیں۔ اسی نے اطلاع دی کہ فصیل قرطبہ بہت مضبوط اور بلند ہے اور لڑ کر شہر میں داخل ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ کچھ دیر کی پوچھ گچھ اور لالچ دینے پر اس چرواہے نے جو ہیں گردونواح میں اپنا ریوڑ چرایا کرتا تھا نے بتایا کہ فصیل کی ایک جگہ نسبتاً کم بلند ہے اور اس کے بالکل ساتھ اُگے انجیر کے درخت کی شاخیں فصیل قرطبہ کے اوپر تک پھیلی ہوئی ہیں۔

مغیث الرومی اپنے سواروں کے ہمراہ رات کی تاریکی میں دریائے کبیر کو عبور کرتا اسی چرواہے کو ساتھ لیے قرطبہ کی طرف روانہ ہوا۔ فصیل اور دریا کا فاصلہ تقریباً تیس گز تھا بارش سے زمین گیلی ہو چکی تھی جس کے سبب گھوڑوں کی ناپوں کی آواز بلند نہ ہوئی۔ ایک نوجوان سپاہی انجیر کے درخت سے لپٹا شاخوں سے دیوار پر کود گیا اور پھر اپنی پگڑی کی کمند بنا کر اس نے ایک اور کو اوپر کھینچ لیا۔ اسی طرح کافی مسلمان اوپر پہنچ کر اسی طریقے سے فصیل سے پار قرطبہ میں داخل ہو گئے۔

وہ چھپتے ہوئے قرطبہ کے گیٹ کے نزدیک پہنچے اور بے خبر محافظوں کو تہ تیغ کر کے گیٹ کھول دیا۔ مغیث اپنے سوار کو لیے منتظر کھڑا تھا۔ اسلامی لشکر یلغار کرتا اندر داخل ہوا۔ شہر سنسان پڑا تھا۔ حاکم شہر کلیسانیٹ جارج میں چار سو سپاہیوں کے ساتھ محصور ہو گیا۔ تین ماہ کے محاصرے کے بعد کلیسا کے باہر بے شمار ایندھن جمع کر کے آگ جلائی گئی جس سے مجبور ہو کر مسیحی جنگجوؤں نے ہتھیار ڈال دیے کئی روایتوں میں ہے کہ ہتھیار ڈالنے کی بجائے سب لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اس طرح ہسپانیہ کا وہ شہر جس نے تاریخ میں نامور ہونا تھا مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ قرطبہ میں اسلامی تمدن اور معاشرت نے جو ترقی کی اس کی چکا چوند سے یورپ جو صدیوں سے تاریکی مین ڈوبا ہوا تھا ہڑبڑا کر بیدار ہوا اور بدحواس بیل کی مانند اسی علاقہ پر چڑھ دوڑا جس نے اسے شعور بخشا تھا۔

‘‘البغداد ہوٹل’’ دومنزلہ مکان میں بنا ہوا تھا اور رہائشی کمروں کی تعداد شاید دس سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اسپین میں آج بھی جس علاقے میں مسلمانوں کی حکومت بارھویں صدی تک موجود تھی اسے ‘‘اندلسیہ’’ کہتے

ہیں جس میں قرطبہ، غرناطہ، اشبلیہ ، مالگا، مرسیہ اور اطریہ وغیرہ کا علاقہ شامل ہے ۔ یہاں دیہاتی علاقے اور شہروں کے قدیم حصوں میں آج بھی رہائشی مکانات اسی طرز پر بنائے جاتے ہیں جیسے صدیوں قبل مسلمان بنایا کرتے تھے ۔ یہ ہوٹل بھی ایسے ہی ایک خوبصورت گھر میں بنا ہوا تھا ۔ ڈیوڑھی کی بغل میں مردمہمانوں کے لیے کمرہ ہوتا تھا ۔ اور آج بھی اس مکان میں ایسے ہی کمرے میں ہوٹل کا دفتر اور استقبالیہ واقع تھا ۔ عمارت میں تین طرف کمرے واقع تھے اور ایک سمت ہمسایوں کی دیوار کے ساتھ کوئی کمرہ نہ بنایا گیا تھا ۔ درمیان میں تقریباً چھ سات مرلے کا دلان تھا ۔ جس کے درمیان میں فوارہ موجود تھا اور چاروں طرف سرسبز بیلیں اور خوشنما پودے اور خوش رنگ پھول تھے ۔

جیسے ہمارے ملک میں لان گھر کے سامنے ہوتا ہے یا دیہاتوں میں صحن رہائشی حصہ کے آگے واقع ہوتا ہے ہسپانیہ میں پرانی طرز پر بنے گھروں میں صحن لان یا دالان چاروں طرف سے عمارت کے گھیرے میں ہوتا ہے ۔ اور داخلے کا راستہ مرکزی دروازے یا ڈیوڑھی سے ہوتا ہے اور اکثر گھروں میں رہائشی کمروں کے سامنے برآمدہ ہے ۔ کئی گھروں میں کمرے آمنے سامنے بنے ہوتے ہیں درمیان میں پودوں سے بھرا دالان اور بغل والی دیواریں اونچی بنی ہوتی ہیں ۔

اپنے کمرے سے باہر آ کر میں کچھ دیر برآمدے کی ریلنگ کے قریب کھڑا ہو کر نیچے دالان میں بارش میں بھیگتے پودوں اور پھولوں کو تکتا رہا اور پھر نیچے چلا آیا ۔ ہوٹل کا دفتر خالی تھا ۔ طارق شاید کہیں گیا ہوا تھا ۔ میں باہر گلی میں نکل آیا ہلکی بارش برس رہی تھی ۔ بیشتر گھروں پر سفیدی کی ہوئی تھی کئی پتھر کے بلاکوں سے بنے تھے اور کائی زدہ تھے ۔ میں گلی میں کئی سوگز چلتا گیا ۔ کسی کسی گھر کے باہر بلب روشن تھا لیکن تاثر نیم تاریکی کا تھا ۔ جب واپس ہوٹل کے گیٹ کے سامنے آیا تو طارق دفتر کے اندر بیٹھا نظر آیا ۔

''کافی دنوں کے بعد قرطبہ میں بارش ہوئی ہے ۔''

اس نے علیک سلیک کے بعد موسم پر تبصرہ کیا ۔

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد میں نے اس سے قرطبہ کی رات کے متعلق سوال کیا ۔ یورپ کے اکثر شہروں کی راتوں میں ہونے والی سرگرمیوں کو سیاحوں کے لیے لکھی گئی گائیڈز میں بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے ۔

''قرطبہ کی رات بہت خوشگوار ہوتی ہے ۔ چاندنی رات میں دریائے کبیر کے پل پر کھڑے ہو کر شہر کی طرف دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کسی الف لیلوی قصے کا کردار بنے طلسماتی شہر میں ہوں ۔ لیکن آج بادلوں اور بارش کے سبب ایسا ماحول نہ ہوگا ۔''

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا مجھے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر شرارت سے بولا ''قرطبہ اب ایک قصبہ ہے بڑے شہروں والی اس میں کوئی بات نہیں ۔ اس لیے قرطبہ میں رات کے وقت بیڈروم بہترین جگہ ہے ۔''

اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''کیا قرطبہ میں رات کو کھانا ملتا ہے یا اس کی بجائے بھی تم مجھے سونے کا مشورہ دو گے۔''

''کھانا تمھیں ضرور ملے گا مل کہ اگر تم کسی ڈسکوتھیک یا نائٹ کلب جانا چاہتے ہو تو وہ بھی زیادہ دور نہیں میں تو فقط یہ کہہ رہا تھا کہ تم لندن، پیرس اور میڈرڈ سے ہو کر آ رہے ہو تمھیں یہاں کے کلب شاید پسند نہ آئیں۔''

''میں کسی نائیٹ کلب جانا نہیں چاہتا۔ پوچھنے کا مقصد یہاں کی معاشرتی زندگی کے متعلق جاننا ہے۔ اب امید ہے تم مجھے کسی نزدیکی اور اچھے ریسٹورنٹ کا پتہ بتاؤ گے۔''

''کئی اچھے ریسٹورنٹ ساتھ واقع ''یہودی محلے'' میں ہیں اور وہ جگہ یہاں سے 50 گز سے زیادہ دور نہیں۔ لیکن کھانے کے لیے برائے مہربانی حلال کیے ہوئے مرغ وغیرہ کی خواہش نہ کرنا۔'' وہ کچھ دیر ہنستا رہا پھر گویا ہوا۔

''پچھلے مہینے ایک پاکستانی اور اس کی بیوی ہمارے مہمان تھے اس نے مجھ سے ریسٹورنٹ کا پوچھا۔ میں فارغ بیٹھا تھا اس لیے اس کے ساتھ چلا گیا۔ اس نے داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ کھانے کے لیے اس نے آدھا مرغ منگوایا۔ جب کھانے لگا تو مجھ سے پوچھا کہ آیا مرغ حلال کیا ہوا ہے۔ میں نے کہا۔ یہاں حلال مرغ نہیں مل سکتا۔ یہیں اگر حلال کھانے کا خیال رکھنا ہے تو فقط آلو وغیرہ ہی اس معیار پر پورے اتریں گے۔ اب تم پہلے سوچ لو کہ مرغ کھانا ہے یا آلو۔''

''باب المدور'' سے جو سڑک اندرون شہر قرطبہ آتی ہے اس کے الٹے ہاتھ ''یہودی محلّہ'' ہے۔ جو کافی وسیع علاقے پر پھیلا ہوا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بابل کی مشہور اور طاقتور بادشاہ بخت نصر نے سینکڑوں سال قبل مسیح میں جب یروشلم میں قائم یہودی سلطنت کو برباد کیا اور ہزاروں قیدی پکڑ کر بابل لے گیا تھا تب بے شمار بنی اسرائیل بے وطن ہو کر مختلف شہروں میں پناہ گزین ہوئے ایسے میں بڑی تعداد میں یہ لوگ آئی بیریا (اندلس) میں آباد ہوئے۔ اپنی محنت اور لگن کی بدولت جلد وہ یہودی لوگ آئی بیریا کے مختلف شہروں میں آباد ہو کر مالدار بھی ہو گئے۔ عیسائی اکثریت میں جذبہ حسد ابھرا۔ مذہبی رواداری نے دم توڑا اور حکمرانوں نے انھیں لوٹنا شروع کیا پھر حکم ہوا کہ انہیں جبراً عیسائی کیا جائے۔ مسلمانوں کے فتح اندلس سے کئی سال قبل وہ بغاوت پر اتر آئے اور بے رحمی سے ہلاکت کا نشانہ بنے۔

مسلمانوں کے آئی بیریا فتح کرنے کو انھوں نے امداد غیبی سمجھا یہودی سالوں سے اپنی عبادت گاہوں میں کسی نجات دہندہ کے لیے دعا گو تھے۔ انھوں نے عربوں کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا۔ جواباً مسلمانوں نے انتہائی رواداری کا سلوک کیا۔ بڑی تعداد میں یہودیوں کو اندلس کے شہروں میں آباد ہونے کا کہا گیا اور وہ لوگ دیہاتی علاقے سے بڑے شہروں میں آ گئے۔ صدیوں انھوں نے مسلمانوں سے اپنا تعاون جاری رکھا۔ عرب

اور بربر کیوں کہ قلیل تعداد میں تھے اس لیے ستم رسیدہ بنی اسرائیل کے تعاون نے مسلمانوں کو قبضہ مستحکم کرنے میں آسانی پیدا کی۔

اندلس مسلمانوں کے ہاتھ سے صدیوں بعد جب نکلا تھا تو مسلمانوں کے ساتھ یہودی بھی جبراً عیسائی کیے اور لاکھوں کو جلاوطن کیا گیا۔ آج اس حصہ شہر میں شاید بہت ہی کم یہودی آباد ہوں۔ ہلکی بارش ابھی تک برس رہی تھی لیکن بارش کے قطرے اتنے چھوٹے تھے کہ محسوس ہوتا تھا جیسے آپ کسی فوارے کے پاس سے گزر رہے ہوں اور اس کی ہلکی پھوار پڑ رہی ہو۔ بلبوں کی روشنی سے سیاہی مائل بھورے پتھر جو گلی میں لگے تھے بارش میں بھیگے چمک رہے تھے۔ ایک جگہ تین ریسٹورنٹ ایک دوسرے کے نزدیک واقع تھے۔ گاہکوں کے قہقہے اور ہلکی موسیقی کی آواز باہر سنائی دے رہی تھی۔ جس ریسٹورنٹ سے مشرقی موسیقی کی آواز آ رہی تھی میں اس میں داخل ہو گیا۔ شاید وہ ہسپانوی موسیقی ہی ہو لیکن اس میں غالب آواز دف اور نفیری کی تھی اس لیے میں اسے عرب موسیقی سمجھ کر لطف لیتا رہا۔ ریسٹورنٹ میں اکثریت سیاحوں کی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر گھڑی دیکھی رات کے دس بجنے والے تھے۔ لیکن ہلکی پھوار کے سبب گلیاں سنسان تھیں۔ جب میں ریسٹورنٹ سے نکل کر "باب المدور" کے نیچے پہنچا ہلکی پھوار بھی ختم ہو چکی تھی۔ سنیکا کے مجسمے کے ساتھ کھمبے پر لگے طاقتور مرکری بلب کی روشنی دور تک پھیلی تھی۔ فضا میں بھینی بھینی مہک تھی۔ شاید گھنے درختوں کے بارش میں بھیگنے کے سبب ہو۔ بادل ہلکے ہو رہے تھے جس کے سبب چاند نظر آتا پر لمحوں کے لیے چھپ جاتا کبھی ایسے لگتا جیسے وہ تیز چلتا ہوا کسی انجان منزل کی طرف جا رہا ہے۔

جیکٹ کی جیب سے میں نے معلوماتی کتاب نکالی۔ اور "باب المدو" کے قریب تاریخی مقامات کے تعین کے لیے نقشہ تلاش کیا۔ اگر میں اُس جگہ سے فصیل کے ساتھ ساتھ الٹے ہاتھ اس چھوٹی سی نہر کے بہاؤ کے ساتھ جو فصیل کی بیرونی طرف وادی الکبیر کی سمت بہہ رہی تھی چلنا شروع کروں تو کچھ فاصلے پر ابن رُشد کا مجسمہ نظر آئے گا۔ تقریباً چار فرلانگ دور دسویں صدی میں تعمیر کیے جانے والا گیٹ باب الاشبلیہ آئے گا جس کے تقریباً سامنے قرطبہ کے نامور فرزند مشہور عالم عربی دانشور ابنِ حزم کا مجسمہ ہوگا۔ اس سے آگے القعر کا وسیع سبزرار فصیل کی اندرونی جانب ہے کچھ چلنے کے بعد الٹے ہاتھ سڑک چند فرلانگ کے بعد دریا الکبیر وہ مشہور زمانہ پل ہوگا جس کے بالکل سامنے اندازہ دو سو گز کے فاصلے پر جامعہ مسجد قرطبہ کی عمارت موجود ہوگی۔

کتابچہ واپس جیکٹ کی جیب میں رکھا اور باب المدور کے ساتھ واقع چند پتھریلی سیڑھیاں اتر کر اس نہر کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کچھ فاصلے سے گزرتی مرکزی سڑک پر ٹریفک کی روانی کا شور فصیل سے ٹکرا رہا تھا۔ نہر کے ساتھ کھمبوں پر لگی روشنیوں کے سبب شفاف پانی جھلملا رہا تھا۔ ان رشد کا سفید پتھر سے بنا انتہائی خوبصورت مجسمہ دیوار قرطبہ اور چھوٹی نہر کے درمیان تھا۔ میرے اور مجسمے کے درمیان نہر حائل تھی۔ ایک خوبصورت تقریباً چار فٹ بلند چبوترے پر ابن رشد کا مجسمہ تھا اسے کسی اسٹول پر بیٹھا دکھایا ہوا تھا۔ الٹے ہاتھ

میں ایک کتاب گھٹنے پر کھڑی حالت میں رکھی ہوئی اور سیدھا ہاتھ کولھے پر ٹکائے۔ بھاری پگڑی اور کھلے بازوں والی عبا پہنے ہوئے عبا کے نیچے ٹخنوں تک آیا ہوا چولا پہنا ہوا تھا۔

قاضی ابوالولید محمد بن احمد بن محمد ابن رشد 1126ء کو قرطبہ میں پیدا ہوا۔ اسے بجا طور پر عرب اور اسلامی دنیا کا سب سے بڑا فلسفی کہا جاتا ہے اور حریت فکر کا سالار مانا جاتا ہے۔ وہ قرطبہ کا قاضی بھی رہا۔ ابنِ رشد بچپن سے علمی مشاغل میں مصروف رہا اس کے مطالعے کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنی عمر میں دو راتوں کے علاوہ کبھی مطالعہ ترک نہیں کیا تھا ایک اس کی شادی کی رات اور دوسری رات جب اس کے والد کا انتقال ہوا۔ مشہور محقق ''ریناں'' نے ابنِ رشد کی فلسفہ طب فقہ اور علم الکلام پر اٹھتر کتب و رسائل کا ذکر کیا ہے۔ اندلس نے ابن رشد کے علاوہ شیخ محی الدین ابن العربی ابن حزم۔ ابن جبیر ابن زہر ابن بیطار ابن ماجہ ابن طفیل جیسے مایہ ناز فرزند اپنے سینے پر پالے جس کا نام علمی اور ادبی حوالے سے ہمیشہ انسانی تہذیب کی تاریخ میں روشن اور سرخرو رہے گا۔

ابن رشد کو ارسطو کے سب سے بڑے شارح ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ کیوں کہ دوسرے مسلمان علماء کی طرح یونانی زبان سے نا آشنا تھا اس لیے ارسطو کی تعلیمات اور فلسفے کی سمجھنے کے لیے جن عربی کتب سے استفادہ کیا ان کا یونانی زبان سے ترجمہ تقریباً اس کے وقت سے تین سو سال قبل شام کے مسیحی مترجمین حسنین بن اسحاق۔ اسحاق بن حسین اور یحییٰ بن عدی نے کیا تھا۔ ابن رشد ارسطو کو مرشد کی طرح جانتا تھا اس کا قول تھا کہ ''ارسطو یونان کا دانا ترین شخص ہے جس نے منطق طبعیات و مابعد طبعیات کو ایجاد کیا اور ختم بھی کر دیا۔ ایجاد کرنا اس لیے کہتا ہوں کہ اس کی تصنیف سے پہلے جس قدر کتب ان مضامین پر لکھی گئی تھیں وہ اس قابل نہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے اور اس کی تحریروں کے سامنے خاک ہو گئیں۔ ختم کرنا اس واسطے کہتا ہوں کہ اس کے زمانے سے ہمارے زمانے تک یعنی پندرہ سو برس میں ایک بھی کتاب ایسی نہیں لکھی گئی جو اس کی تصانیف پر اضافہ کہی جا سکے۔ اور نہ اس کی تصانیف میں ایک بھی ایسی غلطی معلوم ہوئی جسے کچھ اہمیت دی جا سکے۔ یہ بات کہ ایک ہی شخص کی ذات میں یہ تمام صفات جمع نظر آتی ہیں بے شک بہت عجیب و حیرت انگیز ہے۔ جس شخص کو یہ نعمتیں بخشی گئی ہوں اسے انسان کی بجائے دیوتا کہا جائے تو بجا ہے۔''

ابن رشد نے جب دنیا میں آنکھیں کھولیں یوسف بن تاشفین کے خاندان اطرابطین کی حکومت اندلس سے اٹھنے والی تھی اور ''موحدین'' افریقہ اور اندلس پر قبضہ کرنے کے لیے پر تول چکے تھے۔ موحدی خاندان کا طاقتور حکمران یعقوب المنصور باللہ۔ ابن رشد کا بڑا قدر دان تھا۔ اس کا باپ بھی ابن رشد کا مداح تھا لیکن یعقوب کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ابن رشد کے مرتبہ اور مقام میں بہت اضافہ ہوا اور شہنشاہ نے اسے اپنا مقرب بنا لیا۔ دونوں میں اتنی بے تکلفی تھی کہ ابن رشد یعقوب المنصور باللہ کو ''ارے بھائی سن'' کہہ کر مخاطب ہوتا۔ یعقوب المنصور بہت مغرور اور بد دماغ بھی تھا۔ جب صلاح الدین ایوبی کا سفیر یعقوب کے دربار میں

اس درخواست کے ساتھ حاضر ہوا کہ اندلس طاقتور حکمران کے زیر حکومت ہے اور بیشتر مسیحی لشکر صلیبی جنگوں میں حصہ لینے اندلس کے ساحلوں کے نزدیک سے گزرتے ہیں۔ ایوبی نے درخواست کی تھی کہ یعقوب المنصور انہیں گزرنے نہ دے اور ان پر حملے کیے جائیں تاکہ متحدہ مسیحی حملوں کے اثر کو یروشیلم پر کم کیا جا سکے۔ صلاح الدین ایوبی کی درخواست نہ صرف نامنظور کی گئی بلکہ یعقوب المنصور اس بات پر بھی بہت ناراض ہوا کہ ایوبی نے اسے ’’امیر المومنین‘‘ لکھ کر مخاطب کیوں نہیں کیا اور درباری آداب کے برخلاف ایوبی کو کوئی تحفہ بھی نہیں بھیجا تھا۔

یعقوب المنصور جو کئی مسیحی افواج کو پے در پے شکستیں دے کر اور مغرور ہو چکا تھا ایک دن ابن رشد سے ناراض ہو گیا اور اسے لوسینہ جو اس کا آبائی قصبہ تھا جلاوطن کر دیا۔ ابن رشد کی کوئی کتاب پڑھنا جرم قرار پایا۔ اسے ملحد اور کافر قرار دیا گیا۔ ایک دن ابن رشد اور اس کا بیٹا جب نماز پڑھنے مسجد قرطبہ میں گئے تو انہیں ’’ملحد‘‘ کہتے ہوئے لوگوں نے حملہ کر کے زدوکوب کیا۔ اشبیلیہ کی معتبر جماعت کے سمجھانے پر المنصور نے ابن رشد کو معاف کر دیا مگر ایک سال کے عرصے میں آسمان فلسفہ و ذہانت کا وہ آفتاب غروب ہو گیا۔ وہ دن 10 دسمبر 1198ء کا تھا۔

باب الشبیلیہ کے تقریباً سامنے ابن حزم کا مجسمہ ایستادہ ہے سیاہی مائل بھورے رنگ کا۔ جس کفر و فر سے عبا و قبا پہنے ابن حزم کھڑا تھا اور جو رعب داب چہرے سے تاثرات سے عیاں تھا وہ عالم سے زیادہ کسی حکمران یا عہدہ دار سلطنت والا تھا۔ ابن حزم قرطبہ میں پیدا ہوا سال پیدائش 994 تھا۔ وہ زمانہ اسلامی اندلس کے عروج کا زمانہ تھا طاقتور ترین وزیر اعظم حاجب محمد ابو عامر المنصور کی مکمل گرفت میں نظام حکومت تھا۔ قرطبہ سے جو لشکر روانہ ہوتا تھا وہ فاتحانہ یلغار کرتا دور دراز مسیحی حکومتوں کو الٹ پلٹ کر مال غنیمت سے لدا واپس آتا۔ ابن حزم نے جوانی ہی میں المنصور کی موت کے بعد خانہ جنگیوں اور اموی حکومت کو ختم ہوتے دیکھا۔ پھر ملوک الطائف کا دور آ گیا۔ ابن حزم نے زندگی میں عروج بھی بہت دیکھا منصب وزارت حاصل کیا کئی بار قید و بند سے گزرا۔ حتیٰ کہ سیاست اور درباری زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر کے علم و ادب کے میدان میں اتر آیا۔ یہاں بھی کمال کو پہنچا۔

اس کے بیٹے کا بیان تھا کہ باپ کے ساتھ کی لکھی ہوئی چار سو مجلدات اس کے پاس تھیں۔ تفسیر۔ حدیث کلام فلسفہ تاریخ اور تقابل ادیان میں اسے عبور حاصل تھا۔ اگرچہ ابن حزم کا مجسمہ بھی فصیل قریب تھا مگر وہاں ایک پل بنا ہوا تھا۔ اس لیے میں مجسمے کے چبوترے کے قریب جا کر پھولوں کی ایک چند فٹ بلند پختہ کیاری کے شفاف پتھروں پر بیٹھ گیا۔ ’’باب اشبیلیہ‘‘ پر روشنیوں کا دھارا پڑ رہا تھا۔ اس گیٹ سے قرطبہ میں داخل ہونا اب ممکن نہیں۔ دو محرابیں وہاں بنی ہوئی ہیں۔ یعنی بڑے گیٹ کی بجائے باب الشبلیہ دو ایسے دروازوں پر مشتمل تھا جو بلند محراب کی شکل کے تھے۔

قرطبہ کی مرکزی سڑک باب اشبلیہ سے اندازہ چالیس گز کے فاصلے سے گزرتی ہے۔ ٹریفک میں کچھ کمی ہونا شروع ہوگئی تھی۔ لیکن پیدل چلنے والوں کی تعداد بڑھ گئی تھی جن میں اکثریت سیاحوں کی تھی۔

ابن حزم کے بارعب چہرے کو دیکھتے ہوئے خیال گزرا کہ تینوں مجسمے جو دیوار قرطبہ کے سائے میں موجود ہیں۔ اور جن کے بارے میں لکھا تھا ''قرطبہ کے قابل فخر فرزند'' وہ مجسمے عیسائیوں نے بنوائے ہیں حالانکہ ان تینوں مین کوئی مسیحی نہ تھا۔ یہ وکا اتالیق ''سنیکا'' رومن مذہب رکھتا تھا جواپالو اور زیوس کے پجاری تھے۔ ابن رشد اور ابن حزم مسلمان تھے۔ اندلس سے اسلامی حکومت اٹھ جانے کے بعد اٹھ سو سالہ اسلامی تاریخی ورثے کے نشانات انتہائی بے دردی سے مٹائے گئے محل اور لائبریریاں۔ حمام مسمار کیے گئے۔ مسجد کو ڈھا کرا سے ملبے سے گرجے بنائے گئے لیکن دوسری طرف مسلمان علماء کے مجسمے بنوا کر ایستادہ کیے اس سے بڑھ کر قلم کی تلوار پر فتح کا کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔

☆☆☆☆

افضل احسن رندھاوا

ترجمہ: سلیم شہزاد

بیوہ

سلکھن سنگھ نے لگا میں ران کے نیچے دبا کر صافہ باندھا اور گھوڑا موڑ کر مجھے آنکھ ماری۔ میں نے اسے اشارہ کیا تو اس نے گھوڑے کو ایڑھ لگا دی۔ سلکھن سنگھ کا گھوڑا چوک والے برگد سے لے کر دور گاؤں کے باہر تک دھول کا بادل اڑاتا آگے نکل گیا۔

میں دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ بھابھی کی نظر نہ پڑے۔ بھائی کا ڈر نہیں تھا۔ وہ شہر گیا ہوا تھا اور آج اس کے آنے کی امید بھی نہیں تھی۔ مگر بھابھی نے لحاظ کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اگر شام کے اس وقت بھابھی مجھے اور سلکھن سنگھ کو اکٹھے گاؤں سے نکلتے دیکھ لیتی تو پھر میری شامت آجاتی اور ساتھ ہی سلکھن سنگھ کی سات پشتوں کو بھی کوستی۔ بات کوئی ہو یا نہ ہو بھابھی بھائی کو ایک کی سات لگا کر اس طرح قصہ سناتی تھی کہ وہ لاٹھی پکڑ کر مجھے ڈھونڈنے نکل پڑتا۔ سلکھن سنگھ کا تو نام سنتے ہی بھابھی کے تیوریاں چڑھ جاتی تھیں اور وہ اپنے کام بھول کر اس کو صلواتیں سنانا شروع کر دیتی۔ اور اگر میں کبھی بھابھی کو روکتا تو وہ لال لال آنکھیں نکال کر کہتی۔ ’’سلکھن سنگھ کسی کتے کی موت مرے تو لوگوں کی جان چھوٹے۔‘‘

’’کیا سلکھن نے لوگوں کی جان پکڑی ہے! بھابھی؟‘‘ اور بھابھی یہ سن کر آپے سے باہر ہو جاتی۔

’’تم موئے سلکھن کے ساتھ پھر پھر کر بگڑ گئے ہو۔ آج آ لینے دے تیرے بھائی کو میں یہ فیصلہ کروا کر چھوڑوں گی۔ ہم عزت دار ہیں۔ ہمارا اُس کمینے بدمعاش کا کیا جوڑ__‘‘ اور بھابھی غصے سے چپ ہو جاتی مگر جب بھائی گھر آتا تو بھابھی رونے لگتی۔

’’میں نے آپ کو کتنی بار کہا ہے مگر آپ پر اثر نہیں ہوتا۔ اپنے اس لاڈلے کی لگا میں کھینچ کر رکھو۔‘‘

’’اوہو، ہوا کیا ہے؟‘‘ بھائی ہنستے ہوئے کہتا۔ ’’کس لاڈلے کی بات کر رہی ہو؟‘‘

’’واہ اب اتنے بھی بھولے نہ بنو۔ میں اپنے رتو کی بات کر رہی ہوں آج یہ پھر اس بے شرم کے ساتھ گھوم رہا تھا__‘‘

’’اوہو، اپنا رتو کوئی لڑکی تو نہیں۔ سیانا بیانا جوان ہے۔ کوئی بچہ تو نہیں جو ہر وقت اسے سمجھاتے ہی رہیں __ چھوڑو ان باتوں کو مجھے لسی کا کٹورا دو۔‘‘ بھائی آخر بات ختم کر دیتا۔

''اچھا اچھا۔'' بھابھی غصے میں کہتی۔ ''تمھیں تب پتا چلے گا جب کوئی چاند چڑھے گا___ سلکھنے بے غیرت نے تو پتا نہیں کتنوں کو برباد کیا ہے___ مگر ہمیں کیا اس گھر میں ہماری سنتا ہی کون ہے!''

''اوئے رتن سنگھا!'' بھائی آواز دیتا۔

''جی بھائی۔'' میں اندر سے باہر آ کر اس کے پاس کھڑا ہو جاتا تو وہ ہنس کر بس اتنا ہی کہتا۔ ''اوئے رتو، تیری بھابھی تیری شکایت لگا رہی تھی۔''

''کس بات پر؟''

''اوئے چھوڑ بات کو۔ جا حویلی جا کر گھوڑوں کو چارہ وارہ ڈال۔''

ہمارے گھر میں یہ روز کا معمول تھا چاہے میں سلکھن سے ملوں یا نہ روز اتنی بات تو ضرور ہو جاتی تھی۔

سلکھن اتنا بھی برا نہیں تھا۔ مجھ سے چار پانچ سال بڑا اور بھائی کا ہم عمر تھا۔ کچھ ڈیل ڈول سے تگڑا تو کچھ دل کا مضبوط اور شکل صورت کا بھی برا نہیں تھا۔ دیکھنے میں اچھا بھلا خوبصورت جوان تھا۔ شروع شروع میں دو چار چوریاں کر بیٹھا تو حوصلہ بڑھ گیا اور ڈکیتیاں کرنے لگا۔ اک دو قتل کر کے سات آٹھ سال قید ہوا اور بری ہو کر گھر آیا تو ہر طرف سلکھن سنگھ سلکھن سنگھ ہونے لگی۔ ہر سورما اور جوان سلکھن سنگھ کے راستے سے بھی گذرنے سے پہلے اک بار ضرور ڈول جاتا تھا۔ مگر یہ کوئی برائی نہیں تھی۔ یہ باتیں تو گاؤں کا ہر جوان، جو اپنے آپ کو دلیر سمجھتا تھا، کرتا تھا۔ البتہ سلکھن سنگھ میں ایک اور برائی ضرور تھی کہ عورت چاہے سونے کی ہو سلکھن کبھی اُس پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔

ہاں عورت چاہے سونے کی ہو سلکھن اُس پر کبھی اعتبار نہیں کرتا تھا۔ میرا قیافہ تھا کہ سلکھن عورت سے ڈرتا ہے۔ پچھلے سال کی بات ہے ایک دفعہ میں نے چاولوں کی فصل کو پانی لگایا ہوا تھا۔ اور پانی موڑ کر کنوئیں کی طرف آ رہا تھا کہ دور سے سلکھن سنگھ بھاگتا نظر آیا۔ میں نے سلکھن سنگھ کا یہ حال پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لڑائی میں کئی بار میں سلکھن سنگھ کے ساتھ لڑا تھا۔ مگر اس طرح نہ کبھی سلکھن سنگھ بھاگا تھا نہ میں اس کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ اس دن تو حد ہی ہو گئی سلکھن کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس کے لمبے بال کھل گئے تھے اور پگڑی گلے میں پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے سنبھالا، بات پوچھی مگر اس کے منہ سے تو آواز ہی نہیں نکلتی تھی۔

''کہیں لڑائی نہ ہو گئی ہو۔ پر اس علاقے میں ایسا سورما تو کوئی نہیں جس نے سردار سلکھن سنگھ کا یہ حال کر دیا ہو۔'' میں نے سوچا۔ سلکھن سنگھ ہانپ رہا تھا۔ اُس کے منھ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بار بار اُدھر ہی دیکھ رہا تھا جدھر سے وہ بھاگ کر آیا تھا۔ آخر بہت مشکل سے اسکے منہ سے نکلا۔ ''بھائی مجھے بچا لے۔''

تو میری آنکھوں کے سامنے ہونے والی لڑائی کا نقشہ ابھر آیا۔ میرے ڈولے پھڑکنے لگے اور میں نے نوکر کو آواز دی۔ ''اوئے ماندر سنگھا، کوٹھے میں سے لاٹھیاں نکال لا۔''

سلکھن سنگھ کچھ کچھ سنبھل گیا۔ کہنے لگا۔ ''نہیں نہیں، لڑائی نہیں ___ وہ دارو نے آج میرا بازو پکڑ لیا

تھا__ اور میں بھاگ آیا ہوں۔‘‘

میں ہنس پڑا۔ ’’واہ اوئے سلکھن سنگھا__ دنیا پر اپنے غصے اور طاقت کا رعب ڈالا ہوا ہے اور آج ایک مسکین سی لڑکی نے تمہارا یہ حال کر دیا ہے۔‘‘ میں نے دل میں کہا: دارو خیر مسکین سی لڑکی تو نہیں بھرپور عورت ہے مرد مار قسم کی۔ تبھی تو گاؤں کے کسی جوان کا کبھی حوصلہ نہیں پڑا کہ وہ دارو کے سامنے کھڑا ہو کر ایک آدھ بات ہی کر لے۔ وہ سلکھن سنگھ پر عاشق تھی۔ مگر سلکھن یا تو اُس کے پاس سے آنکھیں بند کر کے گذر آتا تھا یا اُس کی راہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیتا تھا اور دارو سلکھن سے لڑکوں کی طرح ٹھٹھا کر کے گذر جاتی تھی۔

اور یہ تو سلکھن سنگھ کا حال تھا۔ عورت تو سلکھن سنگھ کی موت تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ ’’رتن سنگھا! جب عورت سورمے کے من میں گھس جائے تو سورما سورما نہیں رہتا__ اور میں اِسی لیے عورت کی پرچھائیں سے ڈرتا ہوں۔‘‘

چار سال پہلے کی بات ہے۔ بھائی کا بیاہ تھا۔ دن چڑھے بارات نے روانہ ہونا تھا۔ سلکھن کو مناتے چھ سات دن ہو گئے تھے مگر وہ ماننے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

’’میں نہیں جانا بھائی! میں نہیں جانا۔‘‘

’’مگر بات کیا ہے__ سلکھنا۔‘‘

’’بھائی بات کوئی بھی نہیں۔ میں نہ بھی جاؤں تو کیا ہو جائے گا۔‘‘

’’نہیں سلکھنا! تم ضرور جاؤ گے۔ نہیں تو تمھاری میری ختم۔‘‘ میں نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔

’’تم مجھے ڈبو کر ہی راضی ہو تو چلو۔ مگر رات کو میں بارات کے ساتھ نہیں اپنے ماموں کے گھر رہوں گا اور تم بھی۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ پنڈوری سلکھن سنگھ کا نہال تھا۔ میں نے پوچھا۔

’’وہاں برادری میں کوئی جھگڑا چل رہا ہے۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ وہ بولا۔

بارات روانہ ہوئی۔ سلکھن سنگھ بارات سے پرے گھوڑے کو دلکی چال چلا رہا تھا۔ لڑکے گھوڑے گھوڑیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے جا رہے تھے۔ میں نے گھوڑا بڑھایا اور سلکھن سے کہا۔ ’’سلکھنا گھوڑے کی لگامیں ذرا ڈھیلی کر۔ اس طرح اسے تکلیف ہو رہی ہے۔ دیکھو، کھینچ کھینچ کر تم نے اس کا منھ زخمی کر دیا ہے۔‘‘

’’ہیں__‘‘ سلکھن جیسے سو رہا تھا۔

’’او نہیں، بھائی۔‘‘ وہ آہستہ سے ہنس کر بولا۔

’’کیا سوچ رہے ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’کچھ نہیں__ کچھ نہیں__ میں سوچ رہا تھا کہ پنڈوری نزدیک آ گیا ہے وہ سامنے درخت پنڈوری

کے ہیں__ “ سلکھن بولا

اُس دن سلکھن کچھ بجھا بجھا تھا۔ تمام راستہ ہوں ہاں کے سوا اُس نے کوئی بات نہیں کی۔ پنڈوری آ گیا۔ بارات بیٹھ گئی تو سلکھن نے مجھے آنکھ ماری۔ ہم اٹھ کر چل دیے، بارات خاطر مدارت کروانے میں مصروف تھی کہ کسی نے دھیان نہیں دیا۔ دوسری طرف سلکھن کے ماموں کا گھر تھا۔ مجھے حویلی میں بٹھا کر سلکھن گھر گیا اور جاتا جاتا لوٹ آیا اس کے ساتھ اس کے ماموں کا بیٹا تارا سنگھ تھا۔

تارا سنگھ نے بھوسے کے ڈھیر سے دو بوتلیں نکالیں اور سلکھن کو پکڑا کر بولا۔

”بھائی پیو گئے تو یاد کرو گے۔ بہت عرصے سے تمھارے لیے سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔“

”رتن سنگھا! بھائی کچھ نشہ پانی کر لے۔“

اور پھر رات ڈھلنے تک میں اور سلکھن پیتے رہے مگر سلکھن منہ سے کچھ نہ بولا جیسے اس کے منہ پر قفل پڑ گیا ہو۔ میں ختم کر کے روٹی کھانے لگ گیا مگر سلکھن ابھی تک پی رہا تھا۔ اور وہ پیتا رہا____

اُس دن تو سچ مچ اس نے پینے کی حد کر ڈالی____

صبح سو کر اٹھے تو سلکھن کی چارپائی پر تارا سنگھ بیٹھا تھا کہنے لگا۔ ”بھائی جی! سلکھن کی طبعیت ٹھیک نہیں تھی گاؤں چلا گیا ہے۔“

میں حیران رہ گیا کہ سلکھن راتوں رات گاؤں کیوں چلا گیا۔ بارات پلٹی تو میں سب سے پہلے سلکھن کے گھر گیا مگر وہ گھر نہیں تھا اور وہ پورے سات دن گھر نہیں آیا۔ بنتو بیچاری کے پاؤں چکر کاٹ کاٹ کر گھس گئے۔ آخر بڑا بھائی تھا__ بھائی ہی کیا__ مل کر ماں باپ بہن بھائی بنتو کا سب کچھ سلکھن ہی تو تھا۔ یا پھر ایک دور پار کی خالہ جو جوان بنتو کے ساتھ گھر میں رہتی تھی۔ اور بنتو کا تھا بھی کون۔ رو رو کر بنتو کی آنکھیں سوکھ گئیں۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر میرا جوتا بھی گھس گیا مگر سلکھن کا پتہ نہ چلا۔ اس رات میں بنتو کو تسلی دے کر اٹھا اور سلکھن کی حویلی جا کر اُس کے مویشیوں کو چارہ بھی ڈالا۔ پھر سونے کے لیے چارپائی بچھائی تو بنتو دودھ لے کر آ گئی۔

”بھائی کے گھوڑے بنا حویلی کی رونق ہی آدھی رہ گئی ہے۔“

”کوئی بات نہیں بنتو تمہارا بھائی بھی اور اس کا گھوڑا بھی آ جائے گا۔ دل چھوٹا نہ کر۔“ میں نے بنتو کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

”مگر بھائی! پنڈوری میں کوئی بات تو نہیں ہوئی تھی اُس دن؟“

”کس قسم کی بات؟“

”کوئی__ “ اور پھر بنتو پتا نہیں کیوں رک گئی کچھ نہ بولی۔

"بھابھی پسند آئی؟“ بنتو نے بات بدلی۔

”بندریا جیسی ہے۔“ میں نے بنتو کو چھیڑا۔

”ہائے ہائے، اتنی خوبصورت ہے۔ میری بھابھی ہوتی تو میرے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے۔“

”تیری بھابھی تو ہم اس سے بھی خوبصورت لائیں گے۔ سلکھن سنگھ سے بھی بانکی__ مگر پھر بھی تم نے کون سا مٹھائی کھلا دینی ہے۔“

”ضرور کھلاؤں گی۔“

”قسم اٹھاؤ۔“

”دھرم سے۔“

”اچھا بھئی، سلکھن آ جائے تو اُسے کہتے ہیں باقی کام بعد میں کرے پہلے ہماری بنتو کے لیے بھابھی لے آئے__ ٹھیک ہے ناں!“

”جی۔“

”جاؤ، اب تم جا کر سو جاؤ__ شاباش__ بہت اچھی لڑکی ہو۔“

”مجھے گھر میں ڈر لگتا ہے۔ خالہ تو شام کو ہی سو جاتی ہے اور میرا بھائی کے بغیر دل نہیں لگتا۔ وہ رات گئے تک مجھ سے باتیں کرتا رہتا تھا__ ہائے__ میرا بھائی پتا نہیں کہاں ہے۔“

اور اُس کا بھائی اُسی وقت حویلی کے دروازے پر تھا۔ اُس کا گھوڑا حویلی میں داخل ہوتے ہی ہنہنایا تو بنتو دوڑ کر گھوڑے کے ساتھ چمٹ گئی۔ میں نے بھی اٹھ کر سلکھن کے ساتھ صاحب سلامت کی۔ مگر سلکھن کے منہ پر جیسے تالا پڑا ہوا ہو۔ چاندی کی دھیمی لو میں میں نے اُس کا چہرہ دیکھا جو سرسوں کے پھول کی طرح زرد تھا۔ اُس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ اُس کی داڑھی کے انگلی جتنے بال غریب کسان کی گھاس کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کی اٹھی ہوئی گھنگھریالی مونچھیں جھکی ہوئیں تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں نہ نور تھا نہ چمک__ وہ کتنا بدل گیا تھا۔ اُس نے ہاتھ میں تھامی کرپان دور کھرلی میں پھینک دی۔ آہستہ سے کاٹھی کے سرے کو پکڑ کر گھوڑے سے اترا اور لڑکھڑاتے قدموں سے قریبی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”ٹھیک تو ہو؟“

”نہیں بھائی،“ وہ آہستہ سے ہوکا بھر کر بولا۔

”کہاں تھے؟“

”شہر۔“

”ابے بے وقوف، کچھ گھر کا خیال کرتے۔ گھر میں جوان بہن رو رو کر ہلکان ہو گئی ہے__ اوئے تم کوئی پیغام ہی بھیج دیتے۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ (ایسے وقت میں اُسے اکثر ڈانٹ لیتا تھا اگرچہ وہ عمر میں مجھ سے چار پانچ سال بڑا تھا۔)

''مگر تم جو تھے بنتو کے پاس۔ تو پھر میرا اُس نے اچار ڈالنا تھا۔''

اور گھوڑا باندھ کر آتی ہوئی بنتو سہم کر اُن ہی پیروں پر تھم گئی جن پر اُس نے یہ بات سنی تھی۔ سلکھن بولا۔

''اے لڑکی! میری روٹی یہیں دے جا۔''

تو مجھے محسوس ہوا جیسے سلکھن کچھ چڑچڑا سا ہو رہا ہے۔

''میں چلوں پھر۔'' میں اٹھا۔

''ٹھیک ہے۔'' سلکھن نے روکھا جواب دیا۔

اگلے دن میں کھانا کھا رہا تھا کہ بنتو آ گئی۔ ''سلام کہتی ہوں بھابھی۔''

بنتو پیڑھی لے کر رسوئی میں ہمارے پاس بیٹھ گئی۔

میں بھابھی کی ماتھے کی تیوریوں کو دیکھ رہا تھا جو بنتو کو دیکھ کر پڑ گئیں تھیں۔ بھابھی نے اس کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔

میں شرمندہ ہوا اور بنتو کے سر پہ ہاتھ پھیر کر میں نے کہا۔

''آؤ کھانا کھا لو بنتو بہن!''

''نہیں بھائی جان۔ واہگورو زیادہ دے۔ میں کھانا وغیرہ کھا پکا کر آئی ہوں۔''

''کدھر آئی تھی؟''

''آپ کو بلانے۔''

''خیر تو ہے۔''

''بھائی نے بلایا ہے خیر ہی ہے ___ بھائی کچھ ٹھیک نہیں۔'' بنتو باتیں کر رہی تھی مگر اُس کی نظریں بھابھی پر جمی تھیں۔ بھابھی کے ہاتھ سے پیڑا چھوٹ کر گر پڑا اور وہ چمک کر بولی۔

''جاؤ اُس اپنے سگے کی بات سنو جا کر ___ یہاں کیا دفتر کھول کر بیٹھے ہوئے ہو۔''

پھر میں اور بنتو اٹھ کر آ گئے۔ وہ دن جائے اور آج کا آئے، بھابھی سلکھن اور بنتو کو گالیوں سے نوازتی رہتی تھی۔ بات کسی کی ہو، قصور کسی کا ہو لیکن بھابھی اُن کو گالیاں نکالتی اور بددعائیں دیتی کبھی نہ تھکتی۔

سلکھن ہماری ہی برادری سے تھا بنتو اور سلکھن دن میں ایک آدھ مرتبہ ہمارے ہاں ضرور آتے تھے۔ مگر جس دن کی بھابھی گھر آئی تھی سلکھن کو تو قسم ہو جو وہ ہماری دہلیز پر قدم بھی رکھا ہو اور بنتو بھی دوبارہ کبھی نہیں آئی۔ بھابھی کو سلکھن وغیرہ کے ساتھ کیا بیر تھا یہ تو ہمیں پتا نہیں مگر بھابھی کو ان سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ چار سال اسی طرح ہی بیت گئے۔ بھابھی میری شکایتیں لگانے کو شیر تھی۔ شروع شروع میں تو بھائی نے مجھے جھاڑ پلائی مگر جب اسے پتا چلا کہ یہ عادت بھابھی اپنے میکے سے لے کر آئی ہے تو بھائی نے اس کی بات سننا ہی چھوڑ دی۔ بس بھابھی، سلکھن اور اس کے اگلے پچھلوں کو صلواتیں سنا کر چپ ہو جاتی اور بھائی ہنس پڑتا۔

سلکھن بھی بجھارت بن گیا تھا۔ مجھے تو اس کی بھی سمجھ نہیں آتی تھی۔ شاید وہ بیمار ہو گیا تھا۔ نہ اسے مویشیوں کا اتا پتا تھا اور نہ فصل بننے کی خبر۔ سارا دن وہ گھر میں بیٹھا رہتا۔ رات ہوتے ہی بوتل پکڑ کر حویلی چلا جاتا۔ میں جاتا تو بس ہوں ہاں سے آگے بات نہ بڑھتی۔ یوں لگتا تھا جیسے اُسے اندر ہی اندر کوئی دکھ کھائے جا رہا ہو__ لگتا تھا جیسے وہ گہری سوچوں میں ڈوبا رہتا ہے۔ گاؤں کے لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔
کوئی کہتا تھا۔ ”کہیں آنکھ لڑ گئی ہے۔“

کوئی کہتا تھا۔ ”کسی پیر فقیر کی بد دعا لگی ہے۔“ کوئی کہتا تھا۔ ”بہن جوان ہوئی ہے تو ساری بد معاشی بھول گیا۔“ بات یہ تھی کہ جتنے منھ اتنی باتیں۔ مگر سلکھن تو لوگوں سے یوں کٹ گیا تھا جیسے وہ بدیس چلا گیا ہو۔ بس آ جا کر میں اُس کے گھر جاتا اور وہ دو چار باتیں کر لیتا یا وہ خود اٹھ کر میرے ساتھ حویلی تک آ جاتا۔ اور بس__ سچ پوچھو تو سلکھن وہ سلکھن رہ ہی نہیں گیا تھا۔

اور آج سہ پہر کو جب میں سلکھن سنگھ کی طرف گیا تو وہ نہار رہا تھا مجھے دور سے ہی دیکھ کر نعرہ لگایا

”واہ بھئی واہ آج تو فقیر کے گھر بادشاہ آ گیا ہے__ اے لڑکی صحن میں چارپائی نکال اور دودھ بھی لے آ۔“

میں نے دیکھا کہ سلکھن بہت خوش لگ رہا تھا اور بنتو کے پیلے منہ پر بھی لالی چڑھی ہوئی تھی، شاید بھائی کی خوشی سے۔

”بھائی صحیح وقت پر آئے ہو۔ میں تمھاری طرف آدمی بھیجنے ہی والا تھا۔“ سلکھن ہنس کر بولا۔

”سچ مچ؟“

”قسم گرو کی__ کیوں بنتو میں نے کوئی جھوٹ بولا ہے؟“

اور پتا نہیں کیوں بنتو میری طرف دیکھ کر لال سرخ ہو گئی اور اُس نے شرما کر منہ پھیر لیا۔

”او، جا۔ جا کر دودھ لے آ۔ پگلی کہیں کی۔ اور میرے کپڑے بھی صندوق سے نکال۔“

”آج تمھارے ساتھ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

”کرو۔“ میں بولا۔

”یہاں نہیں__ پنڈوری چل کر__ راتوں رات واپس آ جائیں گے۔“

”مگر بھائی تو......“

”مجھے پتا ہے تمہارا بھائی یہاں نہیں__ وہ شہر گیا ہوا ہے اس کے ساتھ تو بات ہو گئی ہے تم یوں کرو گھوڑا لے کر مجھے باہر مڑھیوں والے کنوئیں پر آ کر ملو۔“

”ٹھیک ہے۔“

میں نے گھر آ کر دھلے ہوئے کپڑے پہنے اور حویلی سے گھوڑا لے کر چوک میں آیا تو سلکھن سنگھ گھوڑے

پر بیٹھا چچا گلاب کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ نئے کپڑے اور کیسری رنگ کی کلف لگی پگڑی اُس پر بہت جچ رہی تھی۔ اُس نے گھوڑے کی لگام ران کے نیچے دبا کر پگڑی پر صافہ باندھا اور مجھے آنکھ مار کر گھوڑے کا منھ موڑ کر ایڑھ لگا دی۔ اُس کا گھوڑا دھویں کے بادل بناتا گاؤں سے باہر والی سڑک پر دھول میں ہی گم ہو گیا، اور میں چوک والے برگد کے نیچے کھڑا سوچ رہا تھا کہ کہیں بھابھی نہ دیکھ لے۔ نہیں تو پھر شامت آ جائے گی۔

شام رات میں بدلنے لگی تو میں نے اپنے گھوڑے کو ذرا چھیڑا۔ مڑھیوں والے کنوئیں پر سلکھن میرا انتظار کر رہا تھا۔

’’بہت دیر کر دی یار۔‘‘ وہ بولا۔ ’’چلو خیر اب جلدی چلتے ہیں۔‘‘

’’چلو۔‘‘

سلکھن سنگھ نے اپنا گھوڑا میرے پاس لا کر میری طرف یوں دیکھا جیسے وہ میرا چہرہ پڑھ رہا ہو۔

’’میں نے کچھ دنوں تک کہیں جانا ہے۔‘‘ اس نے بات چھیڑی۔

’’کہاں؟‘‘ میں نے اُس سے پوچھا۔

’’یہ مت پوچھو___ پہلے بات سن لو___ یہ بھی پتا نہیں کہ میں وہاں سے کبھی واپس بھی لوٹ کر آؤں گا کہ نہیں___‘‘ وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

’’تو بنتو؟‘‘ میرے منہ سے نکلا۔

’’وہ اپنے گھر چلی جائے گی۔‘‘

’’کونسا اپنے گھر؟‘‘

’’اپنے سسرال۔‘‘

’’کہاں___؟‘‘

’’تمھیں یہ رشتہ پسند ہے؟‘‘

سلکھن نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا تو میں حیران رہ گیا۔ اُس نے گھوڑا روک لیا اور تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

’’بولتے نہیں بھائی؟‘‘

’’میں تمھاری بات نہیں سمجھا سلکھنے!‘‘

’’اوئے رتو، بات سیدھی ہے۔ میں نے تمھارے بھائی سے بھی بات کر لی ہے، اس نے تو ہاں کر دی ہے۔ تم سے اچھا لڑکا ملنا بھی مشکل ہے۔ اور بنتو بھی خوش رہے گی___ تمھیں پتا ہے کہ بنتو میری بہن ہی نہیں بیٹی بھی ہے۔ اُس کی خوشی کے لیے میں دنیا کا ہر کام کر سکتا ہوں___ تمھاری مرضی پوچھنی تھی تا کہ میں یہ بوجھ اپنے سر سے اتار کر کہیں جانے والا بنوں۔ تمھاری کیا مرضی ہے؟‘‘

''اور بھابھی ___؟''

''بھابھی ___'' سلکھن جیسے گم ہو گیا اور پھر آہستگی سے بولا۔ ''وہ بھی مان جائے گی۔''

میں سلکھن کی اس بات پر ہنس پڑا۔ سلکھن نے شاید میرے دل کی بات جان لی تھی۔ وہ شرمندہ ہو کر بولا۔

''بھابھی کے ساتھ بنتو کا گذارہ نہیں ہوگا۔ مجھے پتا ہے۔ مگر تم اس بات کو چھوڑو ___ بنا بنایا گھر تمھارے پاس ہے تم بنتو کے ساتھ ہی رہو گے۔ زمین کے جو چار مربعے ہیں انہیں کاشت کر اور کھا۔ مال مویشی بھی ہیں اور جس چیز کی تمھیں ضرورت ہوگی میں لے کر دے جاؤں گا ___ مگر یہ کام میں بہت جلد کرنا چاہتا ہوں۔''

''جیسے آپ کی مرضی'' میں نے کہا۔

''جیتے رہو میرے شیر۔'' سلکھن مجھے تھپکی دے کر کہنے لگا۔

''تم نے اب گھر جانا ہے تو جاؤ میں پنڈ وری کا چکر لگا آؤں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے گھوڑا گاؤں کی جانب موڑ لیا۔

سلکھن سنگھ میرے لیے بجھارت ہی بن گیا تھا۔ مجھے تو اُس کی سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا بات کر رہا تھا۔ اور اُس نے کہاں جانا تھا۔ جہاں سے شاید وہ واپس بھی لوٹے کہ نہیں ___

صبح بھابھی ابھی دودھ بلو ہی رہی تھی کہ میں نے اسے کہا۔

''بھابھی ایک بات کروں؟''

''دو کر میرے چاند ___ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔'' بھابھی پیار سے بولی۔

''بنتو کا رشتہ مل جائے تو ___؟''

''کون سی بنتو ___؟'' بھابھی نے میری بات کاٹی۔

''اپنے سلکھن کی بہن اور کونسی بنتو ___ بڑی گھر لڑکی ہے اور تمھیں بھی آرام مل جائے گا۔''

''اُس کتے چور اور بدمعاش کا نام نہ لو یہاں۔ وا ہگورو اُسے تو کسی کوے کتے کی ___''

''اوہ، مگر بھابھی میں تو بنتو کی بات کر رہا ہوں۔''

''چور کی بہن ٹھگنی ___ وہ تو اپنے کمینے بھائی سے بھی چار قدم آگے ہے ___ اس گھر میں وہ نہیں آ سکتی ___''

بھابھی غصے سے لال پیلی ہو کر بولتی جا رہی تھی کہ میرے منھ سے نکلا۔

''تمھاری اِن ہی گالیوں اور بددعاؤں کی وجہ سے ہی وہ بیچارہ گاؤں چھوڑ کر جا رہا ہے۔''

بھابھی کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا اور جلدی سے بولی۔

''تمھیں کس نے کہا ہے؟''

''اُس نے خود۔''

اور پھر بھابھی کے منہ کو شاید تالا لگ گیا۔ وہ دودھ چھوڑ کر اندر چلی گئی اور میں باہر نکل آیا۔

میں حویلی میں تھا کہ بھابھی مجھے کھانے کے لیے بلانے آئی۔

بھابھی کے بال بکھرے ہوئے تھے، چادر آدھے سر سے نیچے کھسکی ہوئی اور آنکھیں لال سرخ ہو کر سوجی ہوئی تھیں۔ اُس کا منہ زرد پڑا ہوا تھا۔ میں بھابھی کا یہ حال دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"بھابھی، تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں بھائی۔" اُس نے آہستگی سے کہا۔

پھر رات تک بھابھی نے کوئی بات نہ کی۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جب میں نے دوبارہ بنتو کے رشتے کی بات کی تو بھابھی نے سلکھن کو گالیاں بھی نہیں دیں۔

رات کو میں حویلی میں آ کر سویا مگر نیند کہاں۔ اکتا کر میں آدھی رات کو اٹھ کھڑا ہوا۔ کنواں جوتنے لگا تو یاد آیا کہ میری بیل ہانکنے والی چھڑی تو گھر رہ گئی ہے اور میں چھڑی لینے گھر کی طرف چل پڑا۔ میں ابھی گھر سے کچھ فاصلے پر تھا کہ ہمارے گھر کے دروازے سے سفید چادر میں لپٹا ایک آدمی نکلا۔ وہ بھائی نہیں تھا بھائی کی چال تو میں سو آدمیوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ کوئی اور تھا۔ جانے والے نے پلٹ کر ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ وہ سلکھن کی حویلی کے دروازے پر جا کر وہ ٹھیر گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے جلدی سے دیوار کی اوٹ لے لی اور اُس آدمی نے حویلی کی باہر والی کمر جتنی بلند دیوار پھلانگ کر اندر چھلانگ لگا دی۔ میں آہستگی سے دیوار پر چڑھا تو وہ آدمی سلکھن سنگھ کی چارپائی کے سرہانے کھڑا تھا۔ پھر چادر میں سے ٹوکے والا ہاتھ نکلا اور میرے پکارنے سے پہلے ہی ٹوکا سلکھن پر اپنا وار کر چکا تھا۔ جب ہاتھ دوسری مرتبہ اٹھا تو میں نے بھاگ کر پیچھے سے ٹوکے والے کو جپھا ڈال لیا۔ ٹوکہ اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور چادر سر سے سرک گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو دھیمی دھیمی چاندنی میں بھابھی پتھر کے بت کی طرح کھڑی خالی خالی آنکھوں سے پتہ نہیں کدھر دیکھ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے سلکھن کو دیکھا۔ اُس کی آدھی کٹی ہوئی گردن ایک طرف لڑھک گئی تھی۔ وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میری چیخ نکلی تو بھابھی ڈرے ہوئے بچے کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"رتو! آج میں بیوہ ہو گئی ہوں___ لوگو میں لٹ گئی ہوں۔" اور بھابھی بین ڈالتی ہوئی سلکھن سنگھ کی لاش سے چمٹ گئی۔

☆☆☆☆

افضل احسن رندھاوا

ترجمہ: سلیم شہزاد

دشمنی

وہ اساڑھ کی ایک دوپہر تھی، جب اپنی حویلی میں بیٹھے ہوئے میرا پورا وجود اپنے ہی قہر کے پسینے سے بھیگ گیا اور میرا پسینہ ٹپ ٹپ کرتا چارپائی کے بان کو گیلا کر کے زمین میں جذب ہونے لگا۔ میرے پسینے سے ایک خوشبو نکلی اور چھپر میں پھیل کر صحن سے ہوتی گرم لو میں شامل ہو گئی۔ میرے سرہانے پڑی ایک بوتل خالی ہو چکی تھی میرے دل کی طرح اور دوسری میں آدھا گلاس باقی تھا روپو کے روپ کی مانند۔

میں نے وہ آدھا گلاس بھی پی لیا۔ ٹوٹتے نشے پر جیسے نشے کی ایک اور تہہ جم کر میرے اندر کی آگ کو مزید تیز کر گئی اور جب مجھے اپنے جلتے گوشت کی بو آنے لگی تو پتا نہیں راجندر کہاں سے آ گیا۔ اُس کے سر کے بال اور چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی پسینے سے شرابور تھی اور اُس کا چہرہ جوانی کے خون اور باہر کی گرمی سے جلتے کوئلوں کی مانند تھا۔ وہ خاموشی سے میری چارپائی کی پائینتی پر بیٹھ گیا اور میری جانب دیکھنے لگا۔

راجندر سنگھ یوں ہی کیا کرتا تھا۔ خاموشی سے آ کر چند لمحے چپ بیٹھ رہتا۔ پھر مجھ سے سرد گرم باتیں کر کے ہوکے بھرتا واپس چلا جاتا۔ پانچ سات گاؤں میں راجندر ہی واحد شخص تھا جو مجھ سے اونچی آواز میں بات کر سکتا تھا، نہیں تو میری جوانی اور میری برچھی میری ساوی گھوڑی کی طرح بہت منھ زور تھیں۔ اور پھر راجندر کوئی غیر تو نہیں تھا آخر میرا دوست تھا۔

راجندر نے کندھے کی چادر سے پسینہ پونچھا اور کہنے لگا۔ ”دنیا کہتی تھی اور میں بھی اکثر سوچتا تھا کہ تم بہت بڑے سورما ہو مگر تم سورما نہیں ہو۔ قسم سے تم سورما نہیں ____ بہادر یوں نہیں کرتے۔“

”راجندرا!“ میں نے کہا۔ ”کبھی کبھی مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ سورما بن کر بھی کیا ملتا ہے؟“

راجندر ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔ ”بس ایک سال میں ہی گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ تم تو سچ مچ سورما تھا بھائی ____ سورما ____ تم جیسا اور کون تھا ____ مگر تم معمولی سی بات پر مار کھا کر اپنا آپ گنوا بیٹھے ہو۔ عورتوں کی طرح اندر اندھیرے میں بیٹھ کر کہتے ہو: سورما بن کے بھی کیا ملتا ہے ____ اے بھائی! دنیا میں دو ہی چیزیں ہیں جنھوں نے

فنا نہیں ہونا۔ کبھی نہیں مرنا ___ ایک رب کی ذات اور دوسرا سورے کا نام ___ اور باقی ہر چیز ختم ہو جانے والی ہے، مر جانے والی ہے ___ میری جوانی بھی، تمھاری طاقت بھی اور روپو کا روپ بھی ___ تم بکھری ہوئی خوشبو اکٹھی کرتے پھرو اور کہتے پھرو سورما بن کر کیا ملتا ہے؟“

راجندر زور سے ہنس پڑا۔ وہ ہنسا کہاں تھا، وہ تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔ پھر وہ جلدی سے اٹھ کر حویلی سے نکل گیا۔

راجندر جو کچھ مجھے کہہ گیا تھا اگر کوئی اَور کہتا تو میں اُس کے ٹکڑے کر دیتا۔ چاہے وہ میرا باپ ہی ہوتا۔ اور جو آگ راجندر نے مجھے لگائی تھی وہ میرے حوصلے کے زور سے بجھی نہ ہی شراب پی کر۔ جب ایک پہر گذر گیا تو میں حویلی کے صحن میں نکلا۔ مجھے دیکھ کر میری گھوڑی ہنہنائی اور میں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ” راجندر! میں نے تجھے معاف کیا۔ رب سچا بھی تمھیں معاف کر دے گا۔“

میں جو گرے ہوئے رنگ اور بکھری ہوئی خوشبو اکٹھا کرتا پھرتا تھا، یہ سوچ کر ہنس پڑا کہ جب ہم کسی کو کچھ نہیں کہہ سکتے تو اُسے معاف کر دیتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں معاف کر دینے والا بہت بہادر ہوتا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ نہ لڑنے والا بہادر ہوتا ہے اور نہ ہی معاف کرنے والا ___ بہادر وہ ہے جو اپنے آپ کو مار لے۔

اُسی وقت میری ماں چپ سادھے میرے سامنے کھڑی ہوئی۔ اُس کے چاندی جیسے سفید بال اُس کی کھدر کی چادر سے باہر نکلتے نظر آتے ہیں۔ اُس کے چہرے پر اتنی ہی جھریاں ہیں جتنے میرے باپ کے جسم پر زخم تھے۔

وہ مجھے کہتی کچھ نہیں مگر اُس کی نظریں مجھے وہ سب کہہ ڈالتی ہیں جو اُس کے دل میں ہوتا ہے۔ اُس نے بس ایک بار میرے ساتھ بات کی تھی اور وہ بھی تب جب ابا قتل ہوا تھا۔ ماں نے اُس دن شور مچایا نہ روئی اور نہ ہی اپنے صحن میں رشتہ دار عورتوں کے ساتھ مل کر بین ڈالے، وہ خاموشی سے بیرونی کمرے میں میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ میں بکل میں منھ لپیٹے لیٹا ہوا تھا۔ میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہنے لگی۔ ” آج اگر تمھارا کوئی بھائی ہوتا تو تم اسی طرح منھ لپیٹ کر نہ لیٹتے۔“

ماں کی آواز بھرا گئی مگر وہ پہلے سے بھی اونچی آواز میں بولی۔ ” میں تجھے اپنا دودھ نہیں بخشوں گی، اگر وریام سنگھ کی نسل میں سے ایک بھی شخص زندہ رہا۔ یہ ماجھا ہے۔ یہاں وہی زندہ رہتا ہے جس کی آن زندہ رہے۔“

ابا میرے سامنے آ کھڑا ہوتا اور کہتا۔ ” اندر سنگھا! اگر تم نے میرے خون کا بدلہ نہ لیا تو میں ساری عمر بھوت بن کر تیرا پیچھا کرتا رہوں گا ___ “ اور ایک دن روپو حویلی کے سامنے مجھے کہنے لگی۔ ” ایک راجندر کی

دوستی کی خاطر اتنے راٹھ باپ کے قتل کا بدلہ لینا بھول گئے۔ لعنت ہے ایسی دوستی پر ___ سارے گاؤں کی نظریں تم پر ہیں۔ دوستی کی خاطر بہادری کی ریت نہ گنواؤ۔ نہیں تو اندر بیٹھ رہو، باہر نہ نکلو۔ اگر میں چچا کا بدلہ لے سکی تو تمھارے گناہ دھل جائیں گے۔''

اُس وقت راجندرا، جو روپو کی بات سن رہا تھا، مجھے کہنے لگا۔ ''بھیا! تم بہت ہی دلیر ہو۔ میرے باپ اور دونوں بھائیوں نے تمھارے باپ کو قتل کیا ہے۔ ایک قتل کا بدلہ تین قتل ہوتے ہیں۔ برچھی پکڑو اور چلو میرے ساتھ! ___ اگر میں تمھارے کندھے سے کندھا جوڑ کر نہ لڑوں تو دھرم سے میری گردن اڑا دینا۔ تمھاری دوستی میرا ایمان ہے اور ایمان ماں باپ اور بہن بھائیوں سے اونچا ہوتا ہے۔''

میں نے یہ بات کہی۔ ''راجندرا! میرے باپ کو تیرے بھائیوں اور تیرے باپ نے قتل کیا ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں مگر پھر بھی تم میرے دشمن کے بیٹے ہو، دشمنوں کے بھائی ہو مگر قسم ہے گورو کی تم مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہو۔''

''تم نشے میں ہو بھیا۔'' راجندرے نے کونے سے اٹھا کر میری برچھی مجھے پکڑائی اور کہنے لگا۔ ''لو اسے میرے سینے کے پار کر دو یا میرے ساتھ اپنے باپ کو بدلہ لینے چلو ___''

''راجندرا!'' میں نے اُسے کہا۔ ''مارنے سے معاف کر دینا بڑا کام ہے۔''

وہ کیسے اور کیوں؟'' راجندر نے پوچھا اور پھر خود ہی کہنے لگا۔

''اس لیے کہ وہ میرے بھائی اور باپ ہیں ___ مجھے اتنا رذیل نہ سمجھو بھائی! اگر تم دوستی پالنا جانتے ہو تو میں بھی تمھیں یاری نبھا کر دکھاؤں گا۔''

اور اُس وقت جب تھانہ ہمارے گاؤں آیا تھا تو چوک والے بوڑھ کے نیچے میرے باپ کی لاش چارپائی پر تھی اور سارا گاؤں ___ ارد گرد بیٹھا تھا۔ میرے کنارو گل والے مامے آ گئے۔ کالی سیاہ گھوڑیاں اتنا بڑا ہجوم دیکھ کر ہنہنائیں تو تمام لوگ سہم گئے۔ میرے ماموں ___ مگرمچھ اور شیروں جیسے جوان جب گھوڑیوں سے اترے تو راجندر کے باپ اور اُس کے بھائیوں کے چہروں کا رنگ فق ہو گیا۔ سپاہیوں نے بندوقوں میں بلٹ ڈال لیے اور بڑا تھانیدار رگھبیر سنگھ کہنے لگا۔

''ورکو! دنگا فساد نہ ہو۔''

تو میرا بڑا ماموں کرنیل سنگھ ورک، جس سے پورا ماجھا کانپتا تھا، کہنے لگا۔

''تھانیدارا! تم اپنا کام کرو ___ ابھی تو فساد کی بنیاد پڑی ہے ___ اب فساد کو کون روک سکے گا۔ آدمی

میں نے لکھوانے تھے لکھوا دیے ہیں۔“

تھانیدار نے پوچھا۔ ”کوئی اور؟“

ماموں کرنیل سنگھ جلدی سے میرے طرف دیکھ کر بولا۔ ”راجندرا!“

میں نے اونچی آواز میں تھانیدار سے کہا۔ ”قسم گورو کی راجندر لڑائی میں نہیں تھا۔ وہ تو میرے ساتھ میلہ دیکھنے گیا ہوا تھا۔“

گاؤں والوں میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ ماموں نے تیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے راجندر کو دیکھ کر تھانیدار سے کہا۔ ”اگر اعتبار نہ ہو تو گاؤں کے کسی بھی بندے سے پوچھ لو۔“

”نہیں نہیں۔“ تھانیدار کہنے لگا۔ ”تم مدعی ہو، جس کا نام بھی لکھواؤ گے ہم لکھ لیں گے۔“

اور اُس میں سے راجندر کا نام کاٹ دیا۔ جب تھانہ چلا گیا، ملزم چلے گئے اور میں حویلی آ کر بیٹھ گیا تو راجندر میرے پاس آیا۔

”تم نے مجھے ہمیشہ کے لیے نیچا کر دیا ہے، بھیا!“ اور پھر چلا گیا۔ اُس دن، اساڑھ کی اُس رات کو جب راجندر میرے پاس سے گیا تو وہ رو رہا تھا۔ اگلے دن بڑی عدالت میں فیصلے کی تاریخ تھی جس پر میں نے جانا تھا نہ میں گیا۔

دن چڑھے گاؤں میں خبر پہنچی کہ راجندر کا باپ اور اُس کے دونوں بھائی بری ہو گئے ہیں۔ شام کی گاڑی سے وہ گاؤں آ جائیں گے۔ اُس دن تو میں نے پینے کی حد کر ڈالی۔ دوپہر شام میں اور شام رات میں ڈھل گئی۔ ماں میری روٹی خود لے کر آئی تھی۔ روٹی میرے پاس رکھ کر کہنے لگی۔

”میرے سورما بیٹے! آج ایک سال ہو گیا ہے نہ تم نے برچھی پکڑی ہے اور نہ ہی ساوی گھوڑی پر کاٹھی ڈالی ہے۔ باہر نکل کر دیکھو، تمھارے دشمن اپنے صحن میں بیٹھ کر ہنس ہنس کر جیل کی باتیں کرتے ہیں اور آج کی رات کے بعد وہ جتنی راتیں زندہ رہے مجھے چین نہیں آئے گا۔“ اور پھر اٹھ کر جانے لگی۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر بولی۔ ”راجندرے کا اعتبار نہ کیا کر، آخر دشمن ہے۔“

”چھوڑو اماں گھر جاؤ۔“ میں نے ذرا تیز ہو کر اُسے کہا۔ راجندرا سن رہا تھا، پاس آ کر بولا۔ ”چچی ٹھیک کہتی ہے۔ بھائی! ساری دنیا کہتی ہے تو تجھے عقل کیوں نہیں آتی؟“

میں نشے میں چور تھا مگر اٹھا تو میں نے اپنے پورے ہوش و حواس سے راجندر سے کہا۔ ”راجندرا! دنیا باپ کی سیڑھی چڑھ جائے لیکن میں تجھے بھائی کہہ کر دشمن کیسے سمجھوں؟“

راجندر چلا گیا اور میں پیتا رہا۔ پتا نہیں میں کب سویا مگر جب اٹھا تو دارا چوکیدار مجھے کہنے لگا۔ ’’رات کسی نے راجندر کے باپ اور دونوں بھائیوں کو قتل کر دیا ہے۔ بوڑھ کے نیچے تمام گاؤں اکٹھا ہے، تھانہ بھی آیا ہے۔ آپ کو تھانیدار نے بلایا ہے۔‘‘

میں ہڑ بڑا کر اٹھا۔ پگڑی سر پر لپیٹ کر چوک کی طرف دوڑا۔ تین چارپائیوں پر لہو سے بھیگی چادروں کے نیچے تین لاشیں پڑی تھیں۔ سارا گاؤں جمع تھا۔ وہی تھانیدار رگھبیر سنگھ تھا۔ راجندر ساتھ ہی ذرا فاصلے پر نئے کپڑے پہنے کلف لگی کیسری پگڑی باندھے ایسے کھڑا تھا جیسے بیساکھی کا میلہ دیکھنے جا رہا ہو۔ لہو سے بھری کرپان اُس کے سامنے تھانیدار کی میز پر پڑی تھی۔ تھانیدار ابھی مجھ سے بات کرنے ہی لگا تھا کہ راجندر برسا (میں نے اسے اس طرح بولتا کبھی نہیں سنا تھا)۔

’’تھانیدارا! یہ ہمارا دشمن ہے۔ ہمارے گھر کی بات میں اِس جو مت لاؤ۔ بات میں نے تمھیں ساری تھانے میں ہی بتا دی تھی۔ یہ کرپان ہے اور یہ میرے لہو میں بھیگے کپڑے ہیں۔ قتل میں نے کیے ہیں!____ اعتبار نہیں تو میری بھابھیوں سے پوچھ لو! میری ماں سے پوچھ لو!‘‘ اور سردار راجندر سنگھ رندھاوا اَور اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

جب ہتھکڑیوں والے ہاتھ باندھ کر اُس نے تمام گاؤں کے لوگوں سے صاحب سلامت کی اور میرے پاس سے گذرتے ہوئے آہستگی سے مجھے کہنے لگا۔ ’’بھیا کبھی کبھی میری ملاقات کو ضرور آیا کرنا۔ ایمان سے تمھارے بنا وہاں میرا جی نہیں لگے گا____‘‘

☆☆☆☆

افضل احسن رندھاوا

ترجمہ: سلیم شہزاد

عورت تلوار اور گھوڑا

وہ پوہ کی یخ رات تھی۔

سردار لکھن سنگھ رندھاوا کی حویلی میں الاؤ کے گرد بیٹھے پانچ بندے یوں لگ رہے تھے جیسے شمشان میں جلتی لاش کے گرد بھوت بیٹھے ہوں۔ شام آہستہ آہستہ رات بنتی جاتی تھی مگر آگ سینکنے والے چپ چاپ آگ سینکتے جا رہے تھے۔ آٹھویں کا چاند دھند کے باوجود زمین پر چاندنی بکھیر رہا تھا۔ بیٹھے ہوئے بندوں میں سے ایک نے کپاس کی بہت سی چھڑیاں توڑ کر آگ کے اوپر رکھ دیں تو آگ چیخ چیخ کر تیز ہو گئی۔ اردگرد بیٹھے ہوئے بندے تھوڑا سا پیچھے کو کھسکے۔ شاید تپش بڑھ گئی تھی۔ حویلی کے سکوت کو چارہ کھاتے بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز آہستہ آہستہ توڑ رہی تھی۔ اصطبل میں بندھا نکرا گھوڑا زور سے ہنہنایا تو حویلی کی چپ میں جیسے طوفان آ گیا۔

ساتھ ہی آگ سینکتا ہوا سردار لکھن سنگھ رندھاوا اپنے نوکر پر برسا جو اصطبل کے کونے میں کماد کتر رہا تھا۔

”اوے فوجیا ____“ لکھن سنگھ نے نوکر کو آواز دی۔

”جی سردار جی۔“ فوجا بھاگ کر آگ سینکنے والوں کے پاس آ کھڑا ہوا۔

”اوئے، جی کے پتر! گھوڑے کے آگے چارہ بھی ہے کہ نہیں؟“

لکھن سنگھ کو غصہ بہت جلد آ جاتا تھا اور اُس سفید گھوڑے کا تو وہ بیٹوں سے بھی زیادہ خیال رکھتا تھا۔ اپنے سامنے اُسے نہلواتا، سامنے ہی دانہ ڈلواتا، رات کو اپنے ہاتھوں سے اُس پر کمبل ڈالتا، صبح اپنے سامنے اُس پر کھریرا پھرواتا، اِدھر اُدھر آتے جاتے اُس کو تھپکی دیتا اور فوجے کو کہتا رہتا۔

”فوجیا! مکھن آ کر یہ نہ کہے کہ بھائی نے اُس کے گھوڑے کا خیال نہیں رکھا۔“ تو فوجا آگے سے دانت نکال کر دکھا دیتا۔ اُسے یاد تھا کہ یہ گھوڑا مکھن کا ہے اور اگر اُس کے گھوڑے کو کبھی چارے کے معاملے میں دیر سویر ہو جاتی تو وہ فوجے کی شامت لے آتا تھا۔

گھوڑا پھر ہنہنایا تو لکھن سنگھ نے فوجے سے پوچھا۔ ”اوئے، اِس کو دانہ ڈال دیا ہے؟“

”ابھی نہیں، سردار جی۔“

”ابے بھوتنی کے، پھر کب ڈالے گا اِس باپ کو؟ اِدھر گاڑی کا وقت ہونے والا ہے۔“ سردار لکھن سنگھ

نے بات ختم کی۔

"شاید گھوڑے کو بھی پتا چل گیا ہے کہ آج مکھن سنگھ نے آنا ہے۔" شیر سنگھ ورک بولا۔

"ہائے اوئے مکھن سنگھا ___" نورے کھرل نے جیسے نعرہ لگایا اور پھر کہنے لگا۔ "بھائی، ایک ہی دوست تھا مگر جس دن کا گیا ہے رب سچے کی قسم! دنیا ہی اندھیر ہو گئی ہے۔"

"مکھن دلیر آدمی تھا نوریا ___ مکھن کے بعد تو گاؤں ہی اجڑ گیا ہے ___ میلے، بھنگڑے، کبڈی، تماشے تو مکھن کے بنا جچتے ہی نہیں۔" نورے کھرل کے ساتھ بیٹھے ہوئے تیجا سنگھ نے کہا۔

"تمہارا تو وہ یار تھا مگر جس طرح یہ تین سال میں نے اُس کے بغیر کاٹے ہیں وہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔" لکھن سنگھ نے ٹہنی سے کوئلے کریدتے ہوئے کہا۔

"بھائی بازو ہوتے ہیں بھیا اور پھر مکھن جیسا دلیر اور مرد بھائی ___" نورے نے بات بڑھائی۔ پر بات آگے نہ بڑھی تو وہ خاموش ہو کر آگ سینکنے لگے۔

آج رات کی گاڑی سے مکھن سنگھ نے آنا تھا۔ مکھن سنگھ تین سال جیل کاٹ کر آنے والا تھا۔ لکھن سنگھ کے حساب سے ابھی اُس کے تین سال پورے ہونے میں دس دن باقی تھے۔ مگر نورا کھرل، جو جیل کا بہت بھیدی تھا، کہتا تھا کہ اگر تین سال کاٹ لیے جائیں تو دس دنوں کی معافی مل جاتی ہے۔ جب وہ پچھلے ہفتے مکھن سے ملاقات کر کے آیا تھا تو مکھن نے اُسے بتایا تھا کہ اسے دس دن کی معافی مل گئی ہے اور نورے کے حساب مطابق مکھن نے اُسی روز رات کی گاڑی سے اترنا تھا۔ نورے نے یہ بات تو نہ بتائی کہ سچ مچ اُسے دس دن کی معافی مل گئی۔ کہنے لگا۔

"میرا قیاس ہے کہ تین سال بھگت کر دس دن معاف ہو جاتے ہیں۔" شاید وہ لکھن سنگھ پر اپنے قیافے کا رعب ڈالنا چاہتا تھا۔ مگر لکھن بولا۔

"نورے، تم گاڑی دیکھ آنا مگر مکھن نے آنا نہیں۔ اُس نے آنا ہوتا تو کسی کے ہاتھ پیغام ہی بھیج دیتا یا جیل میں کسی سے خط لکھوا دیتا۔"

نورا بولا۔ "دو کوس پر سٹیشن ہے۔ گاڑی دیکھنے میں کون سا وقت لگے گا۔"

"اچھا بھئی، اچھا۔" لکھن سنگھ نے آخر نورے کی دلیلوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

گاڑی رات کے پہلے پہر آتی تھی۔ اِسی لیے نورا اپنی برچھی اور اونٹنی ساتھ لے آیا تھا کہ لکھن کی حویلی سے وہ سیدھا اسٹیشن چلا جائے گا۔

لکھن سنگھ اور مکھن سنگھ سردار شام سنگھ سفید پوش کے بیٹے تھے۔ قرب و جوار میں شام سنگھ جیسا کھاتا پیتا اور بھلا مانس کوئی نہیں تھا۔ نہ اُس کا کسی سے بیر تھا نہ گہرا یارانہ۔ بس سیدھا سادا بندہ تھا۔ مگر بیٹے ابھی چھوٹے تھے کہ وہ دنیا سدھار گیا۔ اُس وقت لکھن سنگھ دس برس کا اور مکھن سنگھ سات برس کا تھا۔ لیکن اچھے کھانے پینے

اور پہناوے سے لڑ کے دِنوں میں جوان ہو گئے۔ لکھن سنگھ بھی جوان تھا مگر باپ کی طرح بھلا مانس اور خاموش طبع مگر چھوٹا مکھن سنگھ شرارتی، تیز، لڑاکا اور دلیر تھا۔ دنوں کبڈی بہت اچھی کھیلتے تھے۔ وہ بوڑھ کا میلا تھا جب مکھن کی اور بڈھے پنڈ والے کرتارے کی کبڈی کھیلتے کھیلتے لڑائی ہو گئی۔ کبڈی کا تو بس بہانا تھا اندر ضرور کوئی اَور بات تھی۔ مگر کسی کو اندر کی بات کا پتا نہیں تھا۔ لڑائی مکھن اور کرتارے کی تھی پر بڑھتے بڑھتے نویں پنڈ اور بڈھے پنڈ والوں میں ٹھن گئی۔

لڑائی بڑھی تو کلہاڑیوں کے کیل بھی ٹوٹے اور بھالوں کے پھل بھی ٹیڑھے ہوئے۔ لکھن سنگھ اول تو لڑتا نہیں تھا اور اگر لڑتا تو پھر آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور جب وہ زیادہ دھندوں میں گھر کر مجبور ہو جاتا تو پھر وہ:

''اوئے مکھنا___'' کا نعرہ لگاتا اور اگر مکھن پہنچ جاتا تو وہ دونوں پورے گاؤں پر بھی بھاری تھے۔

بوڑھ والے میلے کی لڑائی کا نتیجہ اور تو کچھ نہیں نکلا۔ کرتارے کی ٹانگ ٹوٹ گئی، وہ کبڈی شبڈی سے معذور ہو گیا اور مکھن سنگھ تین سال کے لیے قید۔ قید تو لکھن سنگھ نے بھی ہو جانا تھا مگر وہ مکھن کے مشورے سے تھانے دار کو سفید گھوڑی اور ہزار روپے دے کر مقدمے سے نکل گیا۔ لوگ اب بھی اُس لڑائی کا ذکر کرتے تھے مگر وجہ سب کی سمجھ سے باہر تھی۔ کرتارا اور مکھن ہمیشہ سے اکٹھے کبڈی کھیلتے تھے اور پھر اس کبڈی میں تو کوئی بات ہوئی نہ کسی معاملے نے سر اٹھایا۔ کرتارا اور مکھن ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے تھے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں۔ وہ ایک دوسرے کی موت کے کیوں پیاسے تھے یہ بات صرف نورے کھرل کو پتہ تھی۔ لڑائی کی وجہ تھی تو وہ تھی جیتو، بڈھے پنڈ والی۔

''گاڑی آنے کا وقت ہو گیا ہے فوجیا___ گھوڑے پر زین ڈالو۔'' نورے نے دھویں سے اٹھ کر چادر کو منھ کے گرد اچھی طرح لپیٹا۔ لکھن سنگھ ابھی گھر گیا تھا۔ فوجا کہنے لگا۔ ''چوہدری نور خان گھوڑے پر تم چڑھو، مجھے خراب کرے گا۔''

''اوئے ٹھیک ہے، کسی جولاہے کی اولاد۔'' نورے نے ہنس کر اونٹنی کی مہار اُسے تھما دی اور خود چھلانگ لگا کر گھوڑے پر چڑھ کر فوجے سے کہنے لگا۔ ''میری کرپان پکڑاؤ___ اور چلو نکلو۔''

فوجا اونٹنی پر سوار ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ میں مکھن کی برچھی تھی جسے آج ہی لکھن نے غلہ دان کے پیچھے سے نکالا تھا۔ دھیمی دھیمی چاندنی میں نورے کی کرپان کا پھل چمکا تو اُس نے گاؤں سے نکلتے ہی کان پر ہاتھ رکھ لیا۔

کالی تتری کمادوں نکلی
تے اڈدی نوں باز پے گیا
جگیا___ ٹر پردیس گیوں
بوہا وجیا___

دور سے گاڑی کے انجن کی آواز آئی تو نورے نے 'اچھا بھائی بگیا۔'' کہہ کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیا۔

وہ گاڑی کے آنے سے پہلے اسٹیشن پہنچنا چاہتا تھا مگر گاڑی اسٹیشن پر پہنچ چکی تھی۔ وہ اسٹیشن کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ سواریاں گاڑی سے اتر کر سڑک پر بھی پہنچ گئی تھیں۔

’’او___ مکھن سنگھا___ او___‘‘ نورے نے منھ کے گرد ہاتھوں کا بھونپو بنا کر زور سے آواز لگائی مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اُس کا گھوڑا سڑک کے بیچ کھڑا تھا اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آنے والی سواریوں کو دیکھ رہا تھا۔ تمام لوگ گذر گئے۔ آخر میں ایک لمبا تڑنگا جوان کمبل لپیٹے آ رہا تھا۔

’’مکھن سنگھ ہو؟‘‘ وہ آدمی ابھی دور ہی تھا کہ نورے نے پوچھا مگر آنے والا کچھ نہیں بولا۔ وہ گھوڑے کے نزدیک آ کر کھڑا ہوا تو نورا اتر کر کمبل والے سے بغل گیر ہو گیا، جو ہولے ہولے گھوڑے کے ماتھے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

’’خیر ہے بھائی؟‘‘

’’ہاں نوریا! تم سناؤ گاؤں کا کیا حال چال ہے؟‘‘ مکھن ابھی بھی گھوڑے کے ماتھے پر پیار کر رہا تھا۔

’’اکیلے ہی آئے ہو؟‘‘ مکھن نے پوچھا۔

’’نہیں، فوجا بھی آیا ہے۔ اونٹنی پیچھے رہ گئی ہے۔‘‘

’’اچھا تو پھر چلو___‘‘

اور وہ دونوں پیدل ہی گاؤں کی طرف چل پڑے۔ گھوڑے کی لگام نورے ہی کے ہاتھ میں تھی۔

’’جیتو کا کیا حال ہے؟‘‘ مکھن نے کمبل کو زور سے منھ کے گرد لپیٹ لیا۔

’’کل میں بڈھے پنڈ گیا تھا___‘‘

’’پھر___؟‘‘

’’پھر خیرو لوہار کی دوکان پر کرتا را ہل تیز کروا رہا تھا پوچھنے لگا: ’مکھن نے کب آنا ہے؟‘‘‘ ’’کیا کام ہے اداس ہو گئے ہو؟‘‘ میں نے اُس سے پوچھا۔ کہنے لگا۔ ’’اس کی گردن اتارنی ہے۔‘‘

’’ماں کا خصم۔‘‘ مکھن نے کرتا رے کو گالی دی اور کہا۔ ’’اور جیتو؟‘‘

’’اُس کی بات چھوڑو بھائی! وارث شاہ کہہ گیا ہے کہ وارث! عورت، فقیر، تلوار، گھوڑا یہ چاروں بکاؤ ہیں کسی کے دوست نہیں۔‘‘

’’کیا بجھارتیں ڈال رہے ہو نورے؟ جیتو تو کرتا رے پر تھوکتی بھی نہیں۔‘‘ مکھن بولا۔

’’مگر بھائی عورت اُس کی جس کے___‘‘

’’اوئے چھوڑ، مورکھ۔‘‘ مکھن نے نورے کی بات کاٹی۔

’’میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بھائی اپنی آنکھوں سے___ ایک بار نہیں۔ ہزار بار۔ کروڑ بار___ سمادھیوں والے کنوئیں پر رات کے پہلے پہر سے سحری تک۔ تم کیا باتیں کر رہے ہو!‘‘ نورے نے

جوش میں آ کر منھ پر چادر اُور مضبوطی سے لپیٹ لی۔

‘‘روز؟’’

‘‘روز۔’’

‘‘کرتارے کے ساتھ؟’’

‘‘اِس علاقے میں اُور کون مائی کا لال ہے جو تمھاری جیتو کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھ سکے۔’’ نورا بولا۔

‘‘اچھا۔’’ مکھن شاید نورے کی بات مان ہی گیا تھا۔ فوجا اُن کے پیچھے پیچھے چلتا آ رہا تھا اور وہ سڑک پر رک گئے۔ وہاں سے ایک راستہ بڈھے پنڈ کو جاتا تھا اور دوسرا اُن کے اپنے گاؤں کو۔ اُن کے گاؤں سے بڈھا پنڈ چار مربعے کے فاصلے پر تھا۔

مکھن سنگھ نے نورے سے گھوڑا اور فوجے کے ہاتھ سے برچھی پکڑ لی۔ پھر نورے سے کہنے لگا۔

‘‘تم اور فوجا اونٹنی پر گاؤں چلو، میں ذرا بڈھے پنڈ تک ہو آؤں۔’’ اور وہ گھوڑے پر چڑھ بیٹھا۔

‘‘نہیں بھائی۔ صبح جائیں گے۔’’ نورے کو پتا تھا کہ مکھن کو اس کے ارادے سے ہٹانا مشکل کام ہے مگر پھر بھی کہنے لگا۔ ‘‘کل چلیں گے بھائی__ اب تو لوگ سو چکے ہوں گے۔’’

‘‘تم جی ہلکا نہ کرو نورے۔ میں دو گھڑی جیتو کے گھر رک کر واپس آ جاؤں گا__ اور بھائی کو کہنا کہ ذرا اسٹیشن پر رک گیا ہے۔ لو پھر اللہ نگہبان__’’

اور مکھن کا گھوڑا دھول کے بادل بناتا بڈھے پنڈ والے رستے پر ہو لیا۔ نورا کھرل گاؤں کی طرف چل پڑا۔

مکھن نے بڈھے پنڈ کی سمادھیوں سے دو کھیت پہلے ہی گھوڑا روک لیا۔ سمادھیوں سے آگے دو تین کھیتوں کے فاصلے پر گاؤں تھا۔ اس نے گاؤں جانے کے لیے سمادھیوں کے بیچ کا راستہ چنا۔ وہ گھوڑے کو قدم قدم چلا رہا تھا۔ گاؤں کی طرف سے ایک کتے کے رونے کی آواز آئی۔ سردی بہت تھی۔ مڑھیوں والے کنوئیں کے پاس اگے برگد کی ٹہنیوں میں پھنسا چاند بیمار لگتا تھا مگر اُس کی دھیمی دھیمی چاندنی میں دور دراز کی چیزیں تو نہیں البتہ کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا سفید بکل والا ایک مرد مکھن کو ضرور دکھائی دے گیا۔ اُس نے آہستگی سے گھوڑا روکا اور اتر کر گھوڑا ایک درخت کے تنے سے باندھ دیا۔ بیٹھے ہوئے نوجوان کی اُس کی طرف پیٹھ تھی اور چہرہ گاؤں کی جانب۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ بائیں سمت دور کھیت میں ایک گیدڑ چیخا اور پھر دوسرا پھر تیسرا__ اور دور گاؤں کی جانب سے دو تین کتے بھونکے۔ مکھن نے پگڑی کے دو چار پیچ کھول کر ڈھاٹا اچھی طرح باندھ لیا۔ برچھی مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لی وہ ایک نہیں دو تھے۔ ایک آواز عورت کی تھی اور عورت بھی کون! وہ آواز جیتو کی تھی۔ بھلا جیتو کی آواز کے بارے میں بھی مکھن دھوکا کھا سکتا تھا۔ وہ ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اُسے عورت کی سرگوشیانہ انداز میں باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مرد نے کچھ کہا تو عورت زور سے ہنسی اور کچھ دیر ہنستی رہی۔ جب مکھن کو یقین ہو گیا کہ وہ جیتو ہی ہے تو وہ منھ ہی منھ میں

بڑبڑیا۔ ''تجھے صبح کا سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوگا کرتا رے!''

''مکھن یاد آتا ہے؟'' اُس نے مرد کو جیتو سے پوچھتے سنا۔

''ہائے ہائے __ '' جیتو بولی۔ ''اب اگر مکھن اوپر سے آجائے تو واہگورو ہی جانے وہ میرا کیا حال کرے گا؟''

''تم مکھن سے ڈرتی ہو؟'' سرگوشی ہوئی۔

''ہاں __ مگر تم'' جیتو شاید سردی کی وجہ سے مرد سے چپک کر بیٹھ گئی اور پھر کہنے لگی۔ ''تم مکھن سے نہیں ڈرتے؟ وہ بڑا حرامی ہے۔''

''اُس جیسے سورے میری لاٹھی دیکھ کر ہی ہتھیار پھینک دیتے ہیں اور پھر میں ......''

''لے بھئی، پھر تگڑا ہو جا۔'' پیچھے سے سر پر کھڑا مکھن کڑکا۔

مرد جلدی سے کرپان پکڑ کر اٹھنے لگا مگر مکھن کی برچھی اُس کی پسلیاں چیرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ مرد چکرایا پھر اُس نے گرنے سے پہلے زوردار نعرہ لگایا۔

''اوئے مکھنا __ اوئے۔''

اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح گر پڑا۔ اُس کے منہ سے چادر اتر گئی تھی۔ اُس کے سر سے پگڑی اتر کر دور جا پڑی تھی۔ چاندنی میں اُس کی اٹھی ہوئی مونچھیں گر گئیں۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر وہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ مکھن پتھر کے بت کی طرح حیران کھڑا تھا۔ سردار لکھن سنگھ رندھاوے کی لاش کے قریب ہی کھڑی جیتو کو پسینے چھوٹ گئے تھے۔ مکھن بھاگ کر گھوڑے پر چڑھا اور اس نے گھوڑے کا منہ تھانے کی طرف پھیر کر گھوڑے کو ایڑ ھ لگا دی۔

☆☆☆☆

افضل احسن رندھاوا

ترجمہ: خالد فرہاد دھاریوال

کھوئی ہوئی خوشبو

میں کون سی کہانی لکھوں؟

جب بھی میں کہانی لکھنے کے بارے میں سوچتا ہوں کتنی ہی کہانیاں مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں۔ کسی کہانی کے ہاتھ کڑی محنت سے کُھردرے ہو گئے ہیں، کسی کہانی کے بال مٹی میں مٹی ہو گئے ہیں..... کہانی کے سر پر چنری نہیں..... کہانی کا زم ملائم سا بدن جہاز کی بمباری سے چھلنی ہو گیا ہے..... کہانی کے خُوبصورت چہرے پر بارود کی سڑاندھ اور خون کے دھبے ہیں..... کہانی کا بازو کٹ گیا ہے..... کہانی کی ٹانگ نہیں..... کہانی کی آنکھیں باہر نکل آئی ہیں..... کہانی کا جسم نیپام بم کی آگ سے جُھلس گیا ہے۔

چاروں طرف دیکھتا ہوں۔ کوئی بھی کہانی مکمل نہیں ہے۔ کسی کا بھی حُسن قائم نہیں رہا ہے..... کہانی کا لبادہ بھی پورا جسم ڈھانپنے سے معذور ہے..... بدصورتی کے گہرے سائے میں ڈھکی ہوئی ہیں کہانیاں..... بدصورتی بھی تو حُسن ہے۔ اور شاعر، اور ادیب، ازل سے حُسن بانٹتا اور حُسن کی تعریف کرتا آیا ہے۔ تو میں کیوں بدصورتی کو حُسن کی جھوٹی چادر میں لپیٹ کر لوگوں کو دکھاتا رہوں۔ چادر اتار کر کیوں نہیں دکھاتا؟ لیکن اس کی بھی کیا ضرورت ہے؟ میری سبھی کہانیوں کا جنم مٹی سے ہوا ہے۔ اور ان کے پاؤں بھی مٹی پر ہی ہیں۔ ان کی بدصورتی میں بھی مٹی کا درد ہے اور یہی درد انہیں بدصورت بنا دیتا ہے۔ لیکن اب میں بدصورت لفظ نہیں لکھوں گا۔ کیوں کہ مٹی کا زخم..... مٹی کا دُکھ..... مٹی کا لمس کبھی بھی بدصورت نہیں، بل کہ خوبصورت ہے۔ مٹی انسان کی پیدائش سے پہلے بھی ایسی ہی تھی، بل کہ انسان نے مٹی کو زخم..... دُکھ..... درد اور بدصورتی بخشی ہے..... اس کی صورت دیکھے بغیر مٹی نے اسے ہمیشہ سہارا دیا ہے..... دیتی رہے گی۔ انسان، مٹی اور سہارا۔

لیکن انسان سے مٹی کا آسرا چھیننے والا کون ہے؟

مجھ سے میری پگڑی اور میرے جوتے کس نے چھینے جو میں اپنی فصل بیچ کر لایا تھا؟ فصل، جسے میں نے اپنا پسینہ بہا کر، مٹی میں ملا کر، مٹی سے پیدا کی تھی۔ کسی مشین نے نچوڑ لیا میرے اندر سے سارا خون جس کے بل

پر میں اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کے منصوبے باندھے ہوئے تھا۔ میرا پیٹ خالی کیوں ہے اور اپنا سارا خون مشین کو دے دینے کے بعد بھی میرے بچے بھوکے کیوں ہیں؟ میری مٹی پر لکیریں کس نے کھینچ دیں اور کیوں؟ جمیلہ کی خوبصورتی کو الجیریا کے کن کارناموں نے بگاڑ دیا؟ ویتنام کے ہرے بھرے جنگلوں اور چھوٹے چھوٹے مکانوں کو کس نے راکھ کا ڈھیر بنا دیا؟ صحارا ریگستان میں کیوں اور کس نے خون بہا کر ریت کو بدرنگ کر دیا؟ گوروں نے نفرت سے کالوں کو گڑھے کا بھائی سمجھ کر کیوں گڑھے میں ہی پھینک دیا؟ انسان اگر پیدائشی آزاد ہے تو پھر اسے غلام بنانے کے لیے سائنس نے اتنی ایجادات کیوں کی ہیں؟ مٹی اگر مقدس ہے تو پھر اس کے سینے کو روند کر زخمی کر کے خون بہا کر، اس کا جسم کیوں چھلنی کیا جاتا ہے؟ رب اگر آسرا ہے تو پھر انسان سے اس کا آسرا کیوں چھینا جاتا ہے؟ رب، مٹی، انسان اور آسرا اگر ایک چوکور ہے تو وہ کون سا ہاتھ ہے جو ان لکیروں کو پونچھ کر ان کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے؟ ناجی آکسفورڈ کے لہجے میں انگریزی بولتی ہے اور میرے منہ سے پنجابی بولی سن کر میری طرف موٹی شربتی آنکھوں سے سوالیہ انداز سے دیکھتی ہے:

”رب ورگا آسرا تیرا،
وسدا رہوے بھرا“

تو اسے کیا جواب دُوں؟ کہتا ہوں رب کے پاس تو اور بہت سے کام ہیں، دنیا بہت بڑی ہو گئی ہے۔ مسائل بڑھ گئے ہیں۔ وہ خالی نہیں، اور آسرا؟ آسرا کس کا اور کیسا، جب آسروں کی تعداد سے ان لوگوں کی گنتی ہزار گنا زیادہ ہے جو آسرا چھین لیتے ہیں۔

چاچا ٹہل سنگھ ٹھیک کہا کرتا تھا، ”بیٹا! ہم سبھی کہانیاں ہیں۔ لیکن ہمیں لکھنے والا کوئی نہیں۔“

ہاں چاچا ٹہل سنگھ! آپ ٹھیک کہتے تھے۔ ابھی کل کی بات ہے، جب آپ یہاں، اس ماٹی کے بیٹے کے رُوپ میں، اس مٹی سے پیدا ہوئے سونے سے موج کرتے تھے۔ یہ مٹی تمھیں لاڈلے بیٹوں کی طرح پیار کرتی تھی۔ ہوا سے بھی تیز دوڑنے والی تمھاری گھوڑیوں کی دُھوم پورے علاقے میں تھی۔ تمھارے خوبصورت ڈھور لوگ دُور دراز سے دیکھنے آتے تھے۔ تمھاری بھینسوں کے جیسی بھینسیں سارے پنجاب میں کسی کے پاس نہیں تھیں۔ تمھارے دالان، رنگین چارپائیاں اور پیڑھیاں، رنگ برنگی پھلکاریوں اور بستروں کھیسوں سے بھری ہوئی تھیں۔ تمھارے دروازے سے کوئی بھی حاجت مند خالی نہیں لوٹتا تھا۔ ایک بڑے سردار ہو کر بھی آپ اپنے نوکروں کو بیٹوں کی طرح رکھتے تھے۔ گاؤں کی بہن بیٹیوں کو اپنی بہن بیٹیاں سمجھتے تھے۔ ہر ایک کے دُکھ درد میں

آپ شریک تھے۔

بھینی صاحب گردوارے میں گُرو جی فرش پر سنگت کے ساتھ بیٹھے تھے۔ تمھاری حویلی میں سینکڑوں مہمانوں کے لیے کھانا پک رہا تھا۔ نا سمجھ لڑکے چُھپ چُھپ کر بولیاں بول رہے تھے:

''کنکاں کھان دے مارے
آ گئے نام دھاریے۔''

سارے گاؤں میں میلہ لگا ہوا تھا۔ ہم چھوٹے چھوٹے بچے گُرو کے درشنوں کے لیے گئے تھے۔ اور بھی بہت سے لوگ دور دراز سے گُرو کے درشن کے لیے آئے ہوئے تھے۔ آپ نے مجھے اور پال سنگھ کو پکڑ کر گُرو جی کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔

''یہ میرے بیٹے ہیں۔'' آپ نے کہا تھا۔ پال کا سر ننگا تھا اور اس نے چھوٹا سا جوڑا کس کر باندھا ہوا تھا۔ گُرو جی نے پہلے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تمھاری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا جیسے پوچھ رہے ہوں، دوسرا مسلمان لڑکا کون ہے؟ اور تم نے کہا تھا، ''میرے بھائی کا بیٹا ہے۔''

اور گُرو جی نے ہنس کر دونوں ہاتھوں سے میرے سر پر پیار دیا تھا اور دُعا دی تھی۔

پھر چاچا، آپ کی سُندر گھوڑی نے، جو آپ نے اس زمانے میں مہاراجہ کپورتھلا سے دس ہزار میں خریدی تھی، اس نے بڑی امیدوں اور امنگوں کے بعد ایک بچھیری کو جنم دیا تھا۔ اس بچھیری میں تمھاری جان تھی۔ مجھے بہت دیر بعد پتہ چلا کہ وہ بچھیری بہت قیمتی تھی۔ اس وقت بچھیری لگ بھگ چھ ماہ کی تھی جب میں کھیلتا کھیلتا تمھارے گھر گیا تھا۔ سونے کے دل والی چاچی نے مجھے دونوں باہنوں میں کس کر پیار کیا تھا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ ماتھا چوما تھا اور گودی میں بیٹھا لیا تھا۔ ایک روٹی کی چوری بنا کر شکر ڈال کر مجھے کھلانے لگی تھی۔ اتنے میں پال آ گیا تھا اور ہم دونوں کھیلتے کھیلتے حویلی میں آ نکلے۔ بھائی رتن سنگھ اس وقت حویلی میں تھا۔ اس کی بندریا آدمیوں کی طرح بیلنے میں گنے ڈال رہی تھی۔ بھائی سوڈا ڈال کر اُبلتے رس سے میل اُتار رہا تھا۔ (مجھے ابھی تک یاد ہے بھائی کا گُڑ سارے گاؤں میں سب سے سفید اور صاف ہوتا تھا۔) نکو عیسائی دُھونکنی سے ہوا دے رہا تھا۔ دُھونکنی کے دھوئیں اور گُڑ سے نکلنے والی بھاپ میں بھائی چُھپ سا گیا تھا۔ لیکن اس نے پال کو اور مجھے دیکھ لیا۔

''رس پی۔''

''گُڑ کھا۔''

''گنے چوس لے۔''

''بیٹھ جا.....لڑکے! بھائی کی چارپائی ذرا دھوپ میں بچھا دے۔''

بھائی رتن سنگھ نے ایک ساتھ کتنے ہی حکم مجھے دے دیے۔ لیکن میرا دھیان اس بچھیری کی طرف چلا گیا۔ میں اور پال بچھیری کے پاس جا کر اسے دیکھنے لگے۔ بچھیری بہت ہی خوبصورت لگ رہی تھی۔ پتہ نہیں کہاں سے ٹہل سنگھ آ گیا اور پتہ نہیں کس بیوقوفی میں میں اس کی گود میں چڑھ گیا۔ میں نے بچھیری پر بیٹھنے کی ضد کی۔ سات برس کے بچے میں سمجھ ہی کتنی ہوتی ہے! لیکن چاچا، آپ نے مجھے ایک بار بھی منع نہیں کیا، نہ ہی سمجھایا اور اس معصوم اور قیمتی بچھیری کو پکڑ کر، لگام کو گرہ دے کر، چھوٹی کر کے اسے لگام دے دی۔ جو آدمی جہاں تھا، حیرت سے بُت بنا رہ گیا۔ بھائی پکے ہوئے گُڑ کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ہر آدمی، چاچا تمھاری طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک بچے کی بیوقوفی کے سامنے تم بھی بچے بن گئے تھے لیکن تمھارے کاموں میں دخل دینے کی ہمت اور حوصلہ کسی میں نہیں تھا۔ پھر آپ نے کندھے سے چادر اُتار کر اُچھل رہی، ناچتی، گھبرائی ہوئی پریشان اور نڈھال بچھیری پر ڈال دی اور پھر اس معصوم نرم اور سُندر پیٹھ پر کاٹھی ڈال کر کس دی۔ آج سوچتا ہوں کہ چھ ماہ کی دودھ پیتی کومل بچھیری کی جان کے لیے اتنا ہی دُکھ اور صدمہ کافی تھا۔ لیکن چاچا، پھر آپ نے مجھے اس پر بٹھایا اور باگ پکڑ کر حویلی کے دو چکر لگوائے اور بچھیری دُکھ اور صدمے سے نڈھال ہو کر، گر پڑی اور مر گئی۔ مہاراجہ کپورتھلہ کی لاڈلی گھوڑی کی سُندر بچھیری، جسے تم نے کتنی تمناؤں اور امیدوں سے پایا تھا! لیکن تمھارے ماتھے پر ایک بھی شکن نہیں پڑی تھی، کسی نے بھی اُف تک نہیں کی تھی، سوائے میرے ابا کے جب انھوں نے سنا تو وہ ہم دونوں پر ناراض ہوئے تھے۔ لیکن آپ صرف ہنس دیے تھے۔

چاچا! آج میں بالغ ہوں۔ سیانا ہوں۔ پتھر کی طرح ٹھوکریں کھا کر گول ہو گیا ہوں۔ دنیا کا سرد گرم بھی دیکھا ہے اور آدھی دنیا کے شہر بھی دیکھے ہیں اور ان کے باسیوں کو بھی دیکھا ہے۔ انہیں پرکھنے اور سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ آج وہ باتیں خواب سی لگتی ہیں، گُم شُدہ خواب۔ کتنا بدقسمت ہوتا ہے وہ آدمی، جس کے سپنے کھو جاتے ہیں۔ آج سوچتا ہوں چاچا آپ تو میرے والد کے منہ بولے بھائی تھے۔ آپ نے اس کے ساتھ پگڑی تبدیل کی ہوئی تھی۔ آپ اس کے سگے بھائی تو نہیں تھے۔ لیکن جتنا پیار آپ نے مجھے دیا، اتنا پیار تو میرے کسی سگے چاچا نے بھی نہیں دیا۔ کہتے ہیں خون کا رشتہ بہت پرانا ہے، لیکن پھر بھی آپ مجھے سگوں سے بھی زیادہ

پیارے تھے۔ میں تمھیں تمھارے پال سے بھی بڑھ کر پیارا، زیادہ لاڈلا اور نہایت قریب کیوں تھا؟

پھر ایسی آندھی چلی جو انسان کو روند کر اور زمین کو سنسان بنا کر چلی گئی۔ راوی اور ستلج بہت بھیانک ہو گئیں اور لہریں غصے میں منہ سے جھاگ اُگلتی باہر آ گئیں۔ چاروں طرف امنڈتا ہوا پانی تھا۔ آپ نے بھری پوری حویلی اور بھرے ہوئے گھر سے، بس دو چار اشیا لیں، پھر میرے چاچے، تائے اور ابا اُس گاڑی کو برچھیوں، نیزوں اور بندوقوں کے پہرے میں لے کر چل دیے تھے۔ گاڑی پر چچی، پال، بہن، آپ اور تو تھے اور آپ کے ساتھ آپ کی حفاظت کے لیے ہم پُل تک گئے تھے۔ آپ بھی نڈھال ہو گئے تھے اور آپ کو چھوڑنے جانے والے بھی۔ راستے میں لوٹ مار، قتل، حملے وغیرہ کا ڈر۔ اور پُل پر پہنچ کر جب میرے والد اور آپ نے ایک دوسرے کو بانھوں میں بھرا تو دونوں بلک بلک کر رونے لگے۔ آپ کو ڈیرے سے، پُل سے گزرتے اور بار بار مُڑ کر پیچھے دیکھتے دیکھ کر میرے والد کیسے بچوں کی طرح بلک بلک کر روئے تھے! آپ آگے بڑھ کر بھیڑ میں کھو گئے تھے لیکن ہم شام تک کیوں پُل پر کھڑے روتے رہے تھے؟ اور آخر آپ کو کھو کر، اپنے اور آپ کے اُجڑے گھروں میں واپس لوٹ آئے تھے۔ اس وقت میں آٹھ سال کا تھا اور اب اڑتیس سال کا ہوں۔ میں نے کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی اپنے والد کو روتے نہیں دیکھا تھا، سوائے اُس دن کے۔ اب تو بس تمھارے نام پر ان کی آنکھیں بجھ جاتی ہیں۔

اور آج مکیریاں کے کسی گاؤں میں پناہ گزین ٹہل سنگھ پتہ نہیں کتنا خوش ہے؟ اور اب پتہ نہیں پال سنگھ میری طرح آدھے سفید بالوں والے سر میں اپنی روشن بادامی آنکھوں میں کوئی خواب رکھتا ہے یا نہیں؟

چاچا ٹہل سنگھ کہا کرتا تھا، ”ہم بھی کہانیاں ہیں لیکن ہمیں لکھنے والا کوئی نہیں۔“

چاچا دیکھ لو، مجھے تمھاری کہانی یاد ہے اور میں کسی دن اسے لکھوں گا بھی۔ آج تو میرے چاروں طرف کہانیاں گھیرا ڈال کر کھڑی ہیں، چاروں طرف قیامت کا شور ہے۔

میری کہانیاں لہولہان ہیں۔ ان کے سر ننگے ہیں، بال بکھرے ہوئے اور بدن زخمی ہیں۔ میرے ہاتھوں میں ٹوٹا ہوا قلم ہے اور ٹوٹا ہوا کردار ہے، جس میں، میں اپنی کہانیوں کے لیے خوشیاں لینے گھر سے نکلا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو ہیں۔ میں اپنا راستہ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ میرا حال بھی میری کہانیوں جیسا ہی ہے۔ اور میں سوچتا ہوں میں کیسے کہانی لکھوں؟

☆☆☆☆

افضل احسن رندھاوا

ترجمہ: خالد فرہاد دھاریوال

الٰہی مُہر

کہانی سنانے والا، اپنے اونگھتے ہوئے ساتھی کو محبت سے ٹہوکتے ہوئے بولا، ''قائم ہو بھائی، تمھاری باری ہے۔''

اگلے نے اندھیرے سے روشنی میں آکر اپنی بات شروع کی: ''تقریباً کوئی پانچ سو برس پرانا سچ، کل کا سچ ہی نہیں، آج کا بھی سچ ہے۔ میں پہلے کہیں کہہ چکا ہوں کہ سچ کبھی پرانا نہیں ہوتا..... سچ کبھی بُوڑھا نہیں ہوتا ..... سچ کبھی مرتا نہیں۔ سو یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ بیویاں خالی بھائیوں کو ہی جوڑتی توڑتی نہیں بلکہ ماں باپ، بھائی بہن، عزیز و اقارب کو جوڑنے توڑنے میں گھر والیوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بات مزید آگے ہے اور یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ گھروں کو گھر بھی گھر والیاں بناتی ہیں اور گھروں کی بربادی بھی گھر والیاں ہی کرتی ہیں۔ سینکڑوں کہانیاں گردش میں ہیں جہاں گھر والیوں نے گھروں کو زمیں سے اُٹھا کر آسمان کی بلندی پر پہنچا دیا۔ اور ہزاروں قصے ایسے ہیں کہ جن میں بیویوں نے ہنستے بستے گھروں کو اجاڑ کر رکھ دیا..... پستی دکھا دی..... خاک میں ملا دیا۔ کہاں تک سناؤں آپ کو؟ میری عمر سناتے ہوئے اور تمھاری سنتے ہوئے بیت جائے لیکن داستانیں ختم نہ ہوں...... میں آپ کو غمگین بھی زیادہ نہیں کرنا چاہتا۔ بہت المیہ کہانیاں سُنا کر۔ کیوں کہ دُکھوں سے تو آپ پہلے ہی گھائل ہوئے پڑے ہیں..... بات اختتام کو پہنچنے والی کروں۔ بات لامتناہی بھی میرے پاس ہے لیکن آپ کے پاس اتنا وقت اور فرصت نہیں ہوگی۔ ایک دانہ چکھ کر جیسے کسی دیگ کا پتہ نہیں لے لیتے کہ بھئی دیگ کیسی ہے؟ دیگوں میں سے کسی دیگ کا دیکھ نہ لیں ایک دانہ.....

''کام میں مصروف آدمیوں نے سہ پہر کے بعد گندم کے دو ڈھیر بنا لیے تھے۔ ہتھیلیوں سے چھانٹ کر، چھاجوں کی کنگھیوں کے ساتھ آہستہ آہستہ تھپک تھپک کر ڈھیر سنوارے۔ دونوں ڈھیروں کو کھیس کے ساتھ ڈھانپ کر کام مکمل کیا اور اگلے دن ماپنے اور بوریوں میں بھر کر ڈھونے کے پکے ارادے سے، چھاج اور جھاڑو اُٹھا کر گاؤں کی طرف چل دیے۔ ابھی اس وقت سورج زمین سے نیزہ بھر اُونچا تھا۔ پیچھے اناج کے ڈھیروں کے پاس دو ادھیڑ عمر آدمی رہ گئے، جو کام کروا رہے تھے اور مالک معلوم ہوتے تھے۔ یہ دونوں ڈھیر بہت بڑے، بھاری ایک دوسرے سے تین چار بیگھے کی دوری پر گہائی، اڈائی اور صفائی کے سبب چٹیل بنی ہوئی زمین میں گاؤں سے پچھم کی طرف پڑے ہوئے تھے۔ وہاں سے مشرق کی سمت گاؤں کی طرف کوئی آٹھ دس ایکڑ ہٹ

کر، شہتوت، نیم اور کیکر کے چھوٹے جنگل میں ایک کنواں تھا۔ جو اس وقت جُتا ہوا نہیں تھا۔ اناج کے ڈھیر سے دو ایکڑ پچھم کی طرف راستے کے کنارے شیشم کا ایک بڑا پیڑ تھا جس کے سائے میں تین مسافر نہ جانے دھوپ اور تھکاوٹ کے مارے ہوئے ستانے کے لیے آ بیٹھے تھے۔

لمبی داڑھیوں اور کھلے لباس والے یہ تینوں مسافر بڑھاپے کو پہنچے ہوئے تھے۔ جو راوی دریا کی مشرقی سمت سے مغربی کنارے پر کسی وقت آن اُترے تھے۔ اور وہاں گھومتے گھامتے دووے گاؤں کے مغرب میں اس شیشم تلے آ بیٹھے جو پکھو کے اور دووے گاؤں کی درمیانی راہگزر سے ذرہ ہٹ کر، دونوں گاؤں کے درمیان کھڑی تھی۔ بزرگ سفر کی دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے وہاں آتے ہی چھاؤں میں گھاس کا ایک ٹکڑا دیکھ کر کندھے پر رکھی چادر اتار کر بچھا دی تھی۔ لیکن پہلے دو نے تیسرے بزرگ کے منہ سر بازو ٹانگوں اور پاؤں سے گرد کو اپنی اپنی چادر کے ساتھ بڑی محبت سے صاف کیا۔ بزرگ کو چادر پر بٹھایا۔ ایک بزرگ گڑوی لے کر کنوئیں کی طرف بڑھا۔ پانی لا کر اس بوڑھے کا منہ ہاتھ دھلوایا اور پاؤں خود مل کر دھوئے۔ تھیلے میں سے پیتل کا ایک کٹورا نکالا اور پانی بھر کر بزرگ کو پلایا۔ بعد میں دونوں نے خود ٹھنڈا پانی پیا۔ ایک نے چادر اُٹھائی اور بزرگ کے پیچھے کھڑا ہو کر کپڑے سے ہوا دینے لگا۔ دوسرا بزرگ کے پاؤں میں بیٹھ کر ستانے لگا۔ گندم کا ڈھیر بننے کا کام مکمل ہوتا انھوں نے دیکھا تھا اور کام نپٹا کر مزدوروں کو گاؤں واپس جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اور اب پیچھے رہ گئے دونوں آدمی ڈھیروں کے نزدیک ایک آم کے درخت تلے بیٹھے ہوئے انھیں یہاں سے صاف نظر آ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد ڈھیروں کے پاس بیٹھے دو آدمیوں میں سے ایک گاؤں کو چل دیا۔ جب گاؤں جانے والا کافی دور جا کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو پیچھے رہ جانے والا اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کندھے پر رکھی اپنی چادر کی جھولیاں بھر بھر کر ایک ڈھیر سے دوسرے ڈھیر پر گندم ڈالنے لگا۔ بہت پھرتی اور جلدی سے اس نے ایک سو جھولیاں بھر کر ڈال لی ہوں گی۔ پھر اس نے دونوں ڈھیر، جہاں سے گندم اُٹھائی تھی، اور جہاں ڈالی گئی تھی، دوبارہ بنا سنوار دئے۔ اوپر ویسے ہی کھیس ڈال کر پہلے کی طرح ڈھانپ دئے۔ اور ستانے کے لیے دوبارہ آم کے پیڑ تلے بچھی چادر پر جا بیٹھا۔

اُدھر شیشم کے نیچے بیٹھے مسافروں نے یہ سب کچھ کُھلی آنکھوں سے دیکھا۔ ایک بزرگ بڑے بابا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا: ''بابا! چلو یہاں سے آگے کہیں کسی بہتر جگہ جا کر بیٹھتے ہیں..... یہ تو چوروں کا دیس معلوم ہوتا ہے..... دِن کی روشنی میں چوری کرتے ہیں..... دیکھ لیا نا خود اپنی آنکھوں سے.....''

بزرگ نے دایاں ہاتھ کھڑا کیا۔ حوصلے سے اپنے ہمراہی کو جواب دیا: ''بھائی! مضطرب نہیں ہوتے۔ بھید ہے کیا؟ پوری بات تو جان لیجیے۔''

''جیسی تمھاری مرضی بابا! جو آپ کا حکم۔''

اتنی دیر میں گاؤں جانے والا لوٹ آیا تھا اور آ کر پیڑ کے نیچے بچھی چادر پر بیٹھ گیا۔ تب دوسرا اُٹھ کر گاؤں کی طرف چل دیا۔ جب گاؤں جانے والا نظروں سے غائب ہو گیا تو دوسرا اُٹھا اور کندھے پر رکھی چادر سے جھولیاں بھر بھر کر گندم ایک ڈھیر سے دوسرے ڈھیر پر ڈالنے لگا۔ لیکن اس ڈھیر سے، جس ڈھیر پر پہلے نے گندم ڈالی گئی تھی۔ وہ گندم اس ڈھیر پر ڈالتا جا رہا تھا جس ڈھیر سے پہلے نے گندم اُٹھائی تھی۔ تب تک سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ دوسرے نے بھی لگ بھگ اتنی ہی گندم تبدیل کر لی جتنی پہلے نے کی تھی۔

مسافر کھلی آنکھوں سے یہ دوسری چوری دیکھ رہے تھے۔ تب بزرگ نے ساتھیوں سے پوچھا: ''دیکھا آپ نے؟ کچھ بات سمجھ میں آئی.....یا نہیں؟''

''نہیں بابا! یہ بھید آپ ہی جانتے ہیں۔ ہمارے پلے تو کوئی بات نہیں پڑی۔''

دونوں نے ہاتھ باندھ کر بزرگ کو جواب دیا۔

''اچھا!'' بزرگ نے کہا: ''اُن دونوں کو بُلا لاؤ ہمارے پاس۔''

تب تک گاؤں جانے والا آدمی واپس آ چکا تھا۔ بزرگ کا ساتھی ڈھیر والوں کے پاس پہنچا اور بولا: ''چودھریو! وہ سرا ہگور شیشم تلے، ایک صاحبِ کرامات بزرگ آیا بیٹھا ہے اور تمھیں یاد فرمایا ہے۔''

''کون بزرگ ہے؟'' ایک نے پوچھا۔

''نانک شاہ فقیر
ہندو کا گُرو، مسلمان کا پیر۔'' آنے والے نے جواب دیا۔

دونوں اُٹھے اور پیغام رساں کے ساتھ تیز قدموں سے اس شیشم کی طرف چل پڑے، جہاں بابا بیٹھا تھا۔

دونوں نے ہاتھ باندھ کر بزرگ کو پرنام کیا، رام رام بلائی۔ ان میں سے جو شخص گاؤں پہلے گیا تھا، وہ گویا ہوا: ''بابا جی! ہماری سرزمین کی خوش قسمتی یہاں آپ نے قدم رنجہ فرمایا۔ یہ ساتھ ہی ادھر ہمارا غریب سا گاؤں ہے دودے.....وہاں چل بسرام کریں، ہمارے پاس..... ہمارا مقدر جاگ اُٹھے گا۔''

''مقدر تو آپ کا جاگ رہا ہے بھائی! بہترین زمین.....میٹھا پانی اور کم گہرا.....گھی کی تاثیر والا...... اچھی کھیتی باڑی......بہتر فصل......گھر پہنچنے والی......اس سے اچھا نصیب اور کیا ہوگا جاٹ کا......ادھر آؤ! میرے پاس بیٹھو چادر پر......اور میرے بھائیوں کے سامنے اس راز سے پردہ اُٹھاؤ۔''

بزرگ نے محبت سے دونوں کاشت کار بھائیوں کو پاس بٹھا لیا۔ ساتھ ہی بزرگ آہستگی سے بُو بڑایا: ''رن پر دھاوا بولنے والے.....رن.....دھاوے۔''

''جی مہاراج!'' گاؤں سے جو پہلے لوٹا تھا وہ بولا: ''جی ہاں ہم رندھاوا جاٹ ہیں۔ آپ نے درست فرمایا۔ دریا کے آس پاس ہمارے کافی گاؤں ہیں۔''

''ہمیں معلوم ہے!'' بزرگ نے کہا: ''اب وہ بتاؤ جو ہم جاننا چاہتے ہیں۔''

وہ بولا: ''بھید تو ہمارے پاس کوئی نہیں ہے سرکار......! ہم تو غریب سے جاٹ ہیں سیدھے سادھے۔ ہم دونوں بھائی ہیں۔ ہمارے والد جنت مکیں ہونے سے پہلے ہمیں زمین بانٹ کر دے گئے تھے...... برابر ایک جیسی۔ کاشتکاری اگرچہ ہماری الگ الگ ہے لیکن مکان مشترکہ ہے۔ کنبے والے ہیں دونوں۔ خدا نے بیٹے بیٹیاں بھی عطا کیے۔ گھر اس کی رحمت سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہماری بیویوں اور اولاد کا آپس میں بہت اتفاق ہے..... میں بڑا ہوں۔ پانچ کنوؤں سے سیراب ہونے والی ہماری کھیتی اس وقت گاؤں کے چاروں طرف پھیلی ہے۔ کچھو کے والے نیک نسبی ہیں ہمارے..... اور مشترکہ ملکیت والے..... ہماری خوش قسمتی ہے اگر آپ ہمیشہ کے لیے ہمارے پاس بس جائیں..... جس طرف سے، جتنی زمین آپ کو چاہئے ہو، ہماری طرف سے بھینٹ لیجئے..... ساتھ کنواں بھی..... رہی آپ کی بھید والی انگل، ہماری تو سمجھ میں نہیں آئی..... آپ کا یہ اشارہ کدھر ہے؟ مہر کیجئے، بات خود کھول دیجئے۔''

بزرگ نے بات اطمنان سے سُنی۔ لیکن جواب میں کچھ نہیں بولے۔ البتہ چھوٹے بھائی کو، جس کا بڑے کی بات سے ان کو پتہ چلا کہ چھوٹا بھائی یہ ہے، جس نے ایک ڈھیر سے گندم دوسرے ڈھیر پر ڈالی تھی، کہا:

''بھلے آدمی! آپ بتاؤ۔ ایک ڈھیر سے آپ نے گندم دوسرے پر کیوں ڈالی؟ اپنے بھائی کے گاؤں جانے کے بعد۔۔۔۔ چوری۔''

''باباجی! آپ یہ بات پوشیدہ ہی رہنے دیتے تو آپ کی مہربانی ہوتی لیکن اگر آپ جاننا ہی چاہتے ہیں تو بات یوں ہے کہ بھئی جس ڈھیر سے میں نے گندم اٹھائی وہ میرا تھا۔ جس ڈھیر پر میں نے گندم ڈالی وہ میرے بڑے بھائی کا ہے۔ کھیتی باڑی ہماری ایک جیسی ہے، گندم بھی ہم نے برابر بوئی..... فصل ایک جیسی تھی اور پیداوار بھی یکساں ہوئی ہے میرے خیال میں۔ گندم کیوں ڈالی، میں نے اپنے ڈھیر سے دوسرے ڈھیر پر؟ کا سیدھا جواب تو یہ ہے کہ سب ڈیرہ داری کے اخراجات..... رشتہ داروں سے برتاؤ..... میل ملاقات کا خرچ اور لین دین..... سب اس کی ذمہ داری ہے۔ ہمارے منشی حساب بھی بہت درست رکھتے ہیں۔ جو بتاتے ہیں کہ میرے بڑے بھائی کے اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ ویسے میں کچھ دیتا ہوں تو وہ قبول نہیں کرتا بالکل..... میں اپنی طرف سے کچھ غلہ اس کے ڈھیر پر ڈال دیتا ہوں چھپا کر..... اس کو خسارے سے نکالنے کے لیے کم اور اپنی تسلی کے لیے زیادہ..... بس اتنی سی بات ہے۔ آپ کے مشاہدے میں آئی اور پکڑی گئی۔ نہیں تو بات چھپی رہتی۔''

''شاباش!'' بزرگ نے چھوٹے بھائی کو پیار سے تھپکی دی۔ پھر بڑے سے مخاطب ہوئے: ''اب بھئی بھلے آدمی! آپ بتاؤ..... آپ نے چھوٹے بھائی کے ڈھیر پر دانے کیوں ڈالے؟''

بڑے بھائی کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لیے بدل گیا۔ بولا: ''باباجی! آپ سے کون سی بات چھپی ہے۔ بس اتنی سی بات ہے جیسا کہ میرے چھوٹے بھائی نے بتایا، ہماری یکساں زمین، ایک جیسی فصل ہوئی۔ لیکن چھوٹا بھائی بیٹا ہی ہوتا ہے۔ خدا جانتا ہے۔ وہ مجھے بیٹے کی طرح عزیز ہے..... دوسرا اس کے اخراجات

بہت فالتو ہیں۔ وہ اچھی، قیمتی گھوڑیاں.... عمدہ بھینسیں...... بہترین گائیں...... خوبصورت اور اعلیٰ نسل کے بیل، ان جیسے پورے علاقے میں کسی کے پاس نہیں...... رکھنے کا شوقین ہے۔ کنبہ اس کا بھی میرے جتنا ہے لیکن میلے ٹھیلے میں جانے کا بہت رسیا ہے۔ اس کے منشی بتاتے ہیں کہ اس کی ہتھیلی میں چھید ہیں روپیہ پیسہ جبراً بہ نکلتا ہے۔ اس لیے میں ایسے ہی اس کی مدد کرتا رہتا ہوں..... اگر کبھی نقد دینے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ لیتا نہیں مجھ سے کچھ بھی۔“

”شاباش!“ بزرگ نے اس بار بڑے سے کہا۔ پھر اپنے ہم راہیوں سے مخاطب ہوا: ”کیوں بھئی! اب بتاؤ۔ آپ چوروں سے اٹا ہوا علاقہ کہہ رہے تھے اس خطے کو۔“

”ہم خطاکار ہیں بابا! آپ ہر چیز، ہر بھید جانتے ہیں۔ ہم کوتاہ نظر وہاں تک نہیں دیکھ سکتے، جہاں تک آپ کی نگاہ ہے۔ اس خطے کو چوروں کا علاقہ کہنا ہماری بھول تھی۔ یہ تو سخی ہیں..... بھلے مانس..... شریف لوگ۔ پیروں فقیروں کے عقیدت مند بھی ہیں معلوم ہوتا ہے..... ہماری تو درخواست ہے بابا جی! یہیں بسیرا کر لیں۔ دریا بھی نزدیک ہے۔“ بھائی بالا اور بھائی مردانہ اکٹھے روہانسی آواز میں پکارا تھے۔

بزرگ کے چہرے پر ایک روشن اور پرسکون مسکراہٹ ابھر آئی: ”صبر کرو بھائی! مجھے بات تو مکمل کرنے دو۔“

پھر بزرگ نے دونوں بھائیوں کو محبت سے دیکھا اور کہا: ”اس طرح کے نیک اعمال سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ باعثِ برکت ہوتے ہیں۔ کرتار راضی ہوتا ہے..... اب اس طرف ہی دیکھ لو کہ تمھاری نیت اچھی تھی تو دونوں کا غلہ اتنا ہی رہا، جتنا تھا۔ اگرچہ آپ نے ایک دوسرے کو اناج دیا بھی لیکن تم میں سے کسی کے بھی دانے کم تو نہ ہوئے۔“ بزرگ کے پاس بیٹھے چاروں آدمیوں نے سر ہلائے۔

”اب میں آپ کو ایک اور سچ بتاؤں، جو تمھارے سامنے ہے لیکن آپ اس کو شاید جانچتے نہیں..... وہ سچ یہ ہے کہ تمھیں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ کر رکھنے میں کرتار کے ساتھ تمھاری بیگمات کا بھی ہاتھ ہے۔ کیوں کہ بیویاں ہی یہاں پہنچ کر کنبے کی تشکیل کے ساتھ بھائیوں کو متحد رکھتی ہیں اور گھر والیاں ہی بھائیوں میں علیحدگی کرواتی ہیں..... گھروں کو بہشت یا دوزخ بناتی ہیں..... شاباش کہیے، آپ کی بیگمات کو..... کرتار، اکال پُرکھ تمہارا بھائی چارہ اور اتفاق اسی طرح قائم رکھے۔“ بزرگ نے دِل سے دعا دی۔

تب تک پکھو کے گاؤں سے دودے گاؤں کو جانے والے کچھ لوگ وہاں آ کھڑے ہوئے تھے۔ بڑے بوڑھے بتاتے ہیں کہ کرتار پور نامی گاؤں وہاں آباد ہونے کی شروعات گندم کے ان دو ڈھیروں سے ہوئی ہے۔

کہانی آگے بھی چلتی ہے لیکن ایک تو کہانی کے اگلے کچھ حصے لکھاوٹ اور مطالعے میں آ کر عوام تک پہنچ چکے ہیں۔ دوسرا وہ ہماری کہانی کے دائرے سے باہر ہیں..... جتنی اور جو کہانی میں آپ کو سُنا چکا ہوں، کبھی احاطۂ تحریر میں نہیں آئی، میرا خیال ہے..... یہ نسل در نسل سینہ بہ سینہ مجھ تک پہنچی ہے۔ جو میرے پاس آپ کی امانت تھی..... امانت..... الٰہی مُہر..... جو آپ کو میں واپس کر رہا ہوں۔

افضل احسن رندھاوا

ترجمہ: علی یاسر

اُلٹے پاؤں والی

آپ کو علم ہوگا کہ غریبی کا حُسن گاؤں کا وہ جوہڑ ہوتا ہے جس میں جس کا جب جی چاہے اپنے مویشی ہانک دے۔ غریب عورت کی جوانی لاوارث کماد کا کھیت ہوتا ہے، جس کا دل چاہے گزرتے ہوئے ایک آدھ گنا توڑے، چھوئی اتارے، سبز حصہ توڑ کر کھیت میں پھینک دے اور مزے سے گنا کھاتے ہوئے اپنا راستہ لے۔ نہ کوئی پوچھنے والا اور نہ ہی کوئی روکنے والا۔ لیکن میں نہ تو شاملات کا جوہڑ ہوں اور نہ ہی لاوارث کماد کا کھیت۔ کیوں کہ للچائی ہوئی بُری نظروں اور کھوٹے حریص دلوں والے لوگوں سے میرا محافظ طاقت ور تھا۔ بہت ہی طاقت ور۔ آج سے ہی نہیں، ازل سے ہی انسان انسان کو کھا رہا ہے۔ طاقت ور لاغر کو، زور والا کمزور کو، ظالم مظلوم کو، صاحبِ وارث، لاوارث کو۔ لیکن کیا دنیا سے سب لاغر، کمزور، مظلوم اور لاوارث ختم ہو گئے ہیں؟ نہیں! آپ کہیں گے۔ میں کہتی ہوں نہ ہی ختم ہوئے ہیں اور نہ ہی ختم ہو سکتے ہیں۔ جانتے ہیں کیوں؟۔ نیلی چھت والے کی وجہ سے۔ ہنسنے کی بات نہیں، ماننے کی ہے۔ نیلی چھت والا (خدا) آپ تو نیچے اتر کر طاقت ور کے ہاتھ سے کاٹنے والا لاٹو کر نہیں چھینتا لیکن وہ کمزور کو حوصلہ اور طاقت دے دیتا ہے۔ جوں جوں کمزوروں کو کاٹا جاتا ہے توں توں ان کے جسموں کی ٹہنیاں مزید پھوٹتی جاتی ہیں، بڑھتی جاتی ہیں۔ مزید توانا اور طاقت ور ہوتی جاتی ہیں۔ پہلے سے زیادہ۔ مانیں تو یہی وجہ ہے کہ دنیا سے کبھی بھی طاقت وروں، زور آوروں، ظالموں اور وارث والوں سے لاغر، کمزور، مظلوم اور بے وارث ختم نہیں ہوئے اور نہ ہی ہو سکتے ہیں۔ آپ تو پڑھے لکھے ہیں! میری باتیں سمجھ رہے ہیں ناں؟۔ وہی نیلی چھت والا میرا محافظ ہے اور ہمیشہ سے تھا۔

اُلٹے پاؤں والی نظریں نیچی کیے باتیں کر رہی تھی۔ ساون کا بادل برس چکا تو دوپہر کو سورج آگ برسانے لگا۔ میں نے تین میل کا سفر طے کر لیا تھا اور ابھی دو میل مزید سفر باقی تھا۔ سانس لینے کے لیے اور دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے پکے تھڑے والے برگد کے درخت کی چھاؤں میں جا بیٹھا کیوں کہ دور دور تک سڑک پر کہیں سایہ نہیں تھا۔ سامنے اُلٹے پاؤں والی نے اپنی گٹھڑی کھول کے رکھ دی۔ وہ سورج ڈھلنے کے انتظار میں برگد کی گھنی چھاؤں میں دھوپ سے چھپ کر بیٹھی تھی۔ وہ میرے ساتھ والے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اس وقت میں اور الٹے پاؤں والی اپنے سفر، رستے اور دھوپ سے مجبور، نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ہی کشتی

کے سوار تھے۔ اُس وقت میرے اور اُس کے یہ تین دکھ تو مشترک تھے لیکن اس مشترک مصیبت کے باعث اس وقت پہلے کی طرح میرا دل ادھر اُدھر سے نکل بھاگنے کو نہ چاہا۔ نہ ہی اُس پکی جگہ پر وہ مجھے ڈائن، چڑیل، اُلٹے پاؤں والی، بچے کھانے والی یا شوہر کش لگی۔ اُس کے یہی سب نام تھے۔ لوگوں کو اس کا اصل نام تو کب کا بھول چکا تھا۔ لوگ اُس سے ایسے بچتے جیسے وہ واقعی چڑیل ہو۔ میں بچپن سے ہی اس سے بہت ڈرتا تھا۔ ویسے بھی سبھی مائیں اپنے بچوں کو اُس کی نظروں سے بچائے رکھتیں۔ بوڑھے بزرگ، جوان لوگوں کو اس کا آمنا سامنا کرنے سے روکتے اور اس کا راستہ چھوڑ دینے کی تلقین کرتے۔ لڑکیاں بالیاں، حسینائیں، سہاگنیں اس سے منہ موڑ کر گزر جاتیں۔ اگر لوگوں کا بس چلتا تو وہ اپنے مال مویشی بھی اُلٹے پاؤں والی کی آنکھوں سے دور رکھتے۔ لیکن اُس وقت اُس اشتراک کی وجہ سے وہ مجھے شہتوت کے تنے جیسی سیدھی لیکن اندر سے شیشم جیسی سخت اور مضبوط، سیاہ اور موٹی لیکن اداس آنکھوں والی، بھرپور حسین عورت لگی۔ اگرچہ اس کا خوبصورت چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا اور اُس کی نگاہیں میرے جسم سے گزرتی ہوئی ڈرانے والی تھیں لیکن پھر بھی اُس سخت دوپہر، اُس پکے تھڑے پر، اُس کے قریب اپنے کندھے والی چادر بچھا کر اُس کے اِس درجہ قریب لیٹا ہوا میں اُس سے بالکل خوفزدہ نہیں ہوا۔ اُس کے ہونٹوں پر ہمیشہ سے پڑے ہوئے خاموشی کے قفل اپنے آپ ہی کھلتے گئے اور اُس کا سنبھالا ہوا کرب لفظوں کے راستے باہر آ گیا۔ اُس پُراسرار راز کو جاننے کے لیے میں ایک بائیس سالہ جوان لڑکا، جس کا سارا جسم مٹی کی خوشبو سے مہک رہا تھا، اُس ڈائن سے اپنا کلیجہ نکلوانے کے لیے تیار تھا۔ نہ جانے اُس دن مجھ میں اتنا حوصلہ اور جرأت کہاں سے آ گئی؟ میری اس جرأت پر تو اُس کی حسین آنکھوں میں بھی حیرت کے پھول کھل اٹھے۔ اس سارے علاقے میں کوئی بھی اُس کے اس قدر نزدیک بیٹھنے کا حوصلہ رکھنے والا نہیں تھا۔ وہ ڈائن بھی نہیں تھی اور اس کے پاؤں بھی اُلٹے نہیں تھے۔ لیکن اردگرد کے سبھی دیہات کے لوگ قسم کھانے کو تیار تھے کہ وہ ڈائن ہے اور اُس نے مرنے والے کئی لوگوں اور مویشیوں کا کلیجہ نکال لیا تھا۔

وہ کہنے لگی ”آپ نئے علوم پڑھنے والے اور نئی روشنی میں اشیا کو دیکھنے پرکھنے والے ہیں۔ آپ تو-----“

”نئے علم پڑھنے اور نئی روشنیوں میں اشیا کو دیکھنے سے اپنے وسوسوں کے بیچ کی لکیریں تو چھوڑی نہیں جا سکتیں بی بی!“ میں نے کہا۔

میرے اسے بی بی کہنے پر ایک مرتبہ تو اس کے چہرے پر خوبصورت گلاب کا پھول کھل اٹھا لیکن وہ آہ بھر کے بولی ”ٹھیک ہے بات لکیر کو چھوڑنے کی نہیں۔ ایک پڑھا لکھا انسان سچ اور جھوٹ کا امتیاز کر سکتا ہے یا نہیں؟ میں تو آپ کو یہ امتیاز کرنے کا کہتی ہوں۔ میں کر سکتی ہوتی تو کر ہی نہ دیتی؟ یوں ڈائن، اُلٹے پاؤں والی اور منحوس تو نہ کہلاتی، بل کہ کسی شریف گھر میں چودھرانی بن کے بس رہی ہوتی۔ آپ میری پوری بات سن لیں پھر جو دل چاہے فیصلہ کریں۔ آپ کا درست یا غلط فیصلہ میرا نہ ہی کچھ سنوار سکتا ہے اور نہ ہی بگاڑ سکتا ہے۔

کیوں کہ اشیا علاج کی حد سے بہت آگے گزر چکی ہیں"۔

"بی بی آپ بات کریں! اب میں درمیان میں نہیں بولتا" میں نے کہا۔ اُس کی نگاہیں مجھ میں گھستی جا رہی تھیں۔ اُس کے سارے وجود میں سے ایک جھرجھری گزر گئی۔ نہ جانے دہشت سے یا اس کے بیچ کی خنکی سے۔

"میری ماں بھی ایک الٹے پاؤں والی ڈائن تھی۔ کیوں کہ وہ بھی انتہائی حسین وجمیل تھی لیکن نصیب نے اسے ایک نکھٹو اور گھٹنوں سے معذور عملی کے پلے باندھ دیا تھا۔ وہ بیاہ کر اس گاؤں میں آئی جس کی میں بیٹی ہوں۔ میرا گاؤں!! کبھی اپنے گاؤں اپنی بیٹیوں کو ایسے بھی برباد کرتے ہیں جس طرح میرے گاؤں نے مجھے کیا؟۔ بات میری نہیں، اپنی ماں کی بات کرتی ہوں کیوں کہ اس کی بات سے ہی میرا نصیب بندھا ہوا ہے۔ میری ماں انتہائی خوبصورت، جوان اور پریوں جیسی تھی لیکن میرے باپ عملی کو تو اپنی افیم کی گولی کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔

گاؤں کی بیٹی ہو یا بہو، اپنے گھر کے حصار میں قید ہو کر تو عمر نہیں گزار سکتی۔ اسے سو کام کاج سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ لوگ مری ماں کے حُسن اور میرے باپ عملی کی خوش نصیبی کی باتیں کرنے لگے تھے۔ گاؤں کی بہن بیٹی سبھی کی بہن بیٹی کا ہی درجہ رکھتی ہے اور بہو کو بھی بیٹی ہی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن برائی، جھوٹ اور ہوس کس گاؤں میں نہیں رہتے؟ میری ماں کی نگاہیں کچھ اونچی ہوئیں تو عملی کی بیوی جان کر کچھ گبھرو جوان لڑکے اس پر ترس بھی کھانے لگے۔ لیکن میری ماں ایک شریف، نیک اور بہادر عورت تھی۔

لیکن ایک دن جب میری عمر تین برس تھی، اس گاؤں کے تیسرے حصے کے مالک ایک زورآور جوان نے میری ماں کو شاملات کا جوہڑ بنانے کا جتن کیا۔ میری ماں گاؤں کے شاملات کا جوہڑ تو نہ بنی بل کہ اس نے دلیری کے ساتھ اسی زورآور کے کنوئیں میں چھلانگ مار کر اپنی عزت بچائی اور جان دے دی۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے، لیکن اگر اس نے مرنا ہی تھا تو مجھے کیوں اس دوزخ میں چھوڑ گئی؟۔ اس نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر کیوں چھلانگ نہ لگائی؟ اور اپنی ماں کی اس بھول یا خطا کو میں کبھی معاف نہیں کر سکتی"۔

وہ لمحہ بھر کو خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھیں تھڑے کی پکی مٹی میں نظر آنے والے کنکروں اور ٹھیکریوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی بکھری ہوئی پریشان زلفیں اپنے سیاہ دوپٹے میں چھپائیں اور کہنے لگی "بات ایک طاقت ور آدمی کی تھی اس لیے کسی نے بھی میرے کمزور باپ کا ساتھ نہ دیا۔ سارے گاؤں نے یہ کہہ کر معاملہ دبا دیا کہ اس قدر نکھٹو، ناکارہ اور ادھیڑ عمر عملی کے ساتھ ایک جوان جہان انتہائی حسین عورت کب تک گزارا کرتی؟ کنوئیں میں چھلانگ نہ لگاتی تو اور کیا کرتی؟۔ اس وقت میں تین برس کی تھی اور میرے ساتویں برس تک پہنچتے میرے باپ عملی کو اس کی افیم نے کھا لیا اور میں اس بھرے، بستے جہان میں تنہا رہ گئی۔ لاوارث، بالکل لاوارث۔ پھر اسی طاقت ور آدمی نے مجھے بیٹی بنا کر ساری برادری کے سامنے گودی لے لیا اور خدا گواہ ہے کہ

اس نے مجھے بیٹیوں کی طرح ہی پالا۔ تیرہ برس بعد جب مجھے میرا ہی کرتہ تنگ ہونے لگا تو اس نے بہت سا جہیز دے کر میرا ہاتھ اپنے ہی گاؤں کے رکھے کے ہاتھ میں دے دیا۔ رکھا ویسے تو خوبصورت، اچھے ڈیل ڈول والا اور قد آور جوان تھا لیکن صاحب حیثیت نہ تھا۔ میرا باپ اپنی دو چار ایکڑ زمین تو افیم کی نذر کر گیا تھا لیکن جس نے مجھے بیٹی بنا کر پالا تھا، اس نے جہیز میں ڈھیر سارا سامان، مال مویشی اور آٹھ دس ایکڑ زمین بھی دی جس سے رکھے کی غربت دور ہو گئی۔ میں سچ میں خود کو ایک خوش نصیب چودھرائی سمجھنے لگی۔ رکھے کے تو خوشی سے زمین پر پاؤں ہی نہ پڑتے تھے۔ شادی کے تیسرے برس اللہ نے ہمیں چاند سا بیٹا بھی عطا کیا۔ رکھا سارا سارا دن بچے کو اٹھائے بے تکان پھرتا رہتا۔ لیکن ہمیں دنیا کی نظرِ بد کھا گئی۔ میرے اور رکھے کے درمیان نہ جانے کیسی دیواریں کھڑی ہو گئیں؟ نہ جانے کیوں دنیا کی زبانوں کے ناگ ہمارے اچھے دنوں کو ڈس گئے؟ رکھا مجھ سے دور ہوتا جاتا تھا لیکن میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ نہ جانے لوگ رکھے کے کانوں میں کون سا نیا سچ انڈیلنے لگے۔

”پھر آخر کار ایک رات رکھا شراب کے نشے میں اندھا ہو کر گھر لوٹا تو اس نے اپنے اندر کا سارا زہر، جو دنیا نے اس کے لہو میں شامل کر دیا تھا، اپنے اندر سے نکال کر میرے منہ پر دے مارا۔ اس نے سیدھا میری ماں کی کردار کشی کی اور مجھے میرے باپ عملی کی بیٹی ہونے سے انکار کر دیا اور جس آدمی سے میری ماں نے عزت بچاتے ہوئے جان دے دی تھی جب میں تین برس کی تھی، مجھے اس آدمی کی بیٹی بنا دیا۔ میری ماں کو دی جانے والی یہ گالی اور اتنا بڑا جھوٹ سن کر اور ماں کے سفید دوپٹے پر بدنما داغ دیکھ کر میں اپنے آپے میں نہ رہ سکی۔ میں اپنے مجازی خدا کے سامنے چپ نہ رہ سکی اور اکڑ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اندھا رکھا، غصے میں اور اندھا ہو گیا۔ چولھے سے جلتی ہوئی لکڑی پکڑ کر اس نے مجھے روئی کی طرح دُھن کر رکھ دیا۔ مجھے ہوش نہیں کہ اس نے مجھے کس قدر پیٹا لیکن یہ یاد ہے کہ وہی لکڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر قریب ہی چارپائی پر لیٹے بچے کے سر میں جا لگی۔ میرے بیٹے کے سر سے لہو کا فوارہ ابل پڑا۔ اس سے قبل کہ میں اپنے لال کو سینے سے لگاتی، وہ پھول اپنا آخری سانس لے کر مرجھا گیا۔ میں نڈھال، ہاری ہوئی اسے اسی چارپائی پر لٹا چکی تھی۔ اب کیا باقی رہ گیا تھا؟ کپکپاتا ہوا اندھا بہرا رکھا، میرے لال کی لاش اور میں لاچار۔ میری آنکھوں کے آگے ایک دھندی چھا گئی اور میرے دماغ کو چڑھ گئی۔ میں زمین پر گرنے لگی تھی مگر نہ جانے کیسے میرے لہو کی ساری طاقت میرے ہاتھوں میں آ گئی اور اسی لکڑی سے میں نے سامنے کھڑے رکھے کا سر کچل ڈالا۔ ایک پل میں ہی میرے مجازی خدا کی لاش بھی میرے لال کی چارپائی پر آ گری۔ بیٹے تو ہمیشہ اپنی ماں پر قربان ہوتے آئے ہیں اور میرا تین برس کا لال بھی اپنی ماں پر قربان ہو گیا۔ لیکن کیا کبھی بیٹیوں نے بھی اپنے مجازی خدا کو اپنی مری ہوئی ماؤں پر قربان کیا ہے؟ مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔ میں نے آج تک اس بارے میں لاکھوں مرتبہ سوچا ہے لیکن ایک مرتبہ بھی مجھے اپنی کرنی پر پچھتاوا یا افسوس نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ بھی مجھے اپنے اس عمل پر پچھتانا نہیں پڑا“۔

وہ خاموش ہو گئی۔ میں پہلی بار سچ کے اس خواب کے سیلاب میں بھیگ کر نکلا۔ پہلے تو اور ہی کہانیاں سنیں

تھیں۔۔۔۔تھڑا اجاڑ اور سنسان تھا۔ دوپہر اسی طرح آگ برسا رہی تھی۔ نہ ہی میرے اندر پکے تھڑے کا ماضی کا کوئی خوف رہ گیا تھا اور نہ ہی پاس بیٹھی الٹے پاؤں والی کی میرے بدن پر کوئی دہشت تھی۔ اس کا پتھر جیسا سخت چہرہ مجھے موم جیسا نرم لگ رہا تھا اور اس کی تیز، تیکھی اور اندر تک چبھ جانے والی آنکھیں امن، شانتی، گداز اور پیار کے سمندر محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے میری طرف بڑی اپنائیت سے دیکھا۔ میں نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا:

"لیکن بی بی! ایک اور آدمی بھی تو تمھاری ماں کا قصوروار تھا؟"

"ہاں! الٹے پاؤں والی نے جیسے فیصلہ میرے چہرے پر پڑھ لیا تھا۔ بڑے حوصلے سے کہنے لگی۔ "ایک برے عمل کے پچھتاوے اور افسوس میں اس نے تیرہ برس میرا باپ بن کر مجھے پیار دیا اور میرے جیسی لاوارث کے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے شاملات کا جوہڑ اور لاوارث کماد کا کھیت بننے سے بچائے رکھا۔ کیا اس کی اتنی بڑی نیکی کے بدلے میں اسے اس کی جوانی کی ایک بھول بھی معاف نہیں کر سکتی؟ اس نے میری ماں کی جان تو لے لی لیکن اگر اس نے میری ماں کی عزت لے لی ہوتی تو نیلی چھت والے کی قسم، میں اس کا سر بھی اتار دیتی۔ کیوں کہ کسی کی عزت لوٹنا کسی کی جان لینے سے بڑا گناہ اور بڑا جرم ہے"۔

"ٹھیک ہے!"۔ میں اور کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

☆☆☆☆

محمد حمید شاہد

جلیل عالی، قلبِ غزل سے قلبیہ تک

یہ راجندر سنگھ بیدی کے ان دنوں کا قصہ ہے جب اس پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ علاج معالجے کے لیے پرانا مکان بک گیا اور وہ کھار میں اُٹھ آیا۔ یادداشت بھی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ باقر مہدی، کہ جس پر اشک نے ''شب خون'' میں بیدی کے 'جیبی ناقد' ہونے کی پھبتی کس رکھی تھی، اس کی یادداشت واپس لانے کے کھیکھن کر رہا تھا۔ وہ پرانی باتوں اور بیدی کے افسانوں کے جملوں کو ایک کاغذ کے پرزے پر لکھ کر لاتا، بیدی کو وہیل چیئر پر بٹھا کر ادھر ادھر گھماتا اور ساتھ ہی ساتھ، کسی افسانے کا جملہ، کوئی پرانی بات اُسی پرزے سے الگ کر کے اس کی سماعت پر دھیرے سے بچھا دیا کرتا کہ وہ کہیں پڑھ چکا تھا' پرانی باتیں یاد کرنے سے حواس قائم ہو جاتے ہیں۔

صاحب، قصہ یہ ہے کہ ہم بہ حیثیت مجموعی بیدی کی طرح اپنے حواس میں نہیں ہیں، ہمارا بہت کچھ بک چکا۔ وہ ساری اجتماعی وابستگیاں اور تہذیبی ورثہ جو کل تک ہمارے لیے دستار فضیلت تھا، غیروں کے ایجنڈے کے تندر یلے میں بہے جاتا ہے۔ ایسے میں اپنے بھی دشمن کا سا کام کیے دیتے ہیں۔ جلیل عالی نے ایسے ہی بخت ماروں کے بارے میں کہہ رکھا ہے:

میرے دشمن کو ضرورت نہیں کچھ کرنے کی
اُس سے اچھا تو میرے یار کیے جاتے ہیں

ایسے دل اکھیڑ دینے والے منظر نامے میں، کہ ساری قوم دُبدھے میں پڑی ہوئی ہے، ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن لیے جانے والے چند ادیب اور شاعر ایسے بھی ہیں جو کسی بھی پھبتی کو دھیان میں لائے بغیر ہمیں قومی سطح پر اپنے حواس میں لانے کے جتن کر رہے ہیں۔ عین آغاز ہی میں مجھے اعتراف کرنا ہوگا کہ جلیل عالی کا شمار اسی قبیلے کے نمایاں ترین شاعروں میں ہوتا ہے:

بہشتِ شوق پہ بارود بارشوں کے ہیں دن
سو حرف حرف کو شعلہ مثال کر دیا ہے

یہ جو عالی نے حرفوں کو شعلہ مثال کر لینے والی بات کہی ہے، یہ کہیں اس کے قاری کو گمراہ نہ کر دے، اس

لیے یہیں وضاحت ضروری ہو جاتی ہے کہ عالی کا تخلیقی قرینہ وہ نہیں ہے جس میں الفاظ، استعارہ ہونے، علامت بننے یا شعر میں ڈھلنے کے تکلف میں پڑے بغیر شعلوں کی طرح بھڑکنے لگتے تھے۔ اُس نے اپنے تخلیقی چلن کا اعلان کچھ یوں کر رکھا ہے:

طلسمِ عکس و صدا سے نکلے تو دِل نے جانا
یہ حرف کچھ کہہ رہے ہیں عرضِ ہنر سے آگے

آگے چل کر وہ مزید کہتا ہے:

کوئی دُھن ہے پسِ اظہار سفر میں جس نے
میری غزلوں کی فضا اور سی رکھی ہوئی ہے

تو بات یوں سمجھ میں آتی ہے کہ وہ سارے فکری مسائل جن سے بظاہر عمر بھر عالی پیوست رہا ایک اور مرتبہ وجود پر کہ جہاں عکس عکس نہیں رہتا اور صدا صدا نہیں رہتی سب کچھ اتنا لطیف اور سُبک ہو جاتا ہے کہ عرض ہنر کا علاقہ کہیں پیچھے رہ جایا کرتا ہے، وہی عالی کے تخلیقی وجود کا آغازیہ بھی ہے اور وہی اس کے تخلیقی مزاج کے لیے فضا بھی باندھتا ہے۔ بندھے بندھائے وقت سے باہر رواں یہ لحہ لحہ وقت وہی ہے جس کی بابت ایلیٹ نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا کہ یہ لحہ زماں کے اندر بھی ہے اور ماورائے زماں بھی۔ وقت کی کائنات سے آگے سفر کرتا ہوا لحہ۔ عالی اس لمحے کی گرفت میں آتا ہے تو طلسم عکس وصدا کو جھٹک دیتا ہے۔ اُس کی اسی ادا کی عطا ہے کہ اُس کے ہاں فکری التزام کے باوجود تخلیقی قرینے مات نہیں کھاتے ہیں۔

تخلیقی قرینوں کی بات چل نکلی ہے تو کہتا چلوں کہ عالی 'شوق ستارہ'، ''خواب دریچہ' اور ''عرضِ ہنر سے آگے'' سے بعد کی تخلیقات میں اپنے ڈھنگ سے مرکبات بنا لینے کا چلن اختیار کیے ہوئے ہے۔ وہ مصرع بناتے ہوئے لفظوں کی نشست برخاست اور مصرع کے اندر اُن کی ترتیب سے متشکل ہونے والی صوتیاتی نظام پر بھی پوری توجہ دیا کرتا ہے اور اس قرینے سے اس کے ہاں ایک الگ سی فضا اور آہنگ بن جاتا ہے۔ مرکبات بنانے کی دو مثالیں ایک شعر میں یک جا ہو گئی ہیں۔ لیجیے پہلے وہی نشان زد کیے دیتا ہوں:

شوق راہوں میں جھپکتا نہیں دل آنکھوں کو
اس مسافت کے پڑاؤ بھی سفر بنتے ہیں

لطف یہ ہے کہ ''شوق راہوں' اور ''دل آنکھوں' جیسے توجہ لے لینے والے مرکبات کے ہوتے ہوئے مسافت کے 'پڑاؤ کا سفر بننے' والا وقوعہ توجہ سے منہا نہیں ہوتا، خیال کے عین مرکز میں پوری طرح مقیم رہتا ہے۔ ایک اور غزل کا شعر دیکھیے لفظوں کی ترتیب بدل کر ترکیب کو اضافت کے اضافی بوجھ سے آزاد کرا لیا گیا ہے۔ مگر یہاں بھی کچھ ایسا اہتمام ہوا ہے کہ کسی عُجب کی بجائے تازگی کا احساس جی اٹھتا ہے۔

احساس کی دنیا کے اصول اور ہیں پیارے
دِل شہر میں دیکھا، ترا سکہ نہ چلا، ہنا

آپ اتفاق کریں گے کہ شعر پڑھتے ہوئے ”دل شہر“ کی تازگی جہاں توجہ کھینچتی ہے [کہ ایسا ’شہرِ دِل‘ جیسی سامنے کی مگر بوسیدہ ہو جانے والی ترکیب سے کہاں ممکن تھا] وہیں وہ معنیاتی سلسلہ بھی نظر میں رہتا ہے جو ایک تلمیح سے جڑ کر زمانوں کے بھید دل سے وابستہ کر دیتا ہے۔ مصرع ثانی میں لفظ ”دیکھا“ کے استعمال نے جس طرح ایک خاص لہجہ بنا دیا ہے، یہ بجائے خود بہت پُر لطف ہو گیا ہے۔

یہ جو عالی کے بات کہنے کا الگ ڈھنگ ہے، خود عالی کو بھی اس کی آگہی ہے تبھی تو اس نے ”وہ“ کے صیغے میں اپنے لیے یہ کہہ رکھا ہے:

وہ بات کہتا ہے کچھ ایسے اہتمام کے ساتھ
کہ نقش سب کے دلوں پہ جدا جدا بیٹھے

یہاں جس سلیقے سے ایک بات کا نقش ہر ایک دل پر جدا جدا بیٹھا ہے، شعر پڑھتے ہوئے اس کی باقاعدہ تصویر بنتی چلی جاتی ہے۔ یہ تصویر شعر پڑھ چکنے کے بعد ذہن سے محو ہو کر تلف نہیں ہوتی، پس شعور رچ جاتی ہے۔

میں نے اوپر عالی کے صوتی قرینے کی طرف اشارہ کیا تھا، یہاں موقع نکل آیا ہے کہ اس باب میں بھی ایک ڈیڑھ مثال دیتا چلوں۔ جو غزل میں نے مثال کے لیے چنی، وہ معنیاتی سطح پر بھی اس لائق ہے کہ اس پر توجہ دی جائے تاہم فی الحال میں صوتی قرینے کی بات کر رہا ہوں لہٰذا اس مرحلے میں صرف اسی حد میں رہوں گا۔ اس غزل کے دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں ”ک“ کی تکرار میں ”ق“ بھی شامل ہو گیا ہے:

کڑیاں کڑی قیود کی بڑھتی چلی گئیں

اسی طرح اسی غزل کے چوتھے شعر کے پہلے مصرع میں ”س“، ”ص“ اور ”ث“ نے متصل حروف میں آ کر یہی وظیفہ سر انجام دیا ہے:

کس صورتِ ثبات پہ ٹھہری نگاہ دِل

آپ کو ممکن ہے ”س“ اور ”ص“ کا اتصال کھٹکے مگر اس صوت نے بھی مجھے مزہ دیا ہے۔ جس شعر کا یہ مصرع ہے وہ مکمل شعر بھی عجب سرشاری سے گزرتا ہے، میں اپنی بات کہنے کی دھن میں اس سرشاری سے کیسے دست کش ہو سکتا ہوں۔

کس صورتِ ثبات پہ ٹھہری نگاہِ دِل
اک رقصِ رَو میں ٹوٹتے بنتے چلے گئے

یہ جو میں، عالی کے فن کی بظاہر چھوٹی چھوٹی مثالیں دے رہا ہوں، ایسی اس کے ہاں درجنوں ہیں۔ اور مان لینا چاہیے کہ ایسے ہی قرینوں سے عالی کے ہاں شعر کا خارجی آہنگ بنتا ہے۔ تاہم عالی اسی پر اکتفا نہیں کرتا، وہ اس سے کچھ آگے بڑھ کر، بل کہ بہت آگے نکل کر ایک عجب فکری سرمستی سے تخلیق کے جمالیاتی علاقے میں جست لگا دیتا ہے۔

آتی رہتی ہیں عجب عکس و صدا کی لہریں
میرے حصے کی کہیں شاعری رکھی ہوئی ہے

غزل کا یہی ڈھب عالی کو اپنے ہم عصروں سے مختلف اور ممتاز کرتا ہے۔ ایسا عالی کی مربوط فکریات اور نظریاتی استقامت کے باعث ممکن ہو پایا ہے۔ اسی استقامت کا اعجاز ہے کہ اس کے ہاں غزل کا باقاعدہ ایک اسلوب بن گیا ہے۔ ایسا اسلوب ہر بدلتے منظر کے ساتھ نئی فکری حیلے کرنے والوں کا مقدر نہیں ہو سکتا، نہ ان لوگوں کے حصے میں آ سکتا ہے جو زبان کی تہذیبی توفیقات سے آگاہ نہیں ہوتے۔

میں، عالی کے ہاں، جس اسلوب کی بات کر رہا ہوں، اس کی فوری مثال کے لیے اور کہیں کیوں جاؤں کہ وہی اوپر والا "رقصِ رو" والا شعر توجہ کھینچ رہا ہے۔ ایک فکری اور تخلیقی رقصِ رو میں رہنے کی وجہ سے عالی کے ہاں نئے نئے جمالیاتی پیکر جھلک دینے لگتے ہیں اور پھر ان کا کسی اور پیکر میں ڈھل جانا بھی زندگی بھر کے اسی وظیفے سے ممکن ہو پایا ہے۔ جی، میں نے زندگی بھر کا وظیفہ کہا ہے۔ اور میرا ایمان ہے کہ جب تک کوئی دھن کسی کے من میں سما کر اس کی زندگی کا رخ متعین نہیں کر دیتی اس کے ہاں کسی اسلوب کی صورت نہیں بنتی۔ عالی کے ہاں یہ صورت بنی ہے اور خوب بنی ہے، یوں کہ اس کا مصرع مصرع لو دینے لگتا ہے۔

اُس کی دُھن ہو تو عجب شام و سحر بنتے ہیں
اک نہیں دل میں کئی خواب نگر بنتے ہیں

ہم کہ اک اسم کے سائے میں رواں ہیں ورنہ
اس گماں زار میں سو رنگ کے ڈر بنتے ہیں

ایک اسم کے سائے میں اپنے خواب نگر کی جانب ہر دم رواں رہنے والے نڈر عالی نے سامراج کے حیلوں اور قومی سطح پر اپنی نارسائیوں کے ساتھ ساتھ اس کے تمام امکانات کو بھی دردِ دل رکھنے والے ایک مفکر کی طرح نگاہ میں رکھا ہے اور جو بھی کہنا چاہا بے درنگ کہہ دیا ہے۔

تمھارے فقر کے تو بڑے چرچے تھے تم بھی
سگِ دنیا ہی ٹھہرے حریصِ جاہ نکلے

جس شخص کی دُھن میں ہوئے ہم دھول، ملا تو
دیکھا کہ کسی اور کی راہ دیکھ رہا ہے

جنہوں نے غم کشوں کو بغاوت پہ ابھارا
وہ صف آرائیوں میں حلیف شاہ نکلے

وہ جو آزاد فضا میں بھی پر افشاں نہ ہوئے
ان پرندوں نے بھلا جال میں کیا کرنا ہے

دور دیسوں کی سپاہ آگئی ہر ناکے پر
امن کے نام پہ کیا کیا نہیں ہونے والا

اپنے پورے تہذیبی شعور کے ساتھ عصری حسیت سے اس شدت کے ساتھ جڑا ہوا شاعر صرف وہی ہوسکتا ہے جو اس عصر میں زندہ ہو اور پورے تخلیقی وجود کے ساتھ زندہ ہو۔ وقت کی ایک ایک جنبش کو اپنے دل پر محسوس کرتا ہو، آنے والے لمحوں کی چاپ سنتا ہو اور درست درست آنک سکتا ہو کہ اگلا قدم کہاں دھرنا ہے۔ جلیل عالی نے رواں وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا ہوا ہے اور اس لمحے سے بھی جڑا ہوا ہے جو اس وقت سے آگے نکل کر اس کی راہ نمائی کر رہا ہے۔ عین اسی دوران وہ قومی منظر نامے پر ہونے والے عاقبت نااندیشوں کے تماشے کو بھی دیکھتا ہے۔ وہ نفرت سے انہیں دیکھتا ہے جنھیں روحانی سطح پر رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینا تھا مگر وہ حریص جاہ ہو کر سگِ دنیا بن گئے اور تاسف سے انہیں بھی دیکھتا ہے کہ جو ایک زمانے میں غم کشوں کو بغاوت پر ابھارا کرتے تھے اور جو موسم بدلتے ہی سامراج کے حلیف ہو گئے ہیں۔ اگرچہ اس کا ایقان ہے کہ قومی سطح پر جمہور کے فیصلے نادرست نہیں ہوتے تاہم وہ یہ دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ وہ پرندے جو آزاد فضا میں بھی پر افشاں نہ ہو سکے وہ سامراجیت کے جال کو لے کر کیسا اڑان لے پائیں گے۔ عالی اس پر احتجاج کرتا ہے کہ ہر ناکے پر دور دیسوں سے آنے والی سپاہ راستے بند کر رہی ہیں اور اس سب کچھ کو، کہ جو امن کے نام پر ہو رہا ہے، انسانیت کے لیے باعث شرم قرار دیتا ہے۔

مجھے عالی کی نظم "قلبیہ" پر بات کرنا تھی، مگر اپنے تہذیبی آہنگ سے جڑے اور اس پر ناز کرنے والے شاعر کی غزل پر اس لیے طویل تمہید باندھی ہے کہ ان کا بنیادی حوالہ غزل ہی ہے۔ ایسی غزل جس کے بارے میں آفتاب اقبال شمیم نے کہہ رکھا ہے کہ "جلیل عالی شاید آج کی لکھی جانے والی غزل کا واحد شاعر ہے جس کی

شاعری ایک سمت، ایک مرکزیت رکھتی ہے۔ وہ شعر و شعور کو باہم جوڑ کر اپنی متعین سمت میں چل رہا ہے۔‘ تو یوں ہے کہ اپنی گوں کا یہ منفرد غزل گو نظم کی سمت آتے ہوئے اپنے محبوب اور پختہ تخلیقی مزاج کو جھٹکے اور پچھاڑے بغیر اپنی بات کہتا ہے اور لطف یہ ہے کہ فن پارہ بناتے ہوئے اسے لائق توجہ بھی بنا لیتا ہے۔ قلبِ غزل سے قلبیہ تک کی کہانی کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے میں یہاں عالی کی تین نظموں سے مقتبس کر رہا ہوں۔

”----
سرِ قرطاس
نیا کوئی سوال اور نہ جواب
خالقِ لوح و قلم!
تیرے کرم کے قرباں!
پھر تری رحمتِ جاں تاب سے ارزانی ہو
سوچ آنگن میں کوئی تازہ ہوا کا جھونکا
حرف دو حرف سفر آگے کا“

(حرف دو حرف)

”-----
خیال خاروں،
خبر خساروں کے جنگلوں میں
وہ خیر خوشیوں کے
جاگتے راستے بناتی ہوئی بصیرت“

(۳)

”------
کھڑکی کھولو!
کھڑکی میں کھلتی کلیوں سے
پوروں کو مس کر کے
لہو میں اوج نمو کی موج رچاؤ
تا لو پر امکان رتوں کے

شہد سے میٹھے میووں کی تاثیر جگاؤ
گلی میں شور مچاتے، ہنستے گاتے
بچوں کی آواز ساتھ آواز ملاؤ
بیتے کل کی محصوری سے جان چھڑاؤ
دروازے سے دستک دیتے
چنچل پل سے ملنے جاؤ"

(نکلو)

تین مختلف نظموں سے لیے گئے یہ تین ٹکڑے عالی کے تخلیقی مزاج کا ایک خاکہ سا بنا دیتے ہیں۔ وہ حقیقت کل سے جڑا ہوا ہے اور پورے اخلاص سے اسی حقیقت کی کچھا اور پرتوں تک رسائی چاہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ محض اور صرف علم حقیقت کے قلب نہیں پا سکتا کہ حد سے حد علم سے حقیقت کی ایک خام لسانی تشکیل ہو سکتی ہے جب کہ زبان کی اس لکنت کو دور کرنے کی صلاحیت خالص تخلیقیت میں ہے، سو وہ تخلیقی قرینے نہایت خلوص سے بروئے کار لاتا ہے۔ وہ تہذیبی منابع سے عشق کا رشتہ استوار کیے رکھنا چاہتا ہے، اس کے لیے مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا ہے تاہم اپنے تالو پر امکان رتوں کے شہد سے میٹھے میووں کی تاثیر بھی جگانا چاہتا ہے، سو اس نے کل کی سمت بھی کھڑکی کھول رکھی ہے اور مستقبل دروازے کی ہر دستک کو بھی شوق سے سنتا اور چنچل پل سے ملنے لپک کر نکلتا ہے۔

طویل نظم "قلبیہ" عالی نے عارضہ قلب میں مبتلا ہو کر ہسپتال پہنچنے اور بائی پاس کے تجربے سے گزرنے کے بعد لکھی، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ تجربہ عالی کی فکری استقامت کو اور بھی بڑھاوا دے گیا ہے۔ نظم گیارہ پارچوں پر مشتمل ہے، انہیں الگ الگ بھی پڑھا جا سکتا ہے اور عالی کی فکری کلیت کو سمجھانے کے لیے گیارہ نظموں کا یہ جھرمٹ ایک نظم بن جاتا ہے۔ پہلے حصے میں عالی اپنے قاری کو اپنے جسم میں موجود خرابی کے مرکز اور اس کی شدید ترین نوعیت کا احساس کے مقابل کرتا ہے۔ بے رحمانہ آپریشن کے تصور کو ابھارنے کے لیے چھاتی کے چیر دیے جانے کے بعد بتایا جاتا ہے کہ آپریشن کے عرصے میں مریض کی نگاہوں میں قصائی کے کٹے بکروں کے لٹکے ہوئے عکس لہرا گئے تھے۔ اگرچہ قصاب کے چھرے اور ڈاکٹر کے نشتر میں فرق ایک لطافت اور نفاست کا بھی ہوتا ہے، مگر جس پر بیت رہی ہوتی ہے، اس کے ہاں تشویش اور خوف کی سطح اس لطیف احساس کو تلف بھی کر سکتی ہے، سو یہاں ایسا ہی ہوا ہے۔ ایسے میں خود کو ایک اضحیہ کی صورت دیکھنا، سمجھ میں آتا ہے۔

نظم اس مرحلے سے ایک منطق قائم کرتے ہوئے سارے عمل کو جسّی فائی کر دیتی ہے۔ یوں یہ جو جسمی اور عملی سطح پر قلبی واردات ہے اس کا مرحلہ نظم کی ابتدا میں طے ہو جاتا ہے۔ اب دل اور دماغ احساسات اور خیالات

کی کمک ایک دوسرے کو بھیجنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں ہماری ملاقات اسی تہذیبی اور فکری عالی سے ہوتی ہے، جو ہمیشہ سے اپنے آپ کو ایک ہالہ رحمت میں پاتا رہا ہے۔ بس اب یوں ہے کہ اس کے ہاں شکرگزاری کا جذبہ اپنی انتہا کو چھو رہا ہے اور وہ چاہتا ہے کوئی حیلہ ہو کہ وہ اسی ہالہ رحمت میں مستقل مقیم رہے۔ یہ جو صوفیا ایمان کو سمندر کی لہروں کی مانند کہا کرتے ہیں، گھٹتی بڑھتی لہروں کی مانند؛ تو وہ اس کے گھٹنے، اور پیچھے ہٹنے سے بچنا چاہتا ہے۔ باقی عمر کی مہلت، ترجیح خیر آثار کا بے داغ سایہ، اور اپنے کشکول بھرنے کا مضمون جہاں بے ثبات زندگی کی اس ایزادی قاش کا احساس دلاتی ہے، وہیں اس کو شاعر نے اپنے دو جہانوں کے سنورنے کی شدید ترین خواہش کے ساتھ جوڑا ہے، کچھ یوں کہ نظم میں دعائیہ اور حمدیہ آہنگ نمایاں ہو گیا ہے۔ ایک شکر گزار بندے کی طرح، جو اس کی رحمتوں اور عنایات کو یاد کرتا ہے اور یاد رکھنا چاہتا ہے کہ عنایات کے اس سلسلے نے اس کی گزر چکی زندگی کا احاطہ کیے رکھا ہے۔ آخر میں نظم کو اس خوب صورت علامت سے جوڑ دیا گیا ہے جس میں سینہ لوہے کے صندوق کا سا ہو جاتا ہے اور وہاں مقید دِل اُچھل کر آنکھوں میں دھڑکنے لگتا ہے۔ شاعر کی ساری حسوں، سوچوں اور فکروں کا شریک یہ دل، قلبیہ نظم کے سارے پارچوں میں ہر بار ایک نیا لطف دے جاتا ہے۔

"ادا ہو شکر کیسے
اس کے احسانات بے حد کا
زباں الفاظ کی بے مائیگی سے
گنگ ہے میری
جھکی پلکوں سے بس
ممنونیت کا نم جھلکتا ہے
مرے سینے کے بکسے میں نہیں
آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے"

نظم کے دوسرے پارچے میں بھی اگرچہ عالی وہی ہے؛ اپنی پوری زندگی کو ایک فکری سلسلے سے حسی سطح پر جوڑنے والا، مگر اب وہ اپنے آپ کو آئنے میں دیکھتا ہے تو نئی زندگی پانے کے اس سارے عمل میں خود کو متحیر بھی پاتا ہے۔ لہو میں رقص کرتی حیرتیں، چہرے پر ظاہر ہوں نہ ہوں بدن کے بیچ گونجتی ضرور ہیں، اور عالی کی اس نظم میں یہ حیرت گونج رہی ہے۔ عالی نے اپنے دل کی جراحت کے بعد والی زندگی کو کہانی کا ایک نیا موڑ کہا ہے۔ وہ اس نئے حسی تجربے کی تصویر بنانا چاہتا ہے، نقطہ نقطہ، مگر یہ اللہ لوک، اپنے اس تجربے کی ساری سنسنی،

سراسیمگی، اچانک پن، اور حیرت کو ایک طرف دھکیل کر ایک الوہی نغمگی کو یوں سنتا ہے کہ اُسے زمانوں سے دماغ اندر دھری سوچ بدلتی ہوئی لگتی ہے۔ یہ تبدیل ہونا، میرے نزدیک سوچوں کے رُخ بدلنے سے عبارت نہیں ہے بل کہ اپنے افکار پر ایمان کے راسخ ہونے کا یقین ہے جسے اب شاعر نے اُس تجربے (یعنی زندگی کی بے ثباتی کے شدید احساس اور پھر اسی زندگی کے اس قدر رحیم اور مہربان ہو جانے) کے بعد، اپنے ہاں جاری تخلیقی عمل کو عملِ خیر کے تسلسل میں دیکھا ہے۔ اب اگر کہیں کچھ فکر و احساس میں رخنے تھے تو وہ بھی دور ہو گئے ہیں۔ فکر کا دِل کی دھڑکنوں کے آہنگ میں آ جانا یا پھر دِل کا فکری سفر کو اپنی دھڑکنیں ودیعت کر دینا اس سارے تجربے کی عطا ہے۔

“قلبیہ ۳” میں جراحتِ قلب کے مابعد، نقاہت کے دِن پڑتے ہیں۔ ڈاکٹر کی ہدایات کو شاعر مان رہا ہے کہ بدنی نقاہت ان ہدایات کے درست ہونے کی تصدیق کرتی ہے۔ سو شاعر چت لیٹا ہوا ہے، ملنے والوں سے ملتے ہوئے احتیاط کرتا ہے، چھینکنے تک سے اجتناب ہو رہا ہے اور یہ سب ایک کہانی کی صورت نظم کا حصہ ہوا ہے۔ یہاں بتانے کی بہ جائے دانش کی ایک اور سطح قاری کو سجھائی جا رہی ہے۔ ایسے میں نگہ داروں کی مان کر اُنہیں جُل دے کر نکل جانے کی خواہش نے اس بیانیے میں ایک لطف سا بھر دیا ہے۔ زندگی کا ایسا لطف اور ایسی لذت جو محض اور صرف سرکشی کی عطا ہے؛ جی، کچھ انوکھا کر لینے کی للک میں چھپی ہوئی۔ عین ایسے کافر، باغی اور غیر محتاط لمحوں میں جب شاعر یہ کہتا ہے: “مرے سینے کے بکسے میں نہیں / آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے”، تو واقعی شاعر کی اس جرات پہ پیار آتا ہے۔ بعض اوقات بہت بڑی فکری بات سے احتراز ہی نظم کو بڑا، بامعنی اور پر اثر بنا دیتا ہے اور یہاں ایسا ہی ہوا ہے۔

“قلبیہ ۴” میں جسمانی طور پر شاعر سنبھل چکا ہے اور طبیبوں کی نگرانی سے بھی باہر آ گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ بغاوت اور ردِ عمل کی وہ لہر جو قلبیہ ۳ میں ہمیں دکھائی دی تھی، اسے بھی شاعر نے کہیں سینت رکھ دیا ہے۔ خیر، یہاں شاعر کے اندر ایک گہری تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔ کسی بے مہر جھونکے کے مقابل بھی ردِ عمل پیدا نہ کرنے کے عزم والی تبدیلی۔ قلبیہ کہانی کے بدلے ہوئے اس مرکزی کردار کا دل اب بہت گداز ہو گیا ہے؛ شاید زیادہ زرخیز بھی۔ جس طرح کھیت میں ہل چلا کر زمین کو نرم، نمی سمیٹنے سہارنے والی اور زرخیز بنا لیا جاتا ہے، دل کی جراحت کے بعد شاعر کے دل کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا ہے۔ نظم بتاتی ہے کہ اب اس کے دل کھیت میں کوئی کینہ کدورت والی جھاڑ جھنکار نہیں ہے۔ یہاں شاعر نے ہر ساعت کو سانسوں کی سارنگی سے نکلتی ایسی لے سے جوڑا ہے جو رشتے جوڑنے والے افسوں کو جگا رہی ہے۔ سو یہاں شاعر کا اپنے بدخواہوں سے مکالمہ ہوتا ہے اور اس دل کے وسیلے سے ہوتا ہے جو سینے کے بکسے میں نہیں آنکھوں میں دھڑک رہا ہے۔

''قلبیہ ۵'' کا آغاز اپنی حسوں کی سمت روئے سخن موڑنے سے ہوتا ہے۔ حسی تجربہ جس کی کھڑکی حکمت کے آنگن میں کھلتی ہے۔ اس حکمت کو، کہ جو ہمارے شاعر کو مرغوب ہوگئی ہے اور ایک مربوط فکری تہذیبی نظام کی مہکتی فضا کے احاطے میں ہی بامعنی ہوتی ہے۔ شاعر اس سے آگاہ ہے وہ اس فکری نظام کے منحرفین کو ''بھٹکی منطقوں والے عذابوں میں پھنسے ہوئے ذہن'' جیسے الفاظ استعمال کر کے نشان زد کرتا ہے۔ نظم کے اسی مقام سے ایک خوب صورت ٹکڑا:

''سمجھتا ہوں
تعصب آدمی کی آدمیت کا اثاثہ
پھونک دیتا ہے
سماعت دوسرے کی بات
سن کر بھی نہیں سنتی''

شاعر دوسروں کی آواز سنتا ہے اور ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ سنتا ہے، مگر سنتے ہی وہ اسے پرکھتا بھی ہے اپنے سابقہ تجربے کی کسوٹی پر کہ شاعر کو اپنی فکریات اور اپنی توفیقات پر بہت اعتقاد ہے۔

''یہی توفیق کا جوہر
بہت الجھے مناظر کی حقیقت
ناپے بھر میں پرکھتا ہے
مرے سینے کے بکسے میں نہیں''

''قلبیہ ۶'' تک آتے آتے شاعر حسی اتھل پتھل سے نکل آیا ہے۔ اب اسے انہی موضوعات سے معاملہ ہے جن موضوعات کو اپنی غزل میں برت کر اس نے (اپنی تہذیبی تاریخی روایت کے تسلسل میں رہتے ہوئے) نام کمایا ہے۔ اس روایت کا روشن مینار اقبال شاعر کے دل کے قریب رہا، اب اور بھی قریب ہو گیا ہے۔ تقسیم کے حق میں مقدمہ لڑتی اس نظم میں عالی نے اپنی فکر کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔ لگتا ہے وہ دل جو آپریشن پر بہت نرم ہو گیا تھا، پھر سے مضبوط ہو گیا ہے۔ ایک تہذیبی فکری چھتنار درخت کے مضبوط تنے کو سہارنے والی سخت زمین جیسا۔ سو ذوق یقین کی طرف اشارہ کرتی اس نظم میں شاعر کا یقین اس کے دل سے کہیں زیادہ ہمکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

''قلبیہ ۷'' میں اقبال کا شاہین پلٹ کر جھپٹنے کے لیے تیار ہے۔ سو وہ پہلا وار ''گلوبل ڈان'' پر کرتا ہے۔ ''گلوبل ڈان'' کی اصطلاح سب کچھ بتھا رہی ہے۔ بارود، سرمائے کی مجبوری، استعمار وغیرہ وغیرہ، سو سارے

لفظ اسی تناظر کو کھول کھول کر بیان کر رہے ہیں۔ ایسا تناظر جس میں صداقت، عدل اور انصاف جیسے الفاظ اپنی معنویت کھو چکے ہیں، اسے شاعر نے قیامت سے تعبیر کیا ہے۔ ایسی قیامت جس میں توقیر سے مرنے کی صورت بھی نہیں نکل پاتی۔ اس موذی نظام زر کی سفاکیوں پر خون کے آنسو روتی اس نظم میں شاعر نے آنکھوں میں دھڑکنے والے دل کو بھی ایک مختلف معنویت دے دی ہے۔

قلبیہ کے ساتویں پارچے کا مزاج، اس کے اگلے پارچے میں بھی برقرار رہتا ہے۔ نظم کے اس حصے میں زر تقدیس و طاقت کے فلک آثار استھانوں پر بے توقیر ہوتی حرمت انسان کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ عالی کی اس طویل نظم کے لگ بھگ ہر ٹکڑے میں موضوع حاوی ہوتا رہا ہے۔ شاعر تو اپنے رفیع الشان تہذیبی حوالوں سے جڑا ہوا ہے، سو ان حوالوں کی نفی کرنے والے، ہمارے شاعر کے نزدیک ’’بیمار ذہنیت والے‘‘، اور ’’بے راہ رو‘‘ ہیں، ان کی بے راہ روی پر شاعر کو خود اپنا آپ کھٹکنے لگتا ہے، ظاہر ہے وہ اسی سبب ہوگا کہ شاعر انہیں اپنا ہم نوا نہیں بنا سکا۔ سو اِس بار آنکھوں میں دِل کا دھڑکنا اِسی کھٹکے سے جڑا ہوا ہے۔

’’قلبیہ ۹‘‘ کا مقدمہ ایک تہذیبی آدمی کے حق میں ہے۔ یہ تہذیبی آدمی شاعر خود بھی ہے، ایسا تہذیبی آدمی جسے کرداری عظمت ہانٹ کرتی ہے۔ سو اس کرداری عظمت کے صدقے وہ ’ملحدوں‘‘، ’’دہریوں‘ اور ’’فکری طور پر بھٹکے ہولوگوں‘‘ کو بھی محترم سمجھ سکتا ہے۔ ان القابات کے ساتھ محترم سمجھے جانے والے لوگ شاعر کے ہاں کتنے ’’محترم‘‘ ہو پائیں گے، یہ سوال الگ سہی، مگر شاعر کا سب کو سننا اور مکالمہ قائم کرنا اپنی جگہ بہت احسن ہے۔ پھر تخلیق کا جوہر ایسا ہے کہ شاعر کے لیے فکری سطح پر تکریم نہ پانے والے بھی محترم ہو جاتے ہیں۔ اپنے آدرش سے جڑے تخلیقی آدمی کا ورلڈ ویو پوری طرح اس نظم کا حصہ ہو گیا ہے۔ تہذیبی شباہت کی مُو مُو رچی ہوئی خوشبو شاعر کو اس مکالمے سے وابستہ رہنے کا اذن دیے رکھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اجتماعی باطنی تہذیبی جوہر کو گمرہوں کے ہاں بھی دیکھ لیتا ہے۔ نظم کے اس حصے میں شاعر نے روایت کے تسلسل کی ایسی ادا سے اپنی لہو لہروں کو جوڑا اور شوق سورجوں کو چمکایا ہے کہ دل کا سینے کے پنجے سے نکل کر آنکھوں میں دھڑکنا بھی اسی ادا سے جڑ گیا ہے۔

قلبیہ نظم کے نویں ٹکڑے میں بھی شاعر کو خیال، حرف، صوت، رنگ، اقدار اور معیارات کی اس نہج سے معاملہ ہے جس سے شاعر کا اپنا آدرش مخصوص ہے۔ سو جب وہ اس سے منحرف سماجی مظاہر دیکھتا ہے تو کڑھتا ہے۔ تاہم ایک تخلیقی آدمی کی حیثیت سے اس نے موجود منظر نامے سے امید کشید کرنے کا ہنر سیکھ رکھا ہے۔ ایک شدھ سر قہر و قوت آزار اور ظلم کو شہ مات دے دیتا ہے۔ ایدھی جیسے لوگ، اپنے زیورات دان کرتی عورتیں

،اور دردی لوگوں کی بے ریا محبتیں ،تو اس زمانے میں حوصلہ دینے والی کئی صورتیں ہیں ۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی صورت جب اچانک سامنے آتی ہے تو دل کا آنکھوں میں اُچھل کر دھڑکنا بنتا ہے اور اس نظم میں یہاں یہ اسی نہج سے دھڑکا ہے ۔

جب میں قلبیہ کے پہلے حصے کے بارے میں بات کر رہا تھا تو یہ بھی کہا تھا کہ ایک سطح پر جا کر وہ حصہ حمدیہ نظم ہو گیا ہے، بہ طور خاص وہاں جہاں کہا گیا ہے:

”مجھے مالک نے
اس بے مہر دنیا میں
کبھی تنہا نہیں چھوڑا
ادا ہو شکر کیسے
اس کے احسانات بے حد کا
زباں الفاظ کی بے مائیگی سے
گنگ ہے میری
جھکی پلکوں سے بس
ممنونیت کا نم جھلکتا ہے
مرے سینے کے پنجرے میں نہیں
آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے“

قلبیہ کا پہلا حصہ اگر حمدیہ ہے تو آخری نعتیہ، عشق رسول میں ڈوبا ہوا اور اس فکری اور تہذیبی نظام سے جڑا ہوا بھی، جس سے شاعر جڑ کر زر عرفان پاتا ہے، سو اس نظم میں آپ کی رحمتوں کا بیان ہوتا ہے ۔ یہیں شاعر خوش امکان تحریکوں کی بات کرتا ہے، تو میں جو ایمان کا اتنا پختہ نہیں ہوں، سوچتا ہوں اور اپنے آپ سے کئی سوال کرتا ہوں، خود سے اُلجھتا ہوں اور ”خوش امکان تحریکوں“ کے آگے بڑا سا سوالیہ نشان لگا دیتا ہوں ۔ میری طرح اور بھی اُلجھتے ہوں گے مگر شاعر کے پاس یقین کی دولت ہے اور میں حیران ہوتا ہوں اور رشک کرتا ہوں کہ اس بے مہر زمانے میں بھی اس نایاب دولت سے اس کا دامن بھرا ہوا ہے ۔ اس خوب صورت نعتیہ اظہاریے میں جذب و شوق کا دریا کچھ اس صورت کناروں سے چھلکتا ہے کہ شاعر کا دل اس کے سینے کے پنجرے میں نہیں، اس کی آنکھوں میں دھڑکنے لگتا ہے ۔

میں نے عین آغاز میں کہا تھا، ہم بہ حیثیت مجموعی بیمار ہو جانے والے بیدی کی طرح اپنے حواس میں نہیں ہیں، ہمارا بہت کچھ بک چکا ہے۔ وہ ساری اجتماعی اور تہذیبی وابستگیاں جو کل تک ہماری دستار کلاہ پر تھیں، غیروں کے ایجنڈے کو اپنی جنگ بنا کر لینے والوں کی زبان پر چڑھی ہوئی پھبتی ہو گئی ہیں۔ اور اب آخر میں کہنا ہے کہ جلیل عالی اپنی شاعری کے ذریعے ہمیں اجتماعی سطح پر اپنی تہذیبی فکری روایت سے جڑ جانے پر اکسا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب بیدی کو اس کی اپنی باتیں اور اس کے اپنے لکھے ہوئے جملے سنائے گئے تھے تو ایک جملے پر وہ پکار اٹھا تھا، 'یہ تو اس کے افسانے کا جملہ ہے'۔ جلیل عالی جس تسلسل اور استقامت کے ساتھ ہند اسلامی روایت سے جڑ کر اجتماعی حمیت کو جگانے میں جتا ہوا ہے، اس سے اس کی شاعری کی الگ اور لائق اعتنا شناخت تو بنتی ہی ہے ہمیں بھی اس کے خلوص اور لگن پر رشک آنے لگا ہے۔

☆☆☆☆

جلیل عالی

قلبیہ

(۱)

خرابی دور کرنے کے لیے
لازم تھا
چھاتی چیر دی جائے
نگاہوں میں
قصائی کے کٹے بکروں کے
لٹکے عکس لہرائے
یہ گھاٹی پار کر کے
اک نئے جیون کی صورت
سانس جو پائے
جواز ان کا سمجھ آئے نہ آئے
پر عجب احساس ہے
اک ہالۂ رحمت میں ہونے کا
کوئی حیلہ
لہو میں مستقل یہ لَو سمونے کا
تمنا ہے
کہ باقی عمر کی مہلت
کسی ترجیحِ خیر آثار کے
بے داغ سائے میں بسر ہو تو
مرے کشکول بھر جائیں
جہاں دونوں سنور جائیں
کرم مجھ پر ہوئے کیا کیا
شمار ان کا نہیں کوئی
مجھے مالک نے
اس بے مہر دنیا میں
کبھی تنہا نہیں چھوڑا
ادا ہو شکر کیسے
اس کے احساناتِ بے حد کا
زباں الفاظ کی بے مائیگی سے
گنگ ہے میری
جھکی پلکوں سے بس
ممنونیت کا نم جھلکتا ہے
مرے سینے کے بکسے میں نہیں
آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے

(۲)

مجھے یہ آئنے سے کون تکتا ہے
مرے جیسی شباہت ہے
مگر یہ میں نہیں ہوں
اور ہے کوئی
لہو میں رقص کرتی حیرتیں
چہروں پہ کب تصویر ہوتی ہیں
کہانی میں سفر کرتی کہانی نے
نیا جو موڑ کاٹا ہے
وہ کیسے عکس میں آئے
کہیں احساس کی گہرائیوں میں
جو الوہی نغمگی کے
شہد میٹھے سُر بکھرتے ہیں
کہاں نقطوں میں ڈھل پائیں
زمانوں سے دماغ اندر دھری
ہر سوچ نے
اپنی جگہ تبدیل کر لی ہے
میں گرد و پیش کی ہر شے
بہت نزدیکیوں
اور بے نہایت دوریوں سے
دیکھ سکتا ہوں
نگہ ڈالوں
تو تہ در تہ
ہر اک پردہ سرکتا ہے
مرے سینے کے بکسے میں نہیں
آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے

(۳)

ہدایت ہے
کئی ہفتوں تلک کروٹ نہیں لینی
فقط چِت لیٹنا ہے
اور کبھی بھولے سے بھی
بانھوں کو سر اوپر نہیں لانا
کسی دردی ملاقاتی کی آمد پر
گلے ملنا کجا
ہاتھوں کے چھو جانے سے بھی
پرہیز لازم ہے
زیادہ گفتگو سے اجتناب
اس باب میں
بے حد ضروری ہے
اچانک چھینکنا تو کیا
کھلی کھانسی نہیں کرنی
طبیبوں کا نہیں تو
اپنی "ماما" کا کہا مانوں
نہ ہرگز سیڑھیوں جانب نکلنے کی
کہیں ٹھانوں

بجا سب کچھ
مگر ہے خوف اپنے آپ سے مجھ کو
مری بے کل نگاہوں میں
انوکھی دید شکتی ہے
مرے جی میں
عجب خواہش ہمکتی ہے
نگہ داروں کی غفلت کے کسی لمحے
یہ سارے احتیاطی جبر تالے
توڑ سکتا ہے
مرے سینے کے بکسے میں نہیں
آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے

(۴)

کسی بے مہر جھونکے کے مقابل
اب کوئی ردِ عمل پیدا نہیں ہوتا
ہر اک شے وقت کے دریا میں
تنکوں کی طرح
بہتی ہوئی دیکھوں
تو آفاقی الم
اور ایک دردِ مشترک جاگے
مرے اندر
مسلسل شانتی کے ساز بجتے ہیں
کسی سے
کوئی کینہ، کوئی کد، کوئی کدورت
سر اٹھانے کی
سکت ہی سے تہی جانو
مرے سانسوں کی سارنگی سے
ہر ساعت نکلتی لَے
عجب افسوں جگاتی ہے
کہیں سے
خود بخود ٹوٹے تعلق
جڑتے جاتے ہیں
مرے بدخواہ
چل دُودِ پشیمانی سے باہر آ
قدم آگے بڑھا
اِس جا
کوئی بھی رُوبرو ہو
پیار کا شگُفتہ گُل مہکتا ہے
مرے سینے کے بکسے میں نہیں
آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے

(۵)

کہیں اندر ہی اندر
ایک اک کر کے
دریچے کھلتے جاتے ہیں
گلِ احساس پر
شبنم کے قطروں کی طرح
حکمت کے کیا کیا قیمتی ہیرے
اترتے ہیں
جدھر جاتا ہوں
سب دیکھی ہوئی جگہیں
نئی محسوس ہوتی ہیں
کئی پیغام دیتی ہیں
درختوں اور دیواروں سے
کوئی ماورائی مسکراہٹ
میرا استقبال کرتی ہے
میں بھٹکی منطقوں والے
عذابوں میں پھنسے ذہنوں کی
مجبوری سمجھتا ہوں
سمجھتا ہوں
تعصّب آدمی کی آدمیت کا اثاثہ
پھونک دیتا ہے
سماعت دوسرے کی بات
سن کر بھی نہیں سنتی
میں آوازوں کا سیرت آشنا ہوں
جان لیتا ہوں
کسی لب سے ادا ہوتے سخن
دراصل کن معنوں کا پردہ ہیں
یہی توفیق کا جوہر
بہت الجھے مناظر کی حقیقت
ثانیے بھر میں پرکھتا ہے
مرے سینے کے بکسے میں نہیں
آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے

(۶)

عبث تاریخ کے دریا میں
ابھری اور ڈوبی
بے وقر لہریں نہ گنواؤ
وقوعوں کے گھنے جنگل کے بیچوں بیچ
جس صورت
مشیّت راستہ اپنا بناتی ہے
اسے دیکھو
بڑی نظمیں پڑھو اقبال کی
یہ ایسی نظمیں ہیں
پہاڑ اوپر اترتیں تو
لرز کر وہ بھی رہ جاتا
دلوں اندر جنوں کی آگ بھڑکاتی
ہوا کا رخ بدلتی
سوچ کے آفاق پھیلاتی
فلک تسخیر امکانات کے در کھولتی نظمیں
”غلامی میں نہ کام آتی ہیں
تدبیریں نہ شمشیریں“
یہ سمجھاتی لہو میں بولتی نظمیں
وہ شاعر
جس نے اپنے خواب سارے
قائدِ اعظم کو سونپے
اور یہ کہہ کر ہوا رخصت
کہ موسم آ گیا ہے اب
الگ اپنے وطن کی مانگ کرنے کا
جو اقبال اور قائد کی نہیں سنتے
تو گاندھی کی کسک سے ہی بصیرت لو
جو کہتا تھا
زمیں کے ایک ٹکڑے کا نہیں قصہ
کہ یہ دنیا کے نقشے پر
نئے اک سلسلے کی ابتدا ہوگا
اسے ہونا تھا سو ہو کر رہا آخر
یہ ارضِ پاک ! پاکستان!
صدیوں اور نسلوں کے
سجل سپنوں کا گہوارہ ہے
اپنا عشق ہے
اور کچھ نہ کچھ ہوتے چلے جانے کا
زندہ استعارہ ہے
سرِ پرچم، ہلالی قوس میں
جس شان سے تارا دمکتا ہے
مرے سینے کے بکسے میں نہیں
آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے

(۷)

بہت تیزی سے روگی ہو رہے ہیں
روح و جسم و جاں
گلوبل ڈان نے چاروں طرف
بارود و قحط و قہر کی
فصلیں اگائی ہیں
گرانے اور پھر تعمیر نے کا کھیل
سرمائے کی مجبوری
مقدر سب عقیدوں، فلسفوں،
علموں، ہنر وریوں کا
استعمار کی خدمت
صداقت، عدل اور انصاف کے الفاظ
بے معنی
وہ تہذیب و معیشت سے جڑی
ہر چیز کو ملبہ بنا کر
امن کے پیکیج پہ
مہرِ جبر اپنی ثبت کرتا ہے
قیامت اور کیا ہو
جوہرِ نسوانیت بھی
بے وقاری اشتہاری لذتوں کا
رزق ہو کر خوش
کہیں اندر کے حسن و خیر سے
نکلے ہوئے میثاقِ عمرانی کو
یہ موذی نظامِ زر
قدم دھرنے نہیں دیتا
مخالف سوچ رکھنے پر
خوشی جینا تو کیا
توقیر سے مرنے نہیں دیتا
میں ایسے خون میں ڈوبے مناظر
دیکھتا ہوں جب
تو جیسے بادلوں میں
برق کا کوندا لپکتا ہے
مرے سینے کے بکسے میں نہیں
آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے

(۸)

بس اک اپنی خوشی پیچھے
کسی کو رنج پہنچانا بھی جائز جانتی
بےفکرمن مانی

ذرا سے فائدے خاطر
خوشامد کی نجالت کے
نشیبوں میں اترتے لالچی لہجے
پھلوں کی پیٹیوں میں
پچکی، مرجھائی، سڑی
اور پلپلی پرتوں پر ے منہ ڈھانپتی
نیّت کی عریانی
لڑا کر خلق کو آپس میں
اپنی شیطنت کے دن بڑھاتی
مقتدر مکروہ مکاری
مقدر کے نوشتے دان کرتے دفتروں،
تہذیب وفن کے مرکزوں،
میزاں گھوں،
تھانوں،
زر و تقدیس و طاقت کے
فلک آثار استھانوں پہ
بےتوقیر ہوتی حرمتِ انساں
گرفتِ یاس میں آ کر
خود اپنے بے بدل خوابوں،
رفیع الشان تہذیبی حوالوں کی
نفی کرتی ہوئی بیمار ذہنیت
نقوشِ خیر و خوبی منعکس کرتے
سب آئینوں پہ کالک لیپتی
بے راہرو دانش
میں کیا کیا دیکھتا ہوں
اور کچھ بھی کر نہیں سکتا
تو ایسے میں خود اپنا آپ بھی
کتنا کھٹکتا ہے
مرے سینے کے بکسے میں نہیں
آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے

(۹)

سرِ حرف و بیاں
سب کے سروکار اپنے اپنے ہیں
اور اپنے آپ سے
کوئی کہاں تک دور جا پائے
مری بھی اپنی کچھ مجبوریاں جانو
مجھے کردار کی عظمت ہمیشہ ہانٹ کرتی ہے
کوئی فکر و نظر کے جس قدر بھی فاصلے پر ہو
بھلے ملحد ہو چاہے دہریہ ہو
دولتِ اخلاص رکھتا ہو
کہے کا پاس رکھتا ہو
میں بے حد محترم اس کو سمجھتا ہوں
سر آنکھوں پر بٹھاتا ہوں
اگر ایسا نہ ہو تو بھی
قلم کاروں سے جو دل بستگی ہے
اس کی اک اپنی ہی مستی ہے
جسے اپنا بنا سکتا نہیں ہوں
اس سے بھی دامن چھڑا سکتا نہیں
دنیا سے کیا کیا ربط ہیں
لیکن یہ ترجیحی تعلق ہے
اور اپنا رنگ رکھتا ہے
کسی کی مجھ سے بے توقیری و بے چارگی
دیکھی نہیں جاتی
خود اپنے ظلم سے
انساں کے ہا انسان ہو جانے کا دکھ بھی
جھیلنا مشکل
مرے اعصاب پر جیسے
قیامت ٹوٹ جاتی ہے
مرے اندر کی اپنی روح
مجھ سے روٹھ جاتی ہے
خد و خال اپنی تہذیبی شباہت کے
مرے مُو مُو رچی خوشبو
مرے سانسوں کی شادابی
دھمک ہیں دھڑکنوں کی
زندگانی کو فقط جینے نہیں
آورش کرنے کی مجھے تحریک دیتے ہیں
میں اپنے اجتماعی باطنی جوہر کو
صدیوں اور نسلوں کی روایت میں
سفر کرتے ہوئے پاؤں
تو یوں محسوس ہو جیسے
لہو لہروں میں صبحِ شوق کا سورج چمکتا ہے
مرے سینے کے بکسے میں نہیں
آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے

(۱۰)

خیال وحرف وصوت ورنگ
اور اقدار ومعیارات کی
آلودگی میں
سانس بھی لینا جہاں دشوار ہو جائے
حک واصلاح کا ہر اک جتن
بے کار ہو جائے
تو ایسے میں
اگر تازہ کوئی موجِ ہوا آئے
کسی سچے گویّے کے گلے سے
شبنم وزمزم دھلے شدھ سُر نکل کر
روح کو شادابیاں بخشیں
کہیں پر دندناتے
قہر وقوت آزماتے
زور آور ظلم کو
شہ مات ہو جائے
کسی کی زندگی بھر کی ریاضت
وکٹری اسٹینڈ پر
سرشار احساسات کی
بارات ہو جائے
جب ایدھی کی صدائے بے ریا
پل بھر میں سب جیبیں الٹوا لے
پئے ایثار
مستورات کے زیور اُتروا لے
عدو جس آن
سوغاتِ ندامت لے کے
دروازے پہ دستک دے
کسی بے رہروی پر
مہرباں قدرت کی
کوئی سرزنش اُترے
اور اس قحطِ محبت کے زمانے میں
کسی دردی کے ہونٹوں پر
سروکارِ حقیقی کا پتہ دیتے ہوئے
کچھ لفظ لَو دیں تو
برنگِ اشک پلکوں سے
خراجِ جاں ٹپکتا ہے
مرے سینے کے بکسے میں نہیں
آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے

(II)

میانِ خالق و مخلوق
ربطِ خاص وہ ہستیؐ
زمانوں اور زمینوں پر
وہؐ اپنی رحمتوں کے ابر برسائے
اور اسؐ کے دل پہ اتری آیتیں
تاریخ کو کیا کیا
خوش امکانات تحریکوں کے
تحفے دیں
ضمیروں کی پشیمانی پہ
تطہیر و تلافی کے
دریچے کھولتا جائے
لہو میں بولتا جائے
اسیؐ کے پاس ہے
تہذیب کے ہر زخم کا مرہم
گر اس کی راہ اپنا لے
مٹیں دنیا کے سارے غم
زرِ عرفاں سے خالی فلسفوں کی
بھیڑ میں
سوچوں کو حکمت آشنا کرتے
سخن اسؐ کے
سب انسانوں کی راحت کے لیے
رنج و محن اسؐ کے
اسیؐ کے فیض سے
پُر نور میرا باطن و ظاہر
''نگاہِ عشق و مستی میں
وہیؐ اوّل وہیؐ آخر''
لبوں پر موجِ الفت میں
جب اسؐ کا نام آتا ہے
تو جذب و شوق کا دریا
کچھ اس صورت
کناروں سے چھلکتا ہے
مرے سینے کے بکسے میں نہیں
آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے

وحید زہیر

براہوئی زبان سے ترجمہ: تیمور دہوار

موت سے مُک مکا

شہر کا ماحول عجیب سا بن چکا تھا، کوئی کسی پر اچانک نظر ڈالے گاڑی کے پیچھے آنے والی اور قریب سے گزرنے والی موٹر سائیکل نامعلوم نمبروں سے آنے والی کال کسی بھی اکیلی برقع پوش عورت کو دیکھ کر شرفاء کی جان نکل جاتی ہے۔ لوگوں کے چہرے بلڈ پریشر سے پھلائے ہوئے یا خوراک نہ ملنے کی وجہ سے برسوں سے محروم ناکارہ مشکیزوں کی طرح خشک مائیں اور بہنیں سکول جانے والے بچوں، مزدوروں اور ملازمت پیشہ عزیز و اقارب کی واپسی کے لیے ہمہ وقت قرآنی آیات کے ورد میں مصروف۔ گاڑیوں کے ڈیش بورڈ پر پڑی فائلوں میں میڈیکل ٹیسٹ رپورٹ مرنے اور مارنے والے اسباب سے بے خبر۔ انسانی تاریخ اپنے ارتقاء پر شرمندہ و نامراد۔ ایک خستہ حال مکان میں رہائش پذیر محراب ماما جسے ہمہ وقت اپنے گھر اور بچوں کی فکر رہتی۔ ان حالات میں ایک نائب قاصد معمولی تنخواہ کے ساتھ کیسے جی رہا ہوگا، جسے ڈیوٹی اوقات کے بعد باوجود کوشش کے مزدوری کرنے کی رعایت نہ ہو۔ اس سے قبل وہ گزر بسر کے لیے کچھ کرتا چلا آ رہا تھا جب شہر میں ٹارگٹ کلنگ، اغوا برائے تاوان، بم دھماکے اور اس کے ساتھ روز ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوا تو محراب ماما کی طرح معمولی تنخواہ دار مزدور پیشہ افراد کا جینا حرام ہوگیا۔ امن و امان کی خستہ حالت کے ساتھ تو مصنوعی مہنگائی نے تو غریب سے منہ کا نوالہ چھیننے کا دوسرا بڑا کام کر دکھایا۔ محراب کے بیٹے نواز کی طرح نوجوانوں میں حساس معاملات کا ادراک نہیں تھا۔ وہ ٹی وی کے اشتہارات کے ساتھ جوان ہونے والی نسل تھی۔ اپنے معمولات اور اخراجات کی طلب میں نہ تو کسی کی مجبوری کا احساس کرتے اور نہ ہی کسی بات پر اپنی فرمائشوں سے ٹلنے کا نام لیتے۔ ایسے میں محراب ماما کی دوہری پریشانی نازک موڑ پر آ چکی تھی۔ اُسے خطرہ تھا کہ کہیں اس کا بیٹا کسی قسم کی مہم جوئی کا شکار نہ ہو یا حالات سے تنگ آ کر خودکشی جیسی بھیانک موت کا فیصلہ نہ کر لے۔ وہ کسی نہ کسی طرح بیٹے کی ملازمت حاصل کرنے کی تگ و دو میں رہا۔ پڑھائی اور مزدوری دونوں ناممکن نظر آ رہے تھے۔ اب صرف کسی نہ کسی طرح بیٹے سرکاری ملازمت ہی واحد طریقہ تھا لیکن اس کے لیے بھی پیسے چاہیے تھے۔ وہ ریٹائرمنٹ لینے کے لیے تیار تھا مگر اس کے بدلے بھی ان کے بیٹے کو نوکری ملنا ناممکن تھا، جہاں نائب قاصد کے لیے پانچ لاکھ روپے سے کم بات نہیں ہو رہی تھی۔ جن گھروں میں چولہا بمشکل جلتا ہو وہاں ہزار اور لاکھ کی

بات کینسر سے مقابلہ کرنے سے کم نہ تھا۔

اچانک اسی دوران ایک روز شہر میں دھماکے کی خبر آئی اور بدقسمت محراب ماما بھی اس دھماکے سے شدید زخمی ہو چکا تھا۔ نورا تک یہ بات جب پہنچی تو وہ اپنی ماں پر برس پڑا دیکھا اماں ہمیشہ تو صبر وشکر کا فلسفہ جھاڑتی تھی۔ پتہ ہے بم دھماکوں سے سارے غریب شہری مارے جاتے ہیں۔ کبھی کسی سرمایہ دار کو مرتے سُنا ہے؟ آج بابا کے پاس سرمایہ ہوتا تو وہ نہ تو غریبوں کے مجمعے میں جاتا اور نہ ہی کسی تخریب کاری کا نشانہ بنتا۔ ماں رونے اور آنسو بہانے کے علاوہ کیا کرسکتی تھی۔ تسبیح کے دانوں پر ورد کرتے ہوئے ملنے والوں اور بیٹے سے باپ کی زندگی کے لیے دعا کرنے کی التجا کرتی رہی۔ حکومت کی جانب سے ایک بار پھر حسبِ معمول جرائم پیشہ عناصر کو کیفر کردار تک پہنچانے اور آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کا دھمکی آمیز لہجہ استعمال ہوا اور ساتھ ہی ساتھ زخمیوں کے لیے ایک ایک لاکھ اور مرنے والوں کے لیے پانچ پانچ لاکھ امداد کا فیصلہ ہوا۔ نورا ایک لاکھ امداد کا سُن کر خوش ہوا اور اس کے حصول کے لیے ادھر اُدھر بھاگتا رہا۔ جب کہ محراب ماما کی نظریں پانچ لاکھ پر تھیں کہ موت تو ویسے ہی برحق ہے۔ یہ تو اچھا موقع ہے کہ میری موت پر ملنے والے پانچ لاکھ روپوں سے میرے بیٹے کی نوکری کا بندوبست ہو جائے گا۔ وہ یہ سوچتے ہوئے اپنی موت کی دعا کرتا رہا۔

نورا شام کو ایک پروفارمہ لے کر آیا اور اپنے باپ محراب ماما سے اس پر دستخط کرنے کے لیے کہا۔

محراب ماما نے زخموں کی شدت کے باوجود اسے چند روز رُکنے کا کہا۔ نورا کو اس بات پر سخت غصہ آیا وہ سمجھ رہا تھا کہ بابا اب بھی ایمانداری اور صبر وشکر کے فلسفہ پر قائم ہے اور لگتا ہے وہ ٹھیک ہو گئے تو اس پیسے کو حرام سمجھ کر لینے سے انکاری ہوں گے۔ وہ یہ شکایت اپنی ماں کے پاس لے کر گیا۔ ماں نے بھی دھیمے لہجے میں کہا، بیٹا کسی کی جان سے زیادہ اور کوئی قیمتی شے نہیں۔ تیرا باپ ٹھیک ہو جائے ہمیں پیسوں کی ضرورت نہیں۔ نورا غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ اس نے ماں سے کہا کہ بابا کو اپنے بچوں کی فکر نہیں اور نہ ہی کوئی احساس۔ اب زمانہ بدل چکا ہے، جب حکومت کو کسی بات کا احساس نہیں تو بابا اتنا کیوں فکر کرتے ہیں۔ کیا وزراء اور تیمارداری کے لیے آنے والے افسران نے بابا کی تنگ دستی، ان کی اولاد کے روزگار سے متعلق پوچھا، ہرگز نہیں۔ جب مردہ اور زندہ انسانوں کی قیمت مقرر ہے تو پھر کہاں کے اصول اور کہاں کی روایات۔ ماں کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ بیٹے کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا کہ اچانک خبر آئی محراب ماما زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ چکے ہیں۔ یہ سُن کر نورا ہسپتال پہنچا۔ نرسنگ اردلی نے اُسے دلاسہ دیتے ہوئے ایک رقعہ تھما دیا جس میں لکھا تھا بیٹے موت سے نمٹ مکا ہو چکا۔ پانچ لاکھ روپے لے کر بابو غلام ایسوسی ایشن کے عہدے دار سے ملنا اور اپنی نوکری کا بندوبست کروانا۔ اپنی ماں کو مزید پریشانیوں سے نجات دلانا۔ آخر کار چند دنوں کے بعد نورا کی نوکری کا معاملہ بخیر وخوبی طے ہوا۔ ہمسایہ کی خاتون محراب ماما کی بیوی کو مبارک باد دینے آئی اور ساتھ ہی اپنے بیٹے کی نورا کی طرح بھرتی ہونے کے لیے دعا کی استدعا کی۔!!!

افضل مراد

براہوئی زبان سے ترجمہ: جہاں آراء تبسم

تم مجھ سے ناراض نہ ہونا

دیکھ مجھ کو گُم سُم دیکھ کے
حیران و سرگرداں جان کے
سوچوں کے صحرا میں بھٹکتے
دکھوں کے دریا میں ڈوبتے
دیکھ کے تم ناراض نہ ہونا
میری وجہ سے اندیشوں کے ساتھ نہ بہنا
مجھ سے گریزاں کبھی نہ ہونا
تمھیں خبر ہے
میری پریشانی کا باعث
تم تو نہیں ہو
میں ہوں، میں خود
اپنی پریشانی کا باعث
اور مرے حالات جو مجھ کو
تجھ سے بے گانہ کرتے ہیں
مجھ کو ویرانہ کرتے ہیں

میرے دکھوں کی اس تثلیث کا
تم نہیں قصہ
تم ہو میری چاہ کا قصہ
تم مجھ سے ناراض نہ ہونا
میری وجہ سے اندیشوں کے ساتھ نہ بہنا
تم بس میرے ساتھ ہی رہنا

☆☆☆☆

مقبول انور

بلوچی زبان سے ترجمہ: واحد بخش بُزدار

بے وفا

جب ساز کی سُریلی دُھن پروین کی سماعت سے ٹکرائی، تو اُسے ایسا لگا کہ یہ سریلی دُھن صرف اس ہی کے لیے بجائی جارہی ہے...... ! یہ نیا کرایہ دار کون ہوسکتا ہے، جو اس طرح کی سریلی دُھن بجاتا ہے۔

پروین کا شوہر ایک ناول نگار تھا۔ وہ یہاں کرایہ دار کے طور پر رہ رہے تھے۔ ایک مدت سے دکان کی نچلی منزل خالی چلی آرہی تھی۔ پروین کا شوہر ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سرکاری ملازم تھا، اس نے کچھ دیر پہلے پروین کو بتایا تھا کہ وہ آج اپنا ناول ''وفا یا بے وفا'' لکھنا شروع کردے گا۔

پروین نے نئے کرایہ دار کے ساز کو سُننے کے لیے کھڑکی کا دروازہ کھول دیا تھا، پُرسوز، ساز کی دُھن اس کی روح کی گہرائیوں میں پیوست ہوگئی تھی۔ وہ اسی فکر میں تھی کہ یہ نوجوان کون ہوسکتا ہے؟ وہ یہ تصور کررہی تھی کہ لازمی طور پر یہ کوئی غم کا مارا ہوا شخص ہوگا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اس ساز بجانے والے شخص کے چہرے کو کسی طرح دیکھ سکے، مگر وہ اس کے چہرے کو دیکھنے میں کامیاب نہ ہوسکی، کیوں کہ وہ کھڑکی سے پشت کیے ہوئے بیٹھا تھا۔

پروین تصورات کی دنیا میں اس قدر محو ہوگئی تھی کہ اُسے یہ احساس تک نہیں رہا کہ نوجوان کب کا اٹھ کر چلا گیا تھا اور ساز کی آواز بند ہوچکی تھی۔ لیکن دروازے پر دستک ہونے پر اُس کے خیالوں کا تانا بانا بکھر گیا اور اس نے اپنے آگے رکھے ہوئے خط کو جلدی سے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور دروازے کے کھلتے ہی اس نے ایک شخص کو اندر آتے ہوئے دیکھ لیا۔ بے قراری کے لہجے میں اُس نے استفسار کیا کہ ''تم جلدی آگئے''۔

شوہر نے کہا ''ہاں، میں واپس چلا جاؤں گا۔ گھر میں ایک سرکاری چٹھی لینے آیا تھا'' شوہر کے چلے جانے کے بعد پروین نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

''دوست تم کافی دیر ساز کی لے میں کھوئے ہوئے ہو، کہو تو، تیرا حکم سر آنکھوں پر''۔

''فقط ایک مسافر''۔

پروین حیران تھی کہ اس بے مقصد خط کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ ساز کی آواز نے اسے ایک بار پھر چونکا کر رکھ دیا۔ لیکن وہ کسی شوق و وارفتگی کے بغیر بادلِ نخواستہ کھڑکی کی طرف جانے لگی...... وہ اِس بار بڑے

پر جوش انداز میں ساز بجا رہا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر میں لائیٹ چلی گئی۔ ہر طرف تاریکی چھا گئی اور ساز کا بجنا بھی بند ہو گیا۔ ایک دو گھنٹے کے بعد بجلی پھر آ گئی تھی۔ پروین کھڑکی کی طرف جانے لگی تھی کہ دروازے پر دستک نے اس کے قدم روک لیے۔ اور وہ دروازے کی طرف لپکی۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو اس کا شوہر کھڑا تھا۔ شوہر بہت تھکا ہارا لگ رہا تھا۔ کھانا لانے کا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پروین کی نظر اچانک کھڑکی پر ٹھہر گئی، جہاں ایک اور خط رکھا ہوا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئی اور خط کو اُٹھا کر اُس نے جیب میں رکھ لیا۔ شوہر کو کھانا دینے اور اس کے سونے کے بعد وہ خود بھی لیٹ گئی۔

اگلی صبح پروین نے شوہر سے پوچھ لیا کہ وہ وقت بے وقت کہاں چلے جاتے ہیں؟ اور واپسی پر مجھ سے بات چیت بھی نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ اس سے پہلے تو نے کبھی اس طرح نہیں کیا۔

پروین تم کیوں اس طرح سوچتی ہو؟ میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ میں ایک نیا ناول لکھ رہا ہوں۔ اس لیے دفتری امور سے فراغت پانے کے بعد میں ناول لکھنے میں مصروف رہتا ہوں۔ لیکن جب فرصت ملے گی تو تمھیں یاد کر لوں گا۔ اچھا، میں چلا۔

شوہر کے چلے جانے کے بعد پروین یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ وہ ساز کے بارے میں شوہر کو آگاہ کرے یا نہ کرے۔ اُس نے خیالوں کا یہ سلسلہ ترک کرتے ہوئے اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا اور خط نکال کر پڑھنا شروع کیا۔ خط کے مندرجات نے اسے بہت افسردہ کر لیا۔

”پروین! مجھے تم سے محبت ہے، نہ جانے تمھیں بھی مجھ سے محبت ہے یا نہیں ہے، جواب دیں اگر تمھیں مجھ سے محبت نہیں ہے تو میں خودکشی کر لوں گا۔“

پروین سوچنے لگی کہ یہ کون ہو سکتا ہے جو کہ میرا نام بھی جانتا ہے اور مجھ سے ملے بغیر محبت کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ لازمی طور پر مجھے جانتا ہے اور میری محبت میں گرفتار نظر آتا ہے، مگر یہ کون ہو سکتا ہے؟۔

سازکی پرسوز لے نے پروین کو ایک بار پھر چونکا دیا۔ وہ کھڑکی کی طرف جانے لگی۔ کھڑکی تک پہنچنے کے بعد اس نے دیکھا کہ نوجوان کے ہاتھ سے خون بہہ رہا ہے اور اس کے ہاتھ کا خون طنبورہ کے تاروں پر سے قطرہ قطرہ بن کر ٹپک رہا ہے۔ پروین کو محسوس ہوا کہ آج یہ کچھ نہ کچھ کرے گا۔

وہ میز کے دراز سے قلم اور کاغذ نکال کر خط لکھنے بیٹھ گئی۔ ”تم کون ہو سکتے ہو کہ مجھ سے محبت کرتے ہو؟ تم اسی دل سوز ساز کی لے سے مجھے وہ درد عطا کرتے ہو کہ جو میرے شوہر نے مجھے کبھی عطا نہیں کیا اور سچ تو یہ ہے کہ میں تیری محبت کو یوں محسوس کرنے لگی ہوں کہ میرے شوہر سے زیادہ تم مجھے چاہتے ہو......!“

دروازے پر دستک ہونے کی باعث پروین خط کو جیب میں رکھنا بھول گئی تھی، یہ احساس اسے دروازہ کھولنے کے وقت دامن گیر ہوا۔ مگر اب اس کا شوہر اندر داخل ہو چکا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے کہا ”آج میں نے اپنا ناول مکمل کر لیا ہے اور میں نے اس کا نام وفا رکھنے کی بجائے ”بے وفا“ رکھ لیا ہے۔

پروفیسر صبا دشتیاری

بلوچی زبان سے ترجمہ: ڈاکٹر سمی پرواز

جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت

لالین اپنی پیاری اور معصوم بیٹی دُرناز کا سر گود میں لیے آنسو بہارہی تھی ۔۔۔ ایک آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر دُرناز کے پیلے سے گالوں پر گر گیا۔ اُس نے تھوڑی دیر بعد اپنی خوبصورت آنکھیں کھولیں ۔۔۔ اور ماں کا چہرہ تکنے لگی۔ ماں نے ممتا سے اس کی طرف اس امید سے دیکھا کہ شاید وہ بولنے کے لیے اپنے لب کھولے لیکن اس نے اجنبی پن سے اپنی سوکھی آنکھیں ادھر اُدھر گھمائیں اور پھر بند کر دیں۔

لالین نے دُکھ سے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا اور دوپٹے کے پلّو سے آنسو پونچھنے لگی۔

چارپائی کے پاس ایک طرف دُرناز کا باپ چاشُک حقہ پکڑے کش لگا رہا تھا اور غصے سے بار بار دُرناز اور اس کی ماں کو گھورتا جا رہا تھا اور بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

چارپائی کے دوسری طرف زمین پہ چاشک کی طرح کا ایک دوسرا ادھیڑ عمر شخص پریشان بیٹھا تھا۔ یہ شاہ میر تھا اور کچھ ماہ پہلے دُرناز سے شادی کی خاطر دُبئی سے یہاں آیا تھا۔ ویسے اس سے پہلے یہ شخص تین شادیاں کر چکا تھا۔ تینوں بیویوں کو طلاق بھی دے چکا تھا اور اب چوتھی شادی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دبئی کے مال و دولت نے ابھی تک اس کی خواہشوں کے قلعے کو برقرار رکھا تھا۔ خواہش بھی مست اونٹ کی طرح گرتی اور اُبھرتی ہے اس لیے مال و دولت کے لالچ نے چاشُک کی آنکھوں پہ بے غیرتی کی پٹی باندھ رکھی تھی۔ اپنی پھول جیسی نازوں میں پلی بیٹی کو چند سکوں کے عوض دان کر رہا تھا۔ اسی دن سے دُرناز چارپائی پہ زندگی اور موت کی کشمکش میں بے سدھ پڑی تھی۔ چاشُک حُقہ کا نل ہونٹوں میں دبائے کش پہ کش لگا رہا تھا۔ اچانک وہ ایسے اُٹھا جیسے دس آدمیوں نے اُسے اُٹھایا ہو۔ چارپائی کی طرف شور مچاتا ہوا بڑھا۔ ”لالین! اپنی بیٹی کو سمجھاؤ، اب اس کی چالاکیاں زیادہ دن نہیں چلیں گی۔ اُس کو ہر حالت میں شاہ میر ہی سے بیاہ کرنا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں اس کا گلہ خود گھونٹ کے اُسے ختم کر دوں گا۔

لالین جودُرناز کی بیماری سے پہلے ہی پریشان اور غمگین تھی، چاھُک کی باتوں نے جیسے اس کے بدن میں آگ لگادی۔ وہ آگ بگولہ ہوکر چاھُک سے لڑنے کے لے تیار ہوگئی۔

”تم کیسے باپ ہو جو اپنی معصوم سی بیٹی پر ترس نہیں کھاتے----وہ موت کی طرف بڑھ رہی ہے اور تم اس طرح باتیں کر رہے ہو۔ ماں باپ اپنی اولاد کے لیے اپنی ہر چیز قربان کر دیتے ہیں، ہر خوشی داؤ پر لگا دیتے ہیں لیکن شاہ میر کے مال و دولت نے تمھاری آنکھوں کو چُندھیا دیا ہے۔ لالچ نے تم کو اندھا بنا دیا ہے اور تم اپنی اولاد کو، اپنے ہی خون کو بھول گئے ہو----لیکن یاد رکھو میں اپنی معصوم بیٹی کو موت کے چُنگل میں جانے نہیں دوں گی----میں ایک ماں ہوں، تم میرے جگر گوشے کو مجھ سے الگ کرنا چاہتے ہو، میں تمھیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔“

چاھُک کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ لالین ایسے الفاظ کہنے کی ہمت کر سکتی ہے۔ اسی لیے وہ حیران رہ گیا اور پھر غصے سے چلم کو پیروں سے ٹھوکر مارتا ہوا چلانے لگا۔

”لالین! مجھے نہیں پتہ تھا کہ تمھاری زبان اتنی لمبی ہے کہ مجھ سے زبان لڑاؤ گی۔ یاد رکھو میرا نام بھی چاشُک ہے اگر دُرناز شاہ میر سے بیاہ نہیں کرے گی تو میں بھی تجھے طلاق دوں گا پھر تم اپنی نازک اور معصوم سی بیٹی کو لے کر نکل جانا یہاں سے----“

لالین بھی بے چاری بیٹی کی بیماری سے تنگ آ گئی تھی اور اسے کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ چاھُک کے سامنے لڑنے کے لیے کھڑی ہوگئی۔ چاہے کچھ بھی ہو میں اس بوڑھے شخص سے اپنی نازوں پلی بچی کی کبھی شادی نہیں ہونے دوں گی۔ لالین کے یہ کہتے ہی چاشُک اُٹھا حقے کے تین کوئلے اُٹھائے اور لالین کی طرف اُچھالے---لالین کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چاشُک اس عمر میں بھی یہ سب کر گزرے گا۔ لالین حیران اور ہکا بکا رہ گئی۔ کاٹو تو لہو نہیں جیسے بدن میں۔ وہ ایسے کھڑی تھی جیسے سانپ سونگھ گیا ہو اسے کافی دیر اسی خاموشی میں گزر گیا۔ اب لالین کے پاس کوئی اور راستہ ہی نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنی بیمار اور سدھ بڑی بچی کو اُٹھائے اور چاھُک کے گھر سے نکل جائے۔ لالین نے اپنے اور دُرناز کے کپڑے لئے ایک گٹھڑی میں باندھے اور گھر کو حسرت سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ آنسو زار و قطار اُس کی آنکھوں سے جاری تھی۔ کپڑوں کی گٹھڑی اُٹھائے اس نے دُرناز کو سرہانے رکھا اور کافی دیر تک خاموشی سے بیٹھی رہی----پر پتہ نہیں کس خیال سے وہ اُٹھی اور تیز تیز قدموں سے باورچی خانے سے نکلی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چمک دار

کلہاڑی تھی۔۔۔تیزی سے وہ شاہ میر کے سر پر وار کرنے لگی۔۔۔یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہو گیا کہ کسی کو سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ شاہ میر کا خون فوارے کی طرح بہہ رہا تھا۔ تڑپتے تڑپتے وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ لالین کے دل کا انگار جیسے ٹھنڈا پڑ گیا۔

دوسرے ہی لمحے لالین کے قہقہوں سے پورا گھر گونجنے لگا۔ چاشک ایک طرف حیرانی سے کھڑا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور وہ کیا کرے۔ لالین کی حالت دیکھ کر وہ ڈر سے تھر تھر کانپنے لگا۔ بے خیالی کی حالت میں وہ پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ دُرناز کے سرہانے پہنچ کر وہ دُرناز کو دھیرے دھیرے پکارنے لگا۔

دُرناز۔۔۔اے بیٹی دُرناز۔۔۔اُٹھ بیٹی دیکھو اپنی ماں کو پاگلوں جیسے حرکتیں کر رہی ہے۔"

جب وہ دُرناز کے قریب پہنچا تو وہ اس بے وفا دنیا کو چھوڑ چکی تھی۔۔۔اس کی روح جسم کے پنجرے سے اُڑ چکی تھی۔

چاشک سر پیٹتا بین کرتا کمرے سے باہر نکلا۔ اس وقت بارش شروع ہوتی ہے۔۔۔برسات کی رم جھم کے ساتھ ایک طرف چاشک کے کمرے کی چھت ٹپکنے لگتی ہے۔ ٹپ ٹپ۔۔۔۔ دوسری طرف شاہ میر کی لاش۔۔۔اور تیسری طرف چاشک کی تمناؤں کے لہو کی ٹپ ٹپ۔۔۔۔

☆☆☆☆

اکرم نازی

لوڈشیڈنگ

کتے کی بھونکاہٹ سنتے ہی راہ گیروں کے قدم جہاں تھے، وہیں جم گئے۔ کٹے ہوے کان، لمبے گھنے بال، مضبوط جبڑا، ہیبت ناک تھوبڑا، اگلے دونوں پاؤں دروازے کی چوکھٹ پر رکھے وہ مسلسل بھونک رہا تھا۔

بچوں کا شور اور کتے کی بھونکاہٹ آنٹی کشمالہ کو دروازے تک لے آئی۔ اس نے آتے ہی کوسنے دینے شروع کر دیے۔

’’اللہ کا ان پر جاڑو پھرے، گلی کو جنگل بنا رکھا ہے، انھوں نے۔ شیر جیسے خونخوار کتے کھلے چھوڑ رکھے ہیں، بچوں کو کھیلنے بھی نہیں دیتے۔ نہ جانے کب ان کم بختوں سے یہ گلی پاک ہوگی۔‘‘

ایک اور پڑوسن نے بھی کشمالہ کی ہاں میں ہاں ملائی اور پھر اونچی آواز میں پکارا: ’’کریمو بیٹا! گھر آ جا۔ شام ہونے کو ہے۔ اندھیرا پھیلنے والا ہے۔‘‘

ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہیں، آسمان پر کالی گھٹاؤں کی ٹہل جاری تھی، دور دور بجلی کی گرج چمک بارش کی خبر دے رہی تھی۔ کالی گھٹاؤں کی وجہ سے سر شام اندھیرا پھیل رہا تھا۔

سلیم تھکاوٹ اور اُکتاہٹ محسوس کر کے دوستوں کی محفل سے اُٹھ کر، گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ اپنے کئی دوستوں سے الجھنے کے بعد خود کو خالی خالی سا محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے ایک نظر آسمان کو دیکھا، کچھ بڑبڑایا اور ایک تاریک گلی میں داخل ہو گیا۔ ایسے میں کچھ سوچ کر اس نے اپنے سر کو جنبش دی اور قدرے بلند آواز میں کہا: ’’توبتوبہ وہ بھی ایسی ہی ڈراونی رات تھی، اجمل دنیا و مافیہا سے بے خبر چیری ہوئی مچھلی کی طرح کال کوٹھڑی نما آپریشن تھیٹر میں پڑا ہوا تھا۔‘‘

سارا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا تھا، رشتہ داروں کی بھاگ دوڑ، مستریوں، آپریٹروں کی منتیں، گڑگڑا کر دعائیں مانگنا اور کھٹارہ جنریٹر کا سٹارٹ ہونے کا نام تک نہ لینا۔ کوئی بجلی کی آنے کی دعائیں مانگ رہا تھا اور کوئی بجلی والوں کو بد دعائیں دے رہا تھا۔ بجلی آ گئی تو خدا کا شکر ادا کیا گیا۔ دوستوں رشتہ داروں کی جان میں جان آئی، لیکن ایسے ہی کسی لمحے میں اجمل کی روح، کسی مجرم کی طرح اندھیرے کا فائدہ اُٹھاتی ہوئی فرار ہو چکی تھی۔

ہمارا سارا نظام دعاؤں سے چلتا ہے، کبھی الیکشن جیتنے کی دعائیں، کبھی وزیر بننے کی دعائیں کبھی امتحان

میں پاس ہونے کی دعائیں، کبھی نوکری ملنے کی دعائیں اور کبھی کرکٹ میچ جیتنے کے لیے ملکی سطح پر اجتماعی دعائیں۔ ہم خود سے کچھ بھی نہیں کرتے، ہم کر ہی نہیں سکتے، دعائیں مانگ کر، سارا کام اللہ پر چھوڑ کر بے غم ہو جاتے ہیں اور اگر اللہ ہماری منشا کے مطابق کام نہ کریں تو اللہ سے شکوہ کناں ہوتے ہیں کہ اس نے ہماری مدد ہی نہیں کی۔ کئی موقعوں پر ہم حاکموں، نوابوں، وڈیروں سے تعلقات بڑھاتے ہیں اور اللہ سے بگاڑ لیتے ہیں۔ ہم گاتے ہیں، ہم زندہ قوم ہیں،، کیا واقعی ہم زندہ ہیں...؟ کیا ہم میں زندہ ہونے کا احساس بھی ہے۔ جو بات ہم ہیرا منڈی کے بھڑوے سے اُسکی لمبی مونچھوں کے ڈر اور شرم کے مارے نہیں کہہ سکتے، خُدا سے بے دھڑک کہہ لیتے ہیں۔ ’’اے خُدا روزی کو راضی کرو، اُسے ایک بار میرے بیروں میں بٹھا دو، یا مجھے اُسکی بیروں میں بٹھا دو، میں نوافل پڑھوں گا، کسی درگاہ پر آپ کے نام کی دیگ چڑھاؤں گا، صدقے میں بکرا دوں گا۔ سلیم سر کو جھٹک کر نہ جانے کیا الم غلم سوچتا چلا گیا۔ پھر جھنجھلا کر کہنے لگا:

’’ہم خدا کو بھی رشوت دینے سے باز نہیں آتے۔ لے دے کر کام چلانا چاہتے ہیں۔‘‘

سوچ میں ڈوبے سلیم کا پاؤں اندھیرے کے باعث نالی میں جا پڑا۔ اس کا جوتا، اور شلوار کا پانچا گندے لتھڑ گیا۔ اس نے بجلی والوں کو ایک موٹی سی گالی دی۔ اس اپنے دوست کا کہا ہوا ایک واقعہ یاد آ گیا، اس نے اپنے ایک لائن مین دوست کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ بجلی بند کرنے سے پہلے بآوازِ بلند کہتا تھا ’’جاؤ تمھاری ایسی کی تیسی، میں بجلی بند کرنے لگا ہوں‘‘۔ کسی نے ایک دن اس سے پوچھا ’’بجلی بند کرنے سے پہلے تم گالیاں کیوں بکتے ہو؟ کہنے لگا: بجلی بند ہونے کے بعد پورا علاقہ مجھے اور ڈیپارٹمنٹ کو گالیاں دے گا، اس لیے میں ایڈوانس میں بدلہ چکا لیتا ہوں۔‘‘

سلیم کو یہ یاد آیا تو وہ ہنس دیا مگر جب اپنے جوتے اور شلوار پر نالی کے گند کو دیکھا تو پھر سے ایک گالی بک دی اور جوتا زمین پر مارتے ہوئے جھاڑا، اور بڑبڑاتے ہوئے چل پڑا۔

’’نہ تو ہم خدا سے مخلص ہیں، اور نہ ہی اپنے آپ سے، جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہیں۔ عوام سے جھوٹ، عدالتوں میں جھوٹ، افسروں، ماتحت، نوکر دوست، بیوی بچے سب جھوٹے۔ جھوٹ کے ایک حصار سے نکلتے ہی دوسرے بڑے حصار میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا لوگ امن کے لیے شہر کا رُخ کرتے تھے، اور ایک زمانہ یہ ہے، کہ گھنے جنگلوں، سنگلاخ چٹانوں میں بھی امن نہیں ہے۔ اس لیے ہم پر عذاب نازل ہوتے ہیں، معیشت کی بربادی ہے، کارخانے بند، زرعی ٹیوب ویل بند، دکانیں سرِ شام بند، گھریلو صارفین الگ پریشان اور گیس کا تو نام ہی لینا جرم ہے۔

پتہ نہیں وہ مزید کیا کیا سوچتا لیکن جب اس نے سر اُٹھایا تو وہ اپنے گھر کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ دروازہ کھلا تھا، اندر داخل ہوتے ہی جب اپنے گھر میں بھی روشنی نہ دیکھ پایا، تو بیخ پا ہو کر چلایا ’’یہ اندھیرا کیوں ہے؟‘‘

اُس کی بیوی نے ماچس جلائی تا کہ راستہ دکھا سکے، ماچس کی ایک تیلی پر وہ کتنے قدم اُٹھاتا، تیلی بُجھ گئی، اندھرا پھر سے چھا گیا، وہ کسی چیز سے ٹکرایا اور دھڑم سے گر پڑا، گرتے ہی بجلی والوں کو بُرا بھلا کہنے لگا۔

اُس کی بیوی نے اپنے دفاع کی خاطر جلدی جلدی کہدیا ”بجلی کی آنکھ مچولی سے بیٹری چارج نہ ہو سکی اور لالٹین میں تیل ختم ہو گیا ہے، بچے اُس کتے سے ڈرتے ہیں اور ۔۔۔ وہ ۔۔۔ دکان بھی تو اُسی گلی میں ہے۔“

کتے کا نام سُن کر اس کا غصہ اور بڑھ گیا، ”کتے کی ایسی کی تیسی۔“ اُس کی وجہ سے تو میں آج دو کلومیٹر لمبا چکر کاٹ کر تنگ و تاریک گلیوں سے گرتا پڑتا گزر کر آیا ہوں، ورنہ اُس گلی سے تو پانچ منٹ کا راستہ ہے، اِس کتے نے تو ہمارے ناک میں دم کر دیا ہے۔“

اس نے کھونٹی پر لٹکے ہوئے ہولسٹر سے پستول نکالا، بجھی ہوئی لالٹین کو لیتے ہوئے، دکان کی طرف جانے لگا، جاتے جاتے بیوی سے گلا پھاڑ پھاڑ کہتا رہا، ”میں تیل لانے جا رہا ہوں۔! اگر کتے نے حملے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا، چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ آج سالے کو نہیں چھوڑوں گا، نہیں چھوڑوں گا۔!

اندھیری رات، کالے بادل، ٹھنڈی ہوائیں، تنگ گلی لمبی سرنگ کی مانند دکھائی دے رہی تھی، سلیم اسی سرنگ نما گلی سے بجھے ہوئی لالٹیں کے ساتھ اندھوں کی طرح دل کی دلیل پر چلتا رہا۔

کتے کے خفیہ حملے کا سوچ کر اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے، کتا کئی لوگوں پر پیچھے سے حملہ کر کے کاٹ چکا تھا۔ کتے والے گھر کے قریب پہنچ کر خوف سے اس پر ہلکی سی کپکپی بھی طاری ہوئی، کان کھڑے ہو گئے، ہر قسم کی آہٹ کے لیے تیار۔ پستول کے دستے پر ہاتھ مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک پیچھے سے کتے کی آواز کے ساتھ ہی اس کا پائنچا ایک زوردار جھٹکے سے کھینچا گیا، پائنچے کی کھینچ سے وہ اُوچھل پڑا، بدحواسی میں اُس کے منہ سے کئی قسم کی آوازیں نکلیں۔ تیزی سے مڑا اور مشتبہ جگہ پر لگاتار فائرنگ کی۔ فائرنگ ہوتے ہی بجلی آ گئی، سٹریٹ لائیٹ سے گلی روشن ہو گئی، ایسا لگا جیسے اس نے پستول کی لبلبی نہیں، بجلی کا سوئچ آن کر دیا تھا۔

سلیم نے جب کتے والی جگہ پر نظر دوڑائی تو ہکا بکا رہ گیا، کیوں کہ وہاں پر تو کتا موجود ہی نہیں تھا، فائرنگ کی وجہ سے کتا گھر کی اندر ہی سے بھونک رہا تھا۔

سردی میں اس کے پسینے چھوٹنے لگے، آسمانی بجلی اُس کے سر پر چمکتے ہی بڑی شدت سے گرجنے لگی، اس کے پیروں سے زمین کھسکنے لگی، اُسے اپنی لاش پھانسی گھاٹ پر لٹکتی ہوئی نظر آئی، جہاں اس نے کتے پر گولیاں چلائی تھی، وہاں کتے کی جگہ دس گیارہ سالہ بچے کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆

رحمت شاہ سائل

پشتو زبان سے ترجمہ: م۔ر۔ شفق

ساحر کی نظم: میری نئی رائے

حسنِ تعمیر کے لحاظ سے ''تاج محل'' دنیا کے سات عجوبوں میں شمار ہوتا ہے۔ مغل شہنشاہ شاہجہان نے اسے اپنی محبوب بیوی ممتاز محل کے نام سے منسوب کرکے دنیا کو لازوال محبت کی نشانی پیش کی ہے۔ نوبیل انعام یافتہ شاعرِ بنگال رابندرناتھ ٹیگور نے تاج محل کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ ''محبت کی آنکھوں سے ٹپکا ہوا آنسو، جو وقت کے رخسار پر جم کر رہ گیا۔'' اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعر ساحر لدھیانوی نے ایک خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھا۔ اس نے مختصر شاہکار نظم ''تاج محل'' تخلیق کی اور یہ تاثر دیا کہ ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر غریبوں کی محبت کا مذاق اڑایا ہے۔ جدید پشتو شاعر رحمت شاہ سائل نے ساحر کی معرکہ آرا نظم کے بارے میں اپنی نئی رائے کا اظہار کیا ہے۔ طویل پشتو نظم کا سادہ ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔ (شفق)

ساحر نے یہ جو کہا
''میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے''
تاج محل سے باہر کیوں کہ
یہاں دُور دراز سے، محبت کرنے والے
آتے ہیں، پیار کرنے لیکن میرے دل کی شنوائی نہیں ہوتی
تاج محل کی فضا ہر چند معطر ہی
لیکن یہاں میرا دم گھٹنے لگتا ہے
میں یہاں تمھارے گلے کا ہار نہیں بن سکتا
میری محبوب، نازک احساس کچو کے مارتا ہے
تاج محل کے منقش در و دیوار
ان معماروں کی داستانِ حسرت ہے
جن کے ارمان سچے تھے، جذبے صادق تھے
مگر اپنی دھڑکنوں کی کہانی لب پر لا نہ سکے

ایسا محل تو ہر فنکار کے دل میں بسا ہوا تھا
مگر کوئی بھی اپنی محبوبہ کے لیے اسے تعمیر نہ کر سکا
ان کی مفلسی نے حسنِ لطافت کا گلا گھونٹ دیا تھا
کوئی بھی معمار اپنی محبوبہ کو یہ اعزاز دے نہ سکا
رہی تو دل میں حسرتِ تعمیر ہی رہی

میں صدقے جاؤں جانِ جاناں
کہیں اور ملا کر مجھ سے
تاج محل کے آنگن میں کھلتے ہوئے پھولوں سے
مجھے بہتے ہوئے خون کی بُو آتی ہے
گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک ہونٹوں کا بوسہ بھی نہ دو
یہاں وہ بھی کانٹے کی طرح کھٹکنے لگتا ہے
تاج محل اس شہنشاہ کی
محبت کی یادگار ہے
جس نے دولت کا سہارا لے کر
ہماری محبت کا مذاق اڑایا ہے
بادشاہ لوگ محبت کیا جانیں !
محبت کا دم بھرنے والے تو ہم ہیں
جو انتظار کی آگ میں جلتے رہے
آنکھوں میں انگارے لیے پھرتے رہے
ہمارے ہی دلوں پر چھریاں چلتی رہیں
ہماری ہر خلش زخموں سے چُور چُور رہے
ساحر نے بجا فرمایا لیکن سائل کی
رائے میں یہ مؤقف درست نہیں کہ:
”میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے“
ساحر سے چوک ہوئی ہے

تاج محل کو ٹھکرایا نہیں جا سکتا
بل کہ شاعر نے محبوبہ سے ایک راز چھپایا ہے
جو بتایا نہیں جا سکتا
سائل بحضور ساحؔر عرض کرتا ہے:
کروڑوں سال پہلے، یہ دنیا آباد ہوئی تو
تعمیر و تخریب کا سلسلہ بھی چل پڑا
جس کے دل میں جو خیال جاگزیں ہوا وہ کر دکھایا
ساحؔر! ذرا تم ہی بتاؤ بادشاہ اور بھی تو گزرے ہیں
اب بھی موجود ہیں
محبت کرتے آئے ہیں دکھاؤ تو سہی
محبت کی ایسی یادگار، پھر کبھی تعمیر کیوں نہ ہوئی
دوسرا تاج محل کیوں نہ بنا
دوسرے بادشاہوں کو محبتوں کی یادگار تعمیر کرنے
کی توفیق کیوں نہ ہوئی
ان کی داستانوں میں محبت کی مہک آفرینی کیوں نہیں
ان بادشاہوں کے محلات، اب ویران کھنڈرات کی صورت میں
آسیب زدہ کیوں ہیں؟ محبت کے پجاری وہاں پھٹکتے بھی نہیں
''تاج محل' صرف اُن کا نہیں ہمارا بھی ہے
اسے دولت و امارت اور لعل و جواہر کے ترازو میں
تولنا مناسب نہیں، یہاں حسن و محبت کی رعنائیاں
اور کرشمہ سازیاں دعوتِ نظارہ دیتی ہیں
ساحر! تم محبت کے شاعر ہو!
تم نے شاہکار نظم ''تاج'' کہی ہے
مجھے یقین ہے اس ایک نظم پر ''تاج محل'' کی
تمام تر رنگینیاں نچھاور کرو گے

اپنے تئیں تصورِ جاناں کے حوالے سے ایک
شعر بھی تخلیق کروں تو مجھے ایک الگ سا تاج محل
دکھائی دے حُسن کی تصویر بناؤں تو
حسن و محبت ہم آغوش نظر آتے ہیں
تاج محل کا شہرۂ حُسن عالمگیر سہی
میرے منظوم فن پارے کو چاند ستارے بھی
خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں
تاج محل دیکھنے لوگ جوق در جوق نظر آتے
ہیں لیکن میری غزل کو تو انسانوں کے
سائے بھی سلام کرتے ہیں
آؤ ہم دنیا میں حسن و محبت کو ایک نغمہ
کی طرح تخلیق کریں اور اسے بآوازِ بلند
گاتے بھی رہیں، محبت کے رشتے کو نبھانے اور
دائم رکھنے کے لیے مزید تاج محل تعمیر کریں
حسن و محبت کی دنیا بہر حال آباد و شاداب رہے
تا کہ دلوں کی دنیا برباد نہ ہو
''بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی''
سرمایہ کے صنم خانوں میں دونوں جہاں کی بازی
لگانے والے، مفلس و مزدور کی دنیا
تصورِ جاناں ہی سے منور و تاباں رہے

شاہکار نظم تخلیق کرنے والے شاعر نے
''یہ جو کہا میری محبت کہیں اور ملا کر مجھ سے''
درست نہیں کہا
بلاشبہ جن صناعوں نے تاج محل کو شکلِ جمیل دی ہے
انھوں نے بھی محبتیں کی ہوں گی جذبۂ عشق سے

سرشار ہوں گے لیکن ''تاج محل'' تو دُور کی بات
وہ اپنی محبوبہ کے لیے ایک کٹیا تک نہ بنا سکے
ان میں اکثر و بیشتر نے کرائے کے مکانوں
میں زندگی بسر کی، دل ان کے بھی دھڑک رہے تھے
لیکن کسی کو حالِ دل سنا نہ سکے
لیکن محبت کسی کی جاگیر نہیں ہے
حسن و محبت کے درمیاں دولت و غربت کی
امتیازی لکیر کھینچنا مناسب نہیں
اس میں بادشاہ و گدا کا سوال ہی نہیں
محبت کرنے والے ایسے بھی گزرے جنھوں نے خلعتِ شاہی کو
اتار پھینکا اور کاسۂ گدائی لے کر محبت کے گیت
گاتے رہے، فلکِ پیر نے ایسے ملنگ درویش بھی دیکھے ہیں
جو ذرۂ خاک سے آفتاب و مہتاب بن گئے اور
محبت کی بدولت رونقِ تخت و تاج ہوئے

محبت سچ ہے، صداقت ہے، سچائی ہی
شیوۂ انسانیت ہے، سچ پوچھیے تو
محبت ہی اعترافِ حق و صداقت ہے
تقدیر کے فیصلے مسائل اپنی جگہ
محبت کے دم سے ایک مفلس کی کٹیا بھی
''تاج محل'' دکھائی دے

☆☆☆☆

ڈاکٹر نصیب سیماب

پشتو زبان سے ترجمہ: اجمیر افغانؔ

اجنبی

سورج غروب ہو رہا تھا۔ ایک اجنبی نوجوان مسجد کی عقبی دیوار کی اوٹ سے نمودار ہوا۔ چند آدمی مسجد کے صدر دروازے کے سامنے آلتی پالتی مارے خوش گپیوں میں مگن بیٹھے تھے وہ اجنبی ان کے پاس آ کر رکا، ''السلام علیکم'' اجنبی کی آواز ابھری۔ ''وعلیکم السلام'' سب نے یک زبان ہو کر اس کے سلام کا جواب دیا اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو جانچا، لیکن ان میں سے کسی کے چہرے پر شناسائی کے آثار نہ تھے۔ پھر انھوں نے وہی نظریں اجنبی کی طرف گھمائیں۔ اجنبی کے سر پر عمامہ بندھا ہوا تھا، اس کی داڑھی اور مونچھوں کے بال باہم ایسے الجھے ہوئے تھے کہ بہت غور کرنے کے بعد بھی پتہ نہ چلتا کہ مونچھوں کا علاقہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور داڑھی کی سرحد کہاں پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے دھول سے اٹے ہوئے بالوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا گویا بہت دنوں سے انہیں نہیں دھویا گیا۔ پگڑی اس کے سر پر یوں معلوم ہو رہی تھی گویا کسی نے بھرے ہوئے مشکیزے کا منہ ڈوری سے کس کر باندھ دیا ہو۔ اس کے ایک کاندھے پر چادر اور دوسرے پر سے جھولا لٹک رہا تھا۔ وہ سب بدستور اسے سوالیہ نظروں سے گھور رہے تھے کہ اجنبی نے خاموشی توڑ کر عاجزی سے کہا۔

''مسافر ہوں، یہاں اجنبی ہوں۔ شب گزاری کے لیے ٹھکانہ مل جائے تو آپ کا احسان مند رہوں گا۔''

مگر اجنبی کا حلیہ دیکھ کر کسی کے جی نے نہ چاہا کہ وہ اس مصیبت کو اپنے پاس ٹھہرا لے۔

''بھیا مسجد چلے جاؤ۔ وہاں کوئی کھانا بھی لا دے گا اور رات بھی وہیں بسر کر لینا۔''

ان میں سے ایک نے مشورے کے سے انداز میں کہا۔

وہ اجنبی مکمل جواب کا انتظار کیے بغیر مسجد کی طرف بڑھ گیا۔

مغرب کی اذان ہوتے ہی نمازی جوق در جوق مسجد میں آنا شروع ہوئے۔ اعظم نے مسجد میں قدم رکھتے ہی چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن وہ اجنبی اسے کہیں نظر نہ آیا۔ جب وہ نماز پڑھ کر باہر آیا تو دیکھا کہ وہ مسجد کی

عقبی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ اعظم نے اس کے پاس جا کر کس قدر درشت لہجے میں اس سے کہا۔

"تم نے یہ نماز کیوں نہیں پڑھی؟"

"میرے کپڑے صاف نہیں ہیں" اجنبی نے جواب دیا۔

"وضو کر کے کپڑوں پر مسح کر لیتے لیکن نماز کسی صورت قضا نہ کرتے" اعظم نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن مجھ سے یہ نہیں ہوگا"۔

اجنبی نے شان بے نیازی سے کہا اور اعظم نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"ارے بھئی! تم تو مجھے ایسے گھور گھور کر دیکھ رہے ہو جیسے میری بات نہایت بری لگی ہو" اجنبی دھیمی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

"بات تو کیا مجھے تو تیری رگ رگ سے نفرت سی ہونے لگی ہے" اعظم پھنکارا۔

"تو پھر میں ایسا کیا منتر پڑھوں کہ تمھیں اچھا لگوں" اجنبی نے گویا بے سوچے سمجھے کہا۔

"کچھ بھی پڑھنے کی ضرورت نہیں، جاؤ مسجد کے حجرے میں بیٹھو میں کھانا لے کر آتا ہوں" اعظم نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا اپنا کوئی بیٹھک وٹھک نہیں"

"کیا مطلب؟" اعظم نے تشکیک کے لہجے میں کہا۔

"مطلب یہ کہ مجھے مسجد والے حجرے میں نہیں ٹھہرنا" اجنبی کا لہجہ دوٹوک تھا۔

"تو کیا کروں اپنے گھر لے جاؤں" اعظم جھنجھلایا۔

"ارے بھائی غصہ کیوں ہوتے ہو۔ مجھے کھانا وانا کچھ نہیں چاہئے" وہ اعظم کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔

اعظم اندر ہی اندر پیچ وتاب کھاتا ہوا وہاں سے چل دیا، وہ راستے میں سوچ کے تانے بانے بُن رہا تھا۔ اس آدمی نے نماز بھی نہیں پڑھی اور حجرے میں بیٹھنے کے بجائے میری ذاتی بیٹھک کا پوچھ رہا تھا۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ یہ اجنبی لوگ کوئی نہ کوئی مصیبت لے کر ہی آتے ہیں۔ وہ چند لمحے اجنبی کی نیت پر شک کر رہا تھا لیکن پھر سوچا کہ بے کس و بے سہارا ہے۔ رات بھر بھوکا پیاسا پڑا رہے گا اور پھر یہ اسلامی اور پشتون روایات کے خلاف بھی ہے۔ الٹے پاؤں واپس پھرا۔

"آجا میرے باپ تجھے اپنی بیٹھک لے جاتا ہوں حجرے میں بیٹھنے سے تو تیری شان گھٹتی ہے نا۔"

اجنبی اپنا جھولا اٹھا کر اعظم کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اعظم نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور اجنبی کو غسل خانہ

دکھا کر کہا ''تم ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔ میں کھانا لے کر آتا ہوں''۔

تھوڑی دیر میں اعظم کھانے کی ٹرے اٹھائے واپس آیا۔ چھاچھ سے بھرا ہوا جگ اور دو گلاس لیے ہوئے اعظم کا چھوٹا بھائی بھی پیچھے پیچھے تھا۔ اجنبی اعظم کے چھوٹے بھائی کو گھور گھور کر دیکھنے لگا، برتن رکھ کر اعظم کے چھوٹے بھائی نے اجنبی سے ہاتھ ملایا۔

''یہ کون ہے؟'' اجنبی نے اعظم سے پوچھا

''یہ میرا چھوٹا بھائی ہے'' اعظم دستر خوان چنتے ہوئے بولا۔

''اللہ اس کی عمر میں برکت ڈال دے۔'' اجنبی کا لہجہ اچانک غمناک ہو گیا۔

''آمین! اللہ ہم سب بھائیوں کی عمر میں برکت ڈال دے۔ لے بسم اللہ کر'' اعظم نے اجنبی کی طرف روٹی بڑھائی۔

''آؤ، تم بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ'' اجنبی نے اعظم کے بھائی کو مخاطب کر کے اپنائیت سے کہا۔

''یہ لے روٹی'' اعظم نے اجنبی کو روٹی تھماتے ہوئے کھانے کی طرف متوجہ کیا۔

''اگر یہ بھی ہمارے ساتھ تھوڑا کھا لے تو بہتر ہو گا'' اجنبی نے التجا کی۔ اعظم کو اجنبی کی بات چبھ سی گئی لیکن مہمان داری کی خاطر تھی لہٰذا بھائی کو بھی ساتھ بٹھانا پڑا۔

''تم لوگ کتنے بھائی ہو؟'' اجنبی نے اچانک سوال داغا۔

''میں نے تو ابھی تیرا نام بھی نہیں پوچھا اور تو ہمارے بھائیوں کی گنتی بھی کرنے لگا'' اعظم کے لہجے میں تلخی گھل گئی۔

اجنبی کھسیانا ہو کر رہ گیا اور کھانے پر جت گیا۔ ابھی اس نے چند ہی نوالے کھائے تھے کہ ہاتھ کھینچ لیا۔

''ارے اتنی جلدی کیوں بس کیا۔ تھوڑا سا اور کھا لے۔ یہ لے چھاچھ پی لے۔'' اعظم نے گلاس اجنبی کی طرف بڑھا کر نرمی سے کہا۔

''نہیں۔ نہیں۔ بس میں نے کافی کھا لیا، اجنبی اپنا جھولا جھولی میں رکھتے ہوئے بولا۔ اعظم نے بھی جلدی جلدی چند نوالے منہ میں ٹھونس کر برتن سمیٹے اور اجنبی سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اچھا اب ذرا یہ بتا کہ تو کون ہے، تیرا نام کیا ہے، کہاں سے آیا ہے اور کام وام کیا کرتا ہے؟''

اعظم نے ایک ہی سانس میں اس سے کئی سوال کر ڈالے۔

''آہاہاہا۔''

اجنبی نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ”تم تو مجھ سے ایسے پوچھ رہے ہو جیسے میں۔۔۔۔“

”کہیں بھاگا جا رہا ہوں۔“ اعظم نے گویا اجنبی کی بات مکمل کر لی۔

”بھاگنے کی بات نہیں کر رہا لیکن تمھارے لہجے سے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں کوئی بہت ہی خطرناک چیز ہوں۔“ اجنبی نے بات مکمل کی۔

”آج کے زمانے میں سگے بھائی کا اعتبار نہیں پھر تو کس کھیت کی مولی ہے۔“ اعظم کے لہجے میں حقارت در آئی۔

”ٹھیک کہا بھائی، آج کل اپنے بھائیوں پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ میرے بابا نے مجھے جب اسکول میں داخل کرایا تھا تو۔۔۔۔“

”تو کیا تو پڑھا بھی ہے۔“ اعظم کچھ کچھ حیران ہوا۔

”ہاں مجھ سے یہ جرم بھی سرزد ہوا ہے۔“

”لیکن تم رہتے کہاں ہو؟“

”میں جب سکول میں داخل ہوا تو پہلے ہی دن میرے ہم جماعتوں سے ایک ایک کر کے میرا تعارف کرایا گیا۔ یہ زیرک ہے۔ یہ ایمل ہے یہ فلانا ہے وہ ڈھمکانا ہے۔ انھیں اپنے ہی بھائی سمجھو۔ سکول کے کام میں یہ سب تمھاری مدد کریں گے۔ اس دن میں خوشی سے پھولا نہ سمایا تھا۔ مجھے اتنے سارے بھائی جو مل گئے تھے۔“

”میں نے تیرے ہم جماعت ساتھیوں کے بارے میں نہیں، تیرے بارے میں پوچھا ہے۔“ اجنبی کی بات مکمل ہوتے ہی اعظم بولا۔ اجنبی چند لمحے خاموش تھا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر اپنا جھولا جھولی سے اٹھا کر دوبارہ جھولی میں رکھ کر بولا۔

”جب سے ہوش سنبھالا ہے یہی سنتا آیا ہوں کہ ہمارا رشتہ اسی مٹی سے ہے۔ ہم صدیوں سے یہاں آباد ہیں۔ یہ ہماری ماں ہے اور ہم اس کے بیٹے۔ اجنبی نے اعظم کا سوال پھر گول مول کر دیا۔

”ماں باپ نے تو آنجناب کا اسم شریف بھی رکھا ہوگا نا۔“

اعظم نے تپ کر پوچھا۔

”میرا نام، تم مجھے کسی بھی نام سے پکار سکتے ہو، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

”کیا مطلب یہ کیا بات ہوئی“ اعظم نے حیرت اور غصے کے ملے جلے انداز میں کہا۔

”میری آپ بیتی ہی کچھ ایسی ہے“ اجنبی کا لہجہ پرسکون تھا۔ بابا مجھے خٹکے (خربوزہ) کہہ کر بلاتے، ماں

مجھے چٹا کہتی اور بہن بھائی مجھے چوچو جب کہ گھر سے باہر گلی محلے میں کچھ اور نام پڑ گئے تھے۔ مسجد میں، میں طالب بڈار تھا، اسکول ماسٹر صاحب زیارل کہا کرتے، یہی ایک نام تھا جو مجھے اچھا لگتا لیکن گلی محلے والوں نے اس نام سے مجھے کبھی نہ پکارا۔

''بچپن میں اس قسم کے ناموں سے سب کا واسطہ پڑتا ہے''اعظم نے گویا وکالت کی۔

''ٹھیک کہا لیکن میرا المیہ یہ ہے کہ میرے ساتھ یہ سلوک آج تک کیا جا رہا ہے۔ جب سے اسکول سے نکلا ہوں۔ مجھے میرے پسندیدہ نام سے کسی نے بھی نہیں بلایا ہے۔''اجنبی نے شکوہ کے انداز میں کہا۔

اسی دوران میں اعظم کا چھوٹا بھائی بغیر چینی کی چائے اور نا فیاں لیے حاضر ہوا۔

اجنبی نے پھر اسے گھورنا شروع کیا۔ اعظم کے بھائی کو اس کا یوں گھورنا شاید اچھا نہ لگا۔ اس لیے پیالی میں چائے ڈالے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ اعظم نے پیالی بھر کر اجنبی نوجوان کو پیش کی لیکن اس نے نظر انداز کر کے نیچے رکھی ہوئی دوسری پیالی اٹھالی۔

''اچھا تو تم کہہ رہے تھے کہ سکول سے نکلنے کے بعد کسی نے بھی تجھے زیارل کہہ کر نہیں پکارا۔ یعنی تیرا اصل نام زیارل ہے۔''اعظم نے دوبارہ بحث چھیڑ دی۔

''میں نے کہہ جو دیا کہ میرا کوئی ایک نام نہیں ہے جس کو جو نام پسند آئے شوق سے اسی نام سے مجھے بلا لیا کرے۔۔۔۔جس نام سے میری زیادہ قیمت لگ سکے۔''اجنبی نے توقف کے بعد آخری جملہ ادا کیا۔

''یہ قیمت والی بات میرے مغز میں نہیں بیٹھی، کیا تجھے کسی نے بیچ ڈالا ہے؟''اعظم نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک میں ہی کیا ہم سب کو مویشیوں کی طرح بیچا جاتا ہے اور ہم ہیں کہ سر جھکائے کھڑے ہیں''۔

''تیرا فلسفہ میری سمجھ سے بالاتر ہے، بہر حال تیرے کہنے کا مطلب ہے کہ تجھے کوئی کسی بھی نام سے پکارے تجھے برا نہیں محسوس ہوتا، نہ غصہ آتا ہے۔''

''غصہ؟ ہاہاہاہا......اجنبی زور زور سے ہنسا، غصہ کرنے کا حق تو صرف اسے ہے جسے اپنے گھر سے ایک نام ملے۔ ہر چند میرا تعلق ایک شریف گھرانے سے ہے مگر............''

''مگر کیا؟''

''مگر وقت نے ایسا پلٹا کھایا کہ بس......موم کی ناک ہو گیا ہوں۔ ہر رخ پر آسانی سے مڑتا ہوں۔ کوڑیوں کے مول بکتا ہوں۔ وفاداری کے بلند و بانگ دعوے کیے جا رہا ہوں لیکن وفاداری ہے کیا، یہ میرے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم۔''اجنبی اچانک جذباتی ہو گیا، شدت جذبات سے اس کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔

اس کے بالوں کی لٹیں اس کی پیشانی پر پھسلی پڑی تھیں، جس کے نیچے پسینے کے قطرے یوں معلوم ہو رہے تھے گویا دھول سے اٹے ہوئے گلاب پر شبنم کے موتی پڑے ہوں۔

اعظم نے گلاس بھر کر اسے دے دیا۔ اجنبی نے گلاس لے لیا، اب وہ جذبات کے گرداب سے نکل آیا تھا۔ اب وہ تھوڑا مسکرا رہا تھا۔

''میں بھی اپنی ماں کی طرح ہر نوجوان کو اپنی اولاد سمجھتا ہوں اور اپنا دل کتاب کی طرح کھول کر اس کے سامنے رکھتا ہوں لیکن وہ کسی بے رحم جلاد کی طرح میرے دل پر چھری پھیر دیتا ہے۔ معاف کرنا میرا لہجہ شاید کچھ زیادہ کڑوا ہو گیا، دراصل مجھے تمھارے شک بھرے لہجے اور نمک خواری کے بھرم نے اپنے دل کی کتاب کھول کر رکھ دینے پر مجبور کر دیا۔ لیکن افسوس کہ زمانہ اعتبار کا نہیں۔''

اجنبی نے تاسف کیا۔

''ہاں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ تو نے اپنی ماں کا ذکر کیا، کیا وہ زندہ ہے؟''

''ہاں ابھی سانس لے رہی ہیں۔''

''کیوں وہ بیمار ہے کیا؟''

''ہاں، جس ماں کی اولاد ہماری جیسی ہو وہ بیمار ہی ہو گی۔ ماں تو خوشی سے پھولا نہ سماتی تھی، یہ سوچ کر کہ اب اس کی اولاد جوان ہو چکی ہے، اس کے دن پھر جائیں گے مگر ....''

اجنبی کے آنسو ٹپ ٹپ گر پڑے۔

''کل تک' تو وہ صرف بھوکی اور مفلس تھی لیکن آج تو ہم نابکاروں نے اس کے لباس کی بھی دھجیاں اڑا دی ہیں۔''

اجنبی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اعظم یکا یک رنجیدہ ہو گیا، اسے یوں لگا گویا اجنبی اسے اس کی ماں کی روداد سنا رہا ہے۔ اجنبی کی آنکھوں سے آنسو یوں نکل رہے تھے گویا انہیں برسوں کی قید سے یکا یک رہائی ملی ہو۔ اعظم کو اجنبی کے آنسوؤں کے پیچھے چھپا ہوا درد اپنے دل میں دھڑکتا ہوا محسوس ہوا، جس کے اثر سے اس کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔

موسلا دھار بارش کے بعد جب جذبات کا طوفان تھما اور اجنبی کے دل کا مطلع صاف ہوا تو وہ پانی کا بھرا ہوا گلاس غٹا غٹ پی گیا جو ابھی تک اس کے ہاتھوں میں تھما ہوا تھا۔

''اگر میری کسی بات سے تمھارے جذبات کو ٹھیس لگی ہو تو میں اس کے لیے تم سے معافی ....'' اعظم

کو اپنے کیے پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔

’’نہیں ۔نہیں، تمھاری باتیں ایسی بھی تلخ نہیں ہیں البتہ تمہارا لہجہ شک اور بے اعتمادی کا ڈسا ہوا ضرور ہے۔ ہم سب بے اعتمادی کے مارے ہوئے ہیں، کبھی تو ہر طرف نفسا نفسی کا بازار گرم ہے‘‘۔

’’تمھاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن میں تم پر اعتماد اس لیے نہیں کر سکتا کہ ....‘‘ اعظم نے قصداً اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اجنبی کی آنکھوں میں دیکھا جس میں بلا کا اعتماد جھلک رہا تھا۔

’’کہ؟‘‘ اجنبی نے متجسس ہو کر پوچھا۔

’’یہی کہ سب لوگ اندر نماز پڑھ رہے تھے اور آنجناب باہر مسجد کی دیوار سے ٹیک لگائے آرام فرما رہے تھے۔ جو بندہ اللہ کے گھر سے دور بھاگتا ہو اس سے کوئی کیا اچھائی کی امید رکھے۔‘‘

’’اللہ کا گھر؟‘‘

’’ہاں کیوں، مسجد اللہ ہی کا گھر تو ہے‘‘

’’آہاہاہا‘‘ اجنبی نے قہقہہ لگایا۔

’’اس گاؤں میں اللہ کے کل کتنے گھر ہوں گے؟‘‘

’’دس‘‘ اعظم نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

’’ذرا ان کے نام بتانا پسند کرو گے۔‘‘

’’ہاں کیوں نہیں، ایک ہماری اپنی مسجد ہے اس کے علاوہ ایک ملک خیل مسجد، خان خیل مسجد، مُلا خیل مسجد اور ....‘‘

’’بس ۔بس ۔بس‘‘ ہاتھ اٹھا کر اعظم کی بات کاٹی۔

’’یہ اللہ کے گھر تھوڑے ہیں، یہ تو لوگوں کی ذاتی ملکیتیں ہیں اور لوگ جب چاہیں، جیسے چاہیں انہیں استعمال کرتے ہیں۔ اگر یہ اللہ کے گھر ہوتے تو اللہ کی مرضی کے مطابق چلائے جاتے۔ یہاں تو سب اپنی اپنی کرنی کرتے ہیں۔‘‘

’’ہاں یہ تو ہے مگر......‘‘

’’مگر کیا‘‘ اجنبی اعظم کی بات پکڑ کر بولا۔

جب تک تم لوگوں کی مرضی نہ ہو ہم جیسے بے کس و بے سہارا مسافر مسجد کے احاطے میں قدم تک نہیں رکھ سکتے۔ اور تو اور ایک محلے کا نمازی دوسرے محلے کی مسجد میں بلا جھجک نماز نہیں پڑھ سکتا کہ کہیں وہ محلے والے

برا نہ مان جائیں۔ مسجد اپنے نام سے بن بنوا کر کتنی جی داری سے کہہ دیتے ہو ’’اللہ کا گھر‘‘۔

اعظم اجنبی کی پرزور دلیل اور حاضر جوابی پر لاجواب ہو کر رہ گیا۔

’’رات بہت ہو گئی ہے۔ تم تھک چکے ہو گے، آرام کر لو، باقی باتیں انشا اللہ صبح کو ہوں گی۔ مجھے بھی زوروں کی نیند آ رہی ہے۔ اچھا خدا حافظ‘‘۔

اعظم نے محفل برخاست کر لی، جب اعظم جانے لگا تو اجنبی نے اسے اس کے چھوٹے بھائی کے ہاتھ پانی بھجوانے کا کہا۔

اعظم نے ’’اچھا‘‘ کہہ کر خالی جگ اٹھا لیا۔

چھوٹا بھائی کتابیں سمیٹ کر سونے کی تیاری کر رہا تھا، اعظم نے اسے خالی جگ تھما کر مہمان کے لیے پانی لے جانے کو کہا۔

’’ٹھیک ہے لالا، ابھی لے کر جاتا ہوں‘‘ چھوٹے بھائی نے ادب سے کہا۔

اگلی صبح حسب معمول اعظم نماز کے لیے جانے لگا تو بیٹھک کا دروازہ کھٹکھٹایا تا کہ مہمان کو بھی نماز کے لیے جگا دے۔ جواب نہ ملنے پر دھیرے سے دروازہ کھولا اور اندر دیکھا لیکن چارپائی خالی پڑی تھی۔ پریشان ہو کر کمرے کا جائزہ لیا، ہر چیز حسب سابق اپنی اپنی جگہ پر پڑی تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر مسجد کی راہ پکڑ لی۔

مسجد میں پہلے سے دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے جو چہروں مہروں سے کسی دینی مدرسہ کے طالب دکھتے تھے۔

نماز ہو چکی تو مسجد کے پیش امام نے اعظم کو آواز دے کر روک لیا۔

’’تم سے کچھ بات کرنی ہے۔‘‘

اور اعظم کو ساتھ لے کر اپنے حجرے کا رخ کیا، کچھ دیر بعد وہ دو آدمی بھی وہاں آ گئے۔ اعظم نے ان دونوں سے مصافحہ و معانقہ کیا۔

’’رات تمھارے پاس جو مہمان ٹھہرا تھا اسے نماز کے لیے ساتھ لے کر نہیں آئے۔‘‘

پیش امام نے اعظم سے پوچھا۔

’’یا حضرت میں تو اسے جگانے گیا تھا مگر وہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھا، میں نے سوچا شاید نماز پڑھنے مسجد گیا ہو۔‘‘

’’کیسے نہیں تھا‘‘

مولوی صاحب کا انداز ایسا تھا جیسے اعظم نے اجنبی کو کہیں چھپا دیا ہو۔

''معلوم نہیں کدھر گیا'' ہم رات گئے تک جاگ رہے تھے۔ اس کے بعد میں گھر جا کر سو گیا اور جب صبح اسے جگانے گیا تو وہ بیٹھک میں موجود نہیں تھا۔

''کیا تم اسے پہلے سے جانتے تھے؟''

اس بار آواز ایک طالب کی تھی۔

''نہیں تو۔۔۔ میں نے اللہ کا مہمان سمجھ کر اسے اپنے پاس ٹھہرا لیا تھا۔''

''آخر وہ تھا کون؟''

طالب کا لہجہ سخت گیر ہو گیا۔

''میں نے کہہ جو دیا نہیں جانتا۔'' اعظم کا لہجہ بھی درشت ہو گیا۔

''ملحد تھا وہ، ملحد، ہماری جاسوسی کرنے آیا تھا۔ رنگ و نسل سے پختون ضرور تھا مگر تھا مخالفین کا پکا جاسوس۔''

طالب ایسے انداز میں بول رہا تھا گویا وہ اس کی رگ رگ سے واقف ہو۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ظاہری طور پر تو وہ ٹھیک ٹھاک اور سلجھا ہوا لگ رہا تھا، باقی دلوں کے بھید خدا جانے۔''

''اس نے تمھیں اپنا ٹھکانا، اتا پتا وغیرہ کچھ بتایا؟'' دوسرے طالب کی آواز گونجی۔

''نہیں۔ اس نے کچھ نہیں بتایا۔''

''میں نہ کہتا تھا، جاسوس ہے، جاسوسی کرنے آیا ہے۔''

طالب نے مولوی کی طرف گردن موڑ کر فاتحانہ انداز میں کہا۔

''ایسے لوگوں کو کبھی اپنے پاس نہ ٹھہرانا جو نہ تو اللہ کو پسند ہوں اور نہ اللہ کی مخلوق کو۔'' مولوی صاحب نے اعظم کو تاکید کر دی۔

''جی اچھا مولوی صاحب۔'' اور اعظم وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ تمام راستے میں وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ آخر وہ اجنبی کون ہو سکتا تھا اور یہ کون لوگ ہیں جو اس کی تلاش میں آئے ہیں۔

گھر جا کر ابھی ناشتہ کیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو اعظم کا دل دھک سے رہ گیا۔ باہر پولیس والے کھڑے تھے۔

''بیٹھک کھولو۔'' ان کے لہجے میں تحکم تھا۔

اعظم نے دروازہ کھولا۔ اجنبی کا بستر جوں کا توں بچھا پڑا تھا۔ اس نے پولیس سے بیٹھنے کے لیے کہا اور خود جا کر چھوٹے بھائی سے چائے لانے کا کہہ کر واپس آیا۔

“یہ آدمی کدھر گیا۔” ان میں سے ایک نے چارپائی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

“جی کون؟” اعظم پریشان ہو گیا۔

“رات کو اس بستر پر کون سویا تھا؟” اس نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

“اجنبی مسافر تھا کوئی، اسے اپنے پاس ٹھہرایا تھا۔”

“اجنبی تھا یا شناسا۔” اس نے اعظم کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔

“میں کچھ سمجھا نہیں، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔” اعظم کی پریشانی بڑھ گئی۔

“وہ دہشت گرد تھا، دہشت گرد، کسی زمانے میں مجاہد تھا، اب طالب بن گیا ہے۔”

وہ اپنا منہ اعظم کے قریب کر کے بولا۔ اعظم کے ذہن میں یکایک اجنبی کے الفاظ گونجے، “میرا کوئی ایک نام نہیں، جس کو جو نام پسند ہو شوق سے اسی نام سے بلا لیا کرے، ہر اس نام سے ۔۔۔۔ جس سے میرے دام زیادہ لگیں۔”

اتنے میں اعظم کا بھائی چائے لے کر آ گیا۔

“میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ میرے لیے تو وہ ایک مسافر تھا، میں نے ترس کھا کر اس کو جگہ دی اور بس۔ نہ اس کا نام جانتا ہوں نہ اس کا ٹھکانہ۔

“لالہ رات جب میں اس کے لیے پانی لے کر آیا تو اس نے اپنے جھولے سے یہ قلم نکال کر مجھے دیا۔” اعظم کے بھائی نے جیب سے قلم نکال کر دکھایا۔

“اس نے مجھ سے کہا کہ اس سے اپنا نام لکھ دینا، نہیں تو میری طرح تیرے بھی بے شمار نام پڑ جائیں گے اور کہا کہ ہوشیار رہنا۔ کہیں کوئی تجھے اس راستے سے بھٹکا نہ دے۔ تم اس قوم کا روشن مستقبل ہو۔

“اس کے علاوہ کیا کچھ کہا۔ یعنی کہ کہاں رہتا ہوں۔ کام وام کیا کرتا ہوں۔” وردی والے نے مداخلت کی۔

“اور تو کچھ نہیں کہا، بس اتنا بتایا کہ میں ایک بے نام مسافر ہوں۔ ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہتا ہوں۔

☆☆☆☆

شیراز اختر مغل

پوٹھوہاری زبان سے ترجمہ: شیراز طاہر

بڑائی

کہتے ہیں
رب کی کوئی شئے
بیکار نہیں ہوتی
ربی جس کو ہار نہیں ہوتی
میں کیچڑ میں پڑا ہک پتھر ہوں
مجھ کو چاہے باہر نہ رکھو
لیکن مجھ پر پیر تو رکھو
بچو!
تم تو پار ہو جاؤ

☆☆☆☆

پوٹھوہاری تخلیق وترجمہ: شیراز طاہر

جونک

زنان خانے سے نکلتے ہوئے نانی اماں مجھ پر یوں جھپٹیں، جیسے چیل بچے پر، یا بچے کٹی پتنگ پر۔ میں پیچھے دیکھے بنا زور سے چیخا:

"اماں! رضیہ کہیں بھاگی نہیں جا رہی، رضیہ کا بیاہ جانے اور میں، بس۔"

"اچھا! یہ کہیں بھاگی نہیں جا رہی تو ہنڈیا میں پکا کر کھا لینا۔"

نانی اماں نے جواب دیتے ہوئے اپنے چہرے کی جھریوں کو اس طرح سمیٹ لیا جیسے گتے کے بنڈے میں پڑی رولیکس سوئیاں۔ میرا دل کھا لینے کو چاہنے لگا مگر گارے سے لیپ کیے کچے برآمدے میں بندھے بیلوں، جن کی گردنوں کو میں نے ابھی ابھی ہل چلانے کے بعد جوے سے آزاد کیا تھا ان کی طرف دیکھ کر حویلی کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

چڑیلیں اور بدمعاش عورتیں نجانے کہاں کہاں سے میرے گھر میں مجھے سمجھانے کی خاطر گھس آئی تھیں اور مجھے اپنا گھر کسی آسیب کا گھر دکھائی دینے لگا تھا۔ ان سب کی جیبیں خالی تھیں۔ روپے پیسے آنہ دوآنے کسی کے ازار بند تک میں بھی نہ بندھے تھے۔ ہاں ایک عورت کے پراندے میں موری والا پیسہ لٹک رہا تھا یا ایک چھوٹے سے معصوم بچے کی گردن میں چاندی کی ٹیڑھی سی لکیر پڑی تھی، جس کا آدھا حصہ تانبے کے سکوں سے پُر تھا۔

میں نے چاہا کہ اس سفید لکیر کو مٹا کر پیسوں کو نوچ لوں اور پھر اس عورت کی طرف بڑھ جاؤں جس کے پراندے میں پڑا ہوا پیسہ لٹک رہا ہے۔ ورنہ اس کے سوا مجھے کسی سے کچھ نہیں مل سکتا۔ البتہ نسوار کی ڈبیا، کڑوا تمباکو، اور لکڑی کی لمبی نے والی مٹی کی چلم ضرور مل سکتی ہے۔ لیکن مجھے تو پیسے چاہئیں، زیور چاہیے، کپڑا چاہیے۔ نصیحتوں کو بھلا میں کہاں باندھوں گا؟ ان کا میں کیا کروں گا۔

میں نے غیر ارادی طور اپنا ہاتھ قمیض کی جیب میں ڈالا۔ شکر کا بورا اور مٹی میری انگلیوں سے اس طرح چمٹ گئی جس طرح برسوں سے میری غریبی میرے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ میں نے چاہا کہ حویلی کے دروازے کو چھوڑ کر ایک تیز دوڑ لگاؤں تاکہ دور کھیتوں کے اس پار اونچے سے ریتلے ٹیلے پر چڑھ کر نیچے گدلے پانی کے جوہڑ میں چھلانگ لگا دوں جہاں بہت ساری جونکیں میرے وجود سے چمٹ کر میری مفلسی کا خون چوس لیں،

اور میں نانی اماں کی اس بات پر راضی ہو جاؤں کہ اپنی بہن کی ڈولی بغیر کہاروں کے اٹھائے گھر سے نکال دوں۔ میری وہ بہن جو بچپن سے ہری اور لال رنگ کی چوڑیوں کے لیے ترستی رہی ہے، آج ننگی بانہیں میرے گھر سے نکل جائے۔ جو یہ چاہتی تھی، کہ میرا بھائی میرے لیے سونے کی سنہری زنجیر لائے جسے وہ اپنی کُرتی میں لگا کر گھر سے باہر گلی میں نکلے۔ پاؤں میں چاندی کی پازیب اور ماتھے پر سونے کا ٹکہ نہ سہی تلک تو ضرور ہو۔ مگر میری انجان بہن یہ نہیں جانتی تھی، کہ میرے اس بھائی نے اپنی بہن کے تلک لگانے سے پہلے ہی اپنے ماتھے پر غریبی کا تلک لگا لیا ہے۔ اور اسکا حق کسی حقدار کو دینے سے انکار کر دیا ہے۔ پھر فیصلہ سناتے ہوئے زنان خانے سے بھاگ آیا ہے، کہ کہیں نصیحتوں کے علاوہ نانی اماں بد دعا پر نہ اتر آئیں، مگر مجھے کسی بد عا کا خوف نہ تھا چوں کہ اب میں بڑا تھا۔۔۔ لیکن بڑا ہونا بھی تو ایک جرم ہے، بڑوں کو چھوٹوں کے حق ادا کرنے پڑتے ہیں۔ میرے پاس کیا ہے۔۔ میں کیا دوں؟

ایک دوڑا اور تیز دوڑ جو میں دوڑنا چاہتا تھا دوڑ پڑا۔ گاؤں کی گلیاں، کھیت، پگڈنڈیاں پھلانگ پھلانگ کر دوڑا پھر بھی وہیں ہوں، حویلی کے دروازے پر۔۔ کیا کروں میں اپنی بہن کو بھی تو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ جو صرف اور صرف میرے فیصلے کی منتظر ہے۔ میرا پیار، میری ہمدردی جو بہن کے لیے وقف تھی، ایک بار پھر زنان خانے کی طرف لے جانے پر مجبور کرنے لگی۔ نانی اماں کی آتی صاف آوازیں میری سبز فصل کے پودوں پر آہنے ٹوکے کی طرح پڑ رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں یہ دوزخی۔۔۔ یہ بد دعایا اسی دن کے لیے پیدا ہوا تھا۔ کہ میرے سفید بالوں پر کیچڑ پھینکے۔ بہنو! میں نے اسے اس طرح پالا ہے جیسے مرغی بطخ کے انڈوں سے نکلے ہوئے بچوں کو پالتی ہے۔ اسکا قصور نہیں اس کی جدّی کا خون ہی ایسا ہے۔

یعنی کہ ہم غریب ہیں۔ غریب باپ سے غریب بیٹے پیدا ہوئے ہیں۔ میں تلملا کر رہ گیا۔ کیا کروں؟ نانی اماں کو گالیاں دوں، ان کا گلا دبا دوں۔ یا پھر پاس بیٹھی عورتوں سے یہ جبری کام لوں کہ نانی اماں کو گھسیٹ کر میری شکستہ حویلی سے باہر پھینک آئیں۔ مگر پھر بھی نانی اماں کی لاتعداد نصیحتیں ڈھیر ساری دلیلیں اتنی تلخ باتیں میرے مُفلسی کے ٹھنڈے خون کو گرما نہ سکیں۔ بلکہ نانی اماں مجھے دیکھتے ہی پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگیں اور تمام زنان خانہ بھی قہقہوں سے اس طرح بھر گیا، جیسے زنان خانے میں بیٹھی ہوئی تمام سپیرنوں نے اپنی اپنی پٹاریوں سے سانپ نہیں بلکہ قہقہوں کے سر باہر نکال دیئے ہوں۔ ان قہقہوں کی گرمی سے مجھے یوں لگا، جیسے میری بہن کا جسم کالا ہو رہا ہے۔ میرا کوئی بھائی اسے پسند نہیں کر رہا۔ میں پھر دوڑ پڑا۔ قہقہے میرا پیچھا کرنے لگے۔ قہقہوں کے پیچھے میری بہن دوڑنے لگی۔ میں سب سے آگے تھا۔ ایک ارادہ لے کر بھاگ رہا تھا۔ ایک فیصلہ، ایک حق لیے دوڑ رہا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا میری بہن یورپ میں پیدا ہوتی اپنی مرضی سے اپنا بَر تلاش کر لیتی اور مجھے عورتوں کی اس مجلس سے ذلیل ہو کر نہ بھاگنا پڑتا۔ جس محفل کی کنواریاں یہ کہتی تھیں کہ تیرا بھائی کوئی بھائی ہے یا فولاد کا ٹوٹا۔

میری بہن ان کو کوئی جواب نہ دیتی اور خاموش ہو جاتی، تب یہ فرض میرے سر پر گناہ بن کر بھاری ہونے لگتا میں دوڑتے دوڑتے تھک گیا۔ قہقہے رُک گئے۔ قہقہوں کے پیچھے بھاگتی میری بہن رُک گئی۔ مگر اس کا لباس تار تار ہو گیا۔ اس کا دوپٹہ اس کے سر پر نہ رہا۔ وہ مجھے بار بار منہ کھولے کاٹنے کو دوڑتی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے اپنے حق کا گوشت مانگ رہی ہے۔ میں اب کیا کروں۔ میرے پاس کیا ہے۔ ایک فیصلہ جو مضبوط گرفت سے تھامے میں پھر دوڑ پڑا۔ قہقہے رُک گئے البتہ میری بہن ویسے ہی ننگے بدن میرے ساتھ دوڑ پڑی اُف اللہ۔۔۔۔ بہن کا ننگا بدن اس کے حق کا گوشت۔ اسکا میکہ، زنان خانہ اور قہقہے، میں لڑکھڑا گیا۔ پھر سنبھلا۔ اتنے میں میری بہن دوڑتے دوڑتے میرے ساتھ لگ گئی۔ میں نے حویلی کے دروازے کی طرف دیکھا، عورتیں ہماری دوڑ کو دیکھنے باہر نکل آئی تھیں۔ اب میں تھا اور میری بہن تھی۔ اسکے حق کا گوشت تھا اور میں فولاد کا ٹوٹا۔

اچانک دوڑتے دوڑتے میری نظریں دور راہ چلتے ایک شخص پر پڑیں۔ نجانے رحم کا جذبہ کہاں سے ایزی لوڈ کی طرح میرے دل میں داخل ہو گیا میں اسکی جانب دوڑ پڑا۔ وہ میری طرف نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے میری بہن کی جانب بڑھنے لگا میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مڑا۔ میری بہن کا گوشت۔ اسکی سرخ سرخ بوٹیاں۔۔ میرا وہ بھائی نوچ نوچ کر کھانے لگا۔۔۔۔ یہ غلط ہے۔۔۔ میں زور سے چیخا اور حواس کو قابو کرنے کی کوشش کی تب مجھے معلوم ہوا، کہ وہ شخص دراصل میری بہن کو سرخ مخمل کی گٹھڑی بنا کر اس سے پیار کر رہا تھا۔ اسکا منہ چوم رہا تھا۔ اسے دلہن بنا رہا تھا۔ مگر۔۔۔ مگر اب اسے یہ کیا ہو گیا ہے۔ اب اسے یہ کیا کہہ رہا ہے؟

’’تیرا زیور کہاں ہے؟‘‘

’’تیرے کپڑے کہاں ہیں؟‘‘

’’تو ننگی کیوں ہے؟‘‘

’’تیرا جہیز، تیرا داج تیرا سب کچھ کہاں ہے۔"

کتنے شرم کا مقام ہے۔ کتنی بڑی گالی ہے۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ ایک لمحے کیلیے مجبوری کی گانٹھ میں بندھی ہوئی دوڑ پھر دوڑ پڑا۔ اور دوڑتے دوڑتے کھیتوں کے اس پار اونچے سے ریتلے ٹیلے پر چڑھ کر نیچے پانی کے گدلے جوہڑ میں چھلانگ لگا دی۔ نیچے کا کیچڑ اوپر آیا اور اوپر کا صاف پانی نیچے جا کر گدلا ہو گیا۔ میں تمام دن اس گدلے پانی میں نہاتا رہا۔ بیسیوں جونکیں اپنے بدن سے اتار کر پھینک ڈالیں لیکن پھر بھی وہ میرے وجود سے میری مفلسی کا خون نہ چُوس سکیں۔ جب شام ڈھلے کیچڑ سے لت پت گھر پہنچا تو زنان خانہ خالی تھا۔ اور میرے دونوں کندھے بُری طرح دُکھ رہے تھے، جیسے میں اپنی بہن کی ڈولی دُور بہت دُور چھوڑ کر ابھی ابھی گھر لوٹ رہا ہوں۔

☆☆☆☆

پنجابی تخلیق و ترجمہ: اخلاق عاطف

کگھ پردیسی

دریاؤں نہروں کے کنارے بسنے والے
سوہنے سچے لوگو
سدا رہو آباد
بہتی لہروں کے سنگ لُکن میٹی کھیلنے والو
رہو ہمیشہ شاد

ہاں پر کبھی، ہمیں بھی اپنی پیار نظر سے دیکھو
اِن بہتی لہروں کی طرح
ہم نے بھی
نہیں اِدھر دوبارا آنا
ہم پردیسی
جن کی کوئی قدر نہ کوئی ٹھکانا
جانے کہاں ہو جانا

☆☆☆☆

ملک شاہ سوار علی ناصر

پنجابی زبان سے ترجمہ: گل حسن بدر

بھاگ بھری

بھاگ بھری اپنے کام کی طرح انتہائی خوش قسمت لڑکی تھی۔ وہ اپنے گاؤں کے پرائمری سکول سے پانچ جماعتیں ہی پاس کرپائی تھی۔ مزید تعلیم کے لیے اسے گاؤں سے دور جانا پڑتا تھا اور ان کے ہاں ایسا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ یوں یہ بھاگوں بھری لڑکی پرائمری تعلیم تک محدود ہو کے رہ گئی۔

بھاگ بھری کا والد سلطان اس گاؤں کا نمایاں زمیندار تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی زمان تھا۔ یہ دونوں بھائی ایک ہی چھت تلے بڑے مزے سے زندگی گزار رہے تھے۔ سلطان کی اکلوتی اولاد بھاگ بھری اور زمان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ بھاگ بھری اور علی ہم عمر تھے۔ اس گھرانے کی خواہش تھی کہ علی کو پڑھا لکھا کر فوج میں افسر بھرتی کروانا ہے اور پھر رب کریم نے ان کی سُن لی کہ علی پاک آرمی میں کمیشن لے کر کامیاب ہو گیا۔ جب وہ بھرتی ہوا تو یہ خبر گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ سلطان اور زمان کے دارے پر ڈھولوں کے تھاپ گاؤں والے ناچنے آئے۔ گاؤں والوں کے ساتھ اس گھرانے کا رویہ اس قدر محبتوں بھرا تھا کہ ہر آدمی خوش تھا۔ یہ لوگ گاؤں کے غریب غربے لوگوں کا خیال رکھا کرتے تھے۔ جس کے گھر دانے وغیرہ ختم ہو جاتے یہ خاموشی سے دو بوریاں وہاں رکھوا دیتے۔ یہ دونوں بھائی گاؤں کے مسیحا تھے۔ بھاگ بھری علی کے آرمی میں آفیسر بن جانے پر بہت خوش ہوئی۔ اس نے دوڑ دوڑ کر گاؤں بھر کی سہیلیوں کو بتایا کہ علی بہت بڑا آفیسر بن گیا ہے۔ اب ہمارے گاؤں کی تقدیر سنور جائے گی۔ یہاں بتیاں روشن ہو جائیں گی۔ سڑکیں پختہ ہو جائیں گی۔ سکول ہائی بن جائیں گے۔ کنوؤں کی جگہ واٹر سپلائیاں بن جائیں گی۔ ہمارے دن پھر جائیں گے۔ دوسری طرف سلطان اور زمان پھولے نہیں سمارہے تھے۔ پورے گاؤں میں جشن کا سماں تھا۔ علی اور بھاگ بھری کی مائیں آپس میں سگی بہنیں تھیں۔

ٹریننگ کی تکمیل کے بعد علی کشمیر چلا گیا۔ ہمارے وطن میں جہاں آفیسروں کی ٹریننگ ہوتی ہے وہاں نجانے انگریز نے نفرتوں کی بنیاد پر نصاب ترتیب دیا تھا کہ جو بچہ یہ نصاب پڑھ لے اس کے پر پرزے نکلنا شروع

ہو جاتے ہیں۔ جو بچہ اپنے ماں باپ اور عزیزوں پر جان چھڑکتا ہو، اس کے رویوں میں تبدیلی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ وہ خود کو عقلِ کُل سمجھنے لگتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ یہ ہونہار بچے بالکل بدل جاتے ہیں۔

علی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ تفاخر کے بوجھ تلے آ کر خود کو سب کچھ سمجھتے ہوئے عقل کل ہوتا گیا۔ وہ جب بھی چھٹی آتا تو اسے ملنے گاؤں کا گاؤں ان کے دارے پر اُمنڈ آتا۔ مگر وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ ان دیہاتیوں سے جب بات کرتا تو انگریزی زبان میں۔ لوگوں نے جب سلطان اور زمان کے اس نوخیز آرمی افسر کا رویہ دیکھا تو حیران ہو کے رہ گئے۔ سلطان اور زمان نے پروگرام کے تحت بھاگ بھری اور علی کی شادی کر دی۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ شادی مثال تھی۔ پورے گاؤں نے اس شادی میں بھرپور حصہ لیا۔ مگر علی کا رویہ وہی رہا۔ جس سے لوگ خاصے مایوس ہوئے۔ شادی کے چند دن بعد علی واپس چلا گیا۔ فون پر باتیں ہوتیں رہیں۔ اس کے بعد علی گاؤں لوٹ کر نہ آیا۔ وہ گاؤں سے دُور ہوتا گیا اور فوج میں ترقی کرتا چلا گیا۔ اسی دوران علی کے ہاں ایک خوبصورت بیٹے نے آنکھ کھولی۔ جسے جہانزیب علی کا نام دیا گیا۔ جہانزیب علی کے پیدا ہونے پر اس گھر میں پھر سے خوشیاں آن بسیں۔ کرنل علی نے شہر میں اپنے ایک اعلیٰ آفیسر کے ہاں دوسری شادی رچا لی۔ گاؤں کے لوگوں نے جب یہ بات سُنی تو انھوں نے نفرت سے علی پر تھو تھو کی۔

بھاگ بھری ایک سگھڑ صابر اور شاکر عورت تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کی تعلیم پر توجہ مرکوز رکھی۔ سلطان اور زمان نے کرنل علی کو پیغام بھجوا دیا کہ اب گاؤں پلٹ کر کبھی آنے کی کوشش نہ کرے کہ ہمارا اور تمہارا رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ بھاگ بھری کے بخت بیدار تھے۔ اس کے بیٹے نے اعلیٰ تعلیم کے لیے کوالیفائی کر لیا اور وہ بیرونِ ملک سے بینکنگ کی اعلیٰ ڈگری لے کر لوٹا اور پھر اسے انتہائی اعلیٰ درجے کی ملازمت مل گئی۔ سلطان اور زمان جہانزیب علی کی وجہ سے پھر سے جوان نظر آنے لگے۔ ان کے دارے کی رونقیں پھر سے بحال ہو گئیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو بہت جلد اپنے کیے کی سزا مل جاتی ہے۔ کرنل علی جو خود کو صرف اور کرنل علی سمجھتا تھا۔ ایک بہت بڑے کرپشن کیس میں آ کر آرمی سے بارہ پتھر ہو کر گھر آ گیا۔ جب اس کی چہیتی بیوی کو یہ خبر ملی کہ اس کا شوہر فوج سے بارہ پتھر ہو کر گھر آ گیا ہے، تو وہ آگ بگولہ ہوئی اور پھر اس نے کرنل علی جو اَب صرف علی رہ گیا تھا، سے طلاق لے کر اسے گھر سے دھکے دے کر نکال دیا اور پھر اس بوڑھے آسمان نے دیکھا کہ ایک مغرور انسان اس سگھڑ عورت سے معافی مانگ رہا تھا اور پھر بھاگ بھری نے اسے معاف کر کے اس بھاگوں بھرے پنڈ کی خوشیوں کو لوٹا دیا۔

☆☆☆☆

سید حفیظ اللہ گیلانی

سرائیکی زبان سے ترجمہ: احسان بلوچ

حاجت مند

اس بستی کا پرانا نام جھوک دیال چند تھا۔ بیس پچیس یا زیادہ سے زیادہ تیس گھروں پر مشتمل ان بستی والوں نے سیلاب سے بچنے کے لیے اپنی مدد آپ کے تحت بستی کے اطراف میں مٹی کا حفاظتی بند باندھ رکھا تھا جسے عرف عام میں شہر پناہ کہتے تھے۔ بستی کے عین وسط میں ایک مسجد، جنوبی طرف مکینوں کی مشترکہ بیٹھک، جب کہ مغربی کونے میں ایک دھرم شالا تھی جس کے ساتھ ہی ہندوؤں کے چار پانچ مکانات تھے۔ دیال چند بھی انہی کا کوئی رشتہ دار تھا جس کے نام پر یہ بستی مشہور تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب زمینوں کی اتنی وقعت نہیں ہوا کرتی تھی۔ تب کوئی بھی بے گھر کسی کی زمین میں جھونپڑا ڈال کر آباد ہو جاتا۔ دیال چند کی زمین میں بھی چند مسلمان گھرانے بغیر قیمت ادا کیے آباد تھے۔ بستی کے تمام افراد پر سکون زندگی گزار رہے تھے۔ ہر سو خوشحالی تھی۔ چھوٹے موٹے مسائل کے علاوہ کبھی کوئی لڑائی جھگڑا یا دنگا فساد نہیں ہوا تھا۔

تقسیم ہند کے بعد ملک کے دوسرے ہندو گھرانوں کی طرح جھوک دیال چند کے ہندو بھی یہاں سے ہجرت کر گئے۔ ان کے جاتے ہی مسلمانوں نے تمام گھروں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد پہلا کام جو اتفاق سے کیا گیا وہ بستی کا نام تبدیل کرنا تھا۔ مولوی صاحب کے مشورے سے بستی کا نیا نام جھوک اسلام رکھا گیا۔ اس نام پر گاؤں کے تمام چھوٹے بڑے عورتیں مرد خوشی خوشی متفق ہو گئے۔ بھلا لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کے بعد گاؤں میں کبھی کسی بات پر اتفاق نہ ہوا۔ ہر کام پہ فساد، ہر کام پہ جھگڑا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے پاک ہوتے ہی اس گاؤں کو کسی بدنظرے کی نظر لگ گئی ہو یا جیسے بستی کے ہندو جاتے جاتے اتفاق و اتحاد بھی لپیٹ کر اپنے ساتھ لے گئے ہوں۔

ہندوؤں کو گئے پچاس سال بیت گئے تو بستی کی آبادی بھی پچاس گھروں سے بڑھ گئی۔ اب یہاں ایک پرائمری سکول بھی بن گیا تھا جس کی پختہ دیوار کا سایہ جب مدو کمیرے کے آنگن میں اترتا تو سب گھر والے

یوں خوش ہوتے جیسے معصوم بچے سریہہ (سرس) کے نیچے گری ہوئی شکلو (من) سمیٹ کر خوش ہوتے ہیں۔ اس شکلو جیسی میٹھی چھاؤں کے علاوہ کبھی کسی خوشی نے ان غریبوں کے گھر بھولے سے بھی قدم نہیں رکھا تھا۔

صبح ہوتے ہی مدو کیرا شہر پناہ پر بان بٹنے کے لیے پہنچتا تو اس کا ضعیف باپ مسو کیرا بھی اپنی چارپائی وہیں گھسیٹ لاتا۔ جب کہ اس کی دس بارہ سالہ بیٹی تاجی اپنے باپ کے آگے بان بٹتے بٹتے الٹے قدموں چلتی ہوئی بہت دور تک نکل جاتی۔

تاجی کی ماں اکثر بیمار رہتی تھی۔ وہ بھی سارا دن شہر پناہ کے نزدیک کھگل (فراش) کے نیچے سوئی رہتی اور اپنی بچی کو بان بٹتا دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ اسے اپنے دکھ سے زیادہ اپنی معصوم بچی کا دکھ کھائے جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا وہ بھاگ کر جائے اور اپنی بچی کو چوم کر چھاؤں میں لے آئے لیکن وسو کیری کا بس نہیں چلتا تھا۔ اس لیے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی بیٹی کو دیکھتی رہتی۔ اسے تاجی کے ہاتھ میں گھومنے والی چرخی کی ٹک ٹک سے شدید نفرت تھی۔ نفرت تو اسے لاؤڈ سپیکر کی بھیانک آواز سے بھی تھی جو صبح شام چندہ اکٹھا کرنے کے لیے مساجد سے بلند ہوتی اور اس کے اضطراب میں مسلسل اضافے کا موجب بنتی۔

لیکن تاجی کی بات اور تھی۔ وہ مساجد سے چندہ اکٹھا کرنے کے اعلانات اور لاؤڈ سپیکر کی بے ہنگم سرتال پر بڑی خوبصورتی سے چرخی کو نچاتی اور اپنے کام میں مگن رہتی۔

گزرتے وقت کیساتھ گاؤں میں مساجد کے سفید مینار کھمبیوں کی طرح نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جنھیں دیکھ کر یہ بستی سچ مچ جھوک اسلام ہی لگتی تھی۔ کیوں کہ تقسیم ہند کے بعد نہ صرف گاؤں سے کفر کا خاتمہ ہو گیا تھا بل کہ شیطان لعین بھی جیسے بوریا بستر گول کر گیا تھا۔ ہر پانچویں گھر کے ساتھ بننے والی مسجد یہاں شیطان مردود کے پاؤں نہیں ٹکنے دیتی تھی۔ لیکن ان پڑھ مسو کیرا جسے شاید ٹھیک سے کلمہ بھی نہیں آتا تھا ہر وقت بکتا رہتا کہ اب شیطان نے بستی میں گھر کر لیا ہے۔ بھوکا شخص خدا سے بھی لڑتا ہے۔ اسے تو اس بات پر بھی غصہ تھا کہ بستی کی دھرم شالہ کو گرا کر جب وہاں نئی مسجد تعمیر کی گئی تو مسو کیرے کا گھر بھی خالی کرا لیا گیا اور اسے مسجد میں شامل کر کے صحن وسیع کر دیا گیا تھا۔ تب یہ بے چارہ شہر پناہ کے قریب ایک کچا کوٹھا ڈال کر آ بیٹھا۔ پھر جب اس کوٹھے کے ساتھ سرکاری سکول بننے لگا تو مسو کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں اسے دوبارہ بے گھر نہ ہونا پڑے۔ تاہم اس کی خوش قسمتی کہ سکول کا احاطہ پورا ہو گیا۔ عمارت مکمل ہوئی اور پختہ دیوار کا سایہ مفت میں اسے حاصل ہو گیا۔

مسو کنیرا صرف ان پڑھ اور حاجت مند ہی نہیں تھا بلکہ پرلے درجے کا بے وقوف بھی تھا۔ اسے تو اتنا علم بھی نہیں تھا کہ ایک مسلک کے لوگ دوسرے مسلک کی مسجد میں نماز پڑھنا اپنی انا کے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب مسلک کی بنیاد پر تیسری مسجد تعمیر ہونے لگی تو یہ بد بخت کہنے لگا۔

"بستی میں اب مسلمان تو ہیں مسلمانی ختم ہو گئی ہے"۔

گاؤں کے جو نوجوان مولوی صاحب سے حفظ اور دیگر دینی تعلیمات حاصل کر کے فارغ ہو چکے تھے۔ ان کے روزگار سے زیادہ مولوی صاحب کو بستی میں علم پھیلانے کی نہایت فکر تھی۔ اس لیے ایک بڑا مدرسہ اور ساتھ ہی چوتھی مسجد چندہ اکٹھا کر کے بنائی گئی۔ مساجد کے لاؤڈ سپیکر کے ذریعے چندہ اکٹھا کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ پیسے دیتے ہی بستی والوں کے جنت میں گھر بننا شروع ہو گئے تھے۔ جب گاؤں کے تقریباً سب لوگوں نے جنت میں جگہ حاصل کر لی تو ایک دن تا جی نے نہایت معصومانہ انداز میں اپنے دادا سے پوچھا۔

"دادا۔۔ہم چندہ دیکر جنت میں اپنا گھر کب بنوائیں گے؟"۔

جواب میں اس کا دادا رونی صورت لیے ہنس پڑا اور بولا۔

"پیٹ کا دوزخ بھریں یا جنت میں گھر بنوائیں؟ ۔خدا نیت کو دیکھتا ہے پُتر۔ اس ریا کاری اور دکھاوے کے ڈھنڈورے کو نہیں"۔

یہ بات تا جی کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔ اسے تو اپنے اس کچے کوٹھے اور بے ڈھنگے بوسیدہ گھر سے شدید نفرت تھی۔

کچھ عرصہ بعد گاؤں کے تین آدمیوں نے اپنے پختہ مکانات کی تعمیر شروع کر دی۔ اگر دل میں نیکی کا جذبہ موجود ہو تو اللہ تعالیٰ اسباب پیدا کر ہی دیتا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے مکانات کے ساتھ ساتھ مساجد تعمیر کرنے کا بھی ارادہ کر لیا۔ اس طرح بستی میں ایک ساتھ اللہ کے تین گھر بننا شروع ہو گئے۔ اب کیا تھا۔؟ صبح شام مساجد کے لاؤڈ سپیکر پر اللہ کا گھر بنانے کے لیے چندہ مانگنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تب ایک دن پھر تا جی نے اپنے دادا سے پوچھا۔

"دادا ہمارا تو ایک گھر بھی نہیں ہے۔ خدا اتنے گھروں کا کیا کریگا"؟

مسو کنیرا خود غریب اور اس کی ہنسی بڑی عجیب تھی۔ روہانسی صورت والی خوفناک ڈراؤنی ہنسی۔ ابھی وہ ہنس ہی رہا تھا کہ تا جی نے ایک اور سوال داغ دیا۔

”دادا خدا سے کہو ناں۔ اللہ کے نام پر ایک گھر ہمیں دے دے۔ ہم غریب حاجتمند جو ہیں۔“

اچانک مسوکیرے کی پراسرار ہنسی کسی اندھے کنوئیں میں جا گری اور اندر کا دکھ کھانسی کی صورت باہر آ پڑا۔ تاہم دادا کا یہ ردعمل تاجی کو تسلی نہ دے سکا۔ وہ سوچنے لگی کہ ہم غریب ہیں اس لیے اپنا گھر نہیں بنوا سکتے۔ خدا بھی اپنا گھر نہیں بنوا سکتا۔ لوگ چندہ اکٹھا کر کے خدا کا گھر تو بنواتے ہیں۔ ہمیں کیوں نہیں بنا دیتے۔ وہ ساری رات ٹوٹی پھوٹی بان کی چارپائی پر کروٹیں بدلتی اس سوال کا جواب سوچتی رہی۔ تاہم اس کے معصوم ذہن میں صرف یہی بات آتی تھی کہ شاید خدا ہم سے بھی زیادہ۔

وسوکیری کی طبیعت دن بدن بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ ایک دن صبح دم اسے شدید کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ بے ہوش ہو گئی تو ممدوکیرا سارے کام چھوڑ کر اس کے علاج معالجے کے لیے پیسے اکٹھے کرنے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن بستی کے اکثر لوگوں نے ممدو کو ایک جیسا ہی جواب دیا۔

”ادھار تمھیں اس لیے نہیں دیتے کہ تم واپس کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ صدقہ تم پر لگتا نہیں کیوں کہ خدا نے تمھیں صحیح سلامت ہاتھ پاؤں دیے ہیں۔“

ہر شخص سے یہی جواب سن کر ممدوکیرا غصے اور نفرت سے اپنے ہاتھ پاؤں دیکھنے لگا۔ اس کے ذہن میں خیال آیا جیسے وہ ان منحوس ہاتھوں اور پاؤں کی وجہ سے اپنی بیوی کا علاج نہیں کرا سکتا۔ یہی سوچتے سوچتے وہ مدرسے کے مہتمم کے پاس آ پہنچا۔ لیکن مہتمم صاحب گہری سوچ میں ڈوب کر فرمانے لگے۔

”ممدو۔ تمھاری بات اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن تو دیکھ رہا ہے کہ حال ہی میں مسجد کو رنگ روغن کرایا ہے۔ وضو والی جگہ پر چپس لگانا ابھی باقی ہے اور پھر اس سال روم کولر بھی لینا ہے۔ کیوں کہ اساتذہ کو گرمی لگتی ہے۔ تم نے کبھی ایک پھوٹی کوڑی مدرسے کو نہیں دی۔ نیک بخت مدرسے کی امداد کیا کر۔ اللہ تمھاری ساری پریشانیاں دور کر دیگا۔“

یہاں سے مایوس ہو کر ممدوکیرے نے بڑی مسجد کے مولوی صاحب کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ لیکن وہ درویش تو مہتمم صاحب سے بھی زیادہ پریشان تھا۔ کیوں کہ مسجد کے لیے نیا قالین اور لاؤڈ سپیکر خریدنے کے علاوہ چھت کی شیشہ کاری کے لیے پیسے اکٹھے نہیں ہو رہے تھے۔

”ہاتھ کا دیا کام آتا ہے ممدو۔ جتنا دے سکتے ہو خدا کے گھر کے لیے دو۔ اللہ تمھیں ایک کے بدلے لاکھ دیگا۔ تمھاری بیوی تو گنہگار فانی انسان ہے۔ مسجد تو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا صدقہ جاریہ ہے۔ لا آج اپنے ہاتھوں

سے بوہنی کرا دے'' ۔ مولوی صاحب مسلسل بولتے چلے گئے تو ممدو کنیرا کھسیانا ہو کر کہنے لگا ۔

''لیکن مولوی صاحب ہم نے تو آج تک پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھایا ۔ تن پر ڈھنگ کا کپڑا نہیں پہنا ۔ گھر والی الگ بیمار ہے ۔ خدا کے لیے مسجد میں اعلان کرا دیں کوئی ہماری مدد کرے ۔''

یہ سُن کر تو مولوی صاحب کو جیسے آگ لگ گئی ہو ۔

''اوئے بد بخت! کیا خدا کا گھر تم جیسے کمی کمین کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی جگہ ہے؟ شکل اچھی نہ ہو تو کم از کم بات اچھی کر لیا کرو ۔ خدا کی ناراضگی ہے ان لوگوں پر جو اس کے گھر کی مدد نہیں کرتے ۔''

مولوی صاحب نہایت غصے کی حالت میں ہاتھ نچا نچا کر بات کر رہے تھے کہ اچانک ممدو کنیرا بھی پھٹ پڑا ۔

''مولوی صاحب! خدا کو خدا رہنے دیں ۔ اسے ساہوکار نہ بنائیں'' ۔

اس سے قبل کہ مولوی صاحب جوتا اتارتے ۔ ممدو کنیرے نے وہاں سے نکلنے میں ہی عافیت جانی ۔

اس کی بیوی بڑی مشکل میں تھی ۔ وہ سورج طلوع ہونے کے انتظار میں بار بار آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتی ۔ لیکن آج سورج بھی اچھے دنوں کی طرح روٹھ گیا تھا ۔ آخر کار وہ بھی دنیا سے روٹھ گئی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر دیں ۔ معصوم تاجی بہت روئی ۔ ممدو بھی الگ تھلگ بیٹھا آنسو بہاتا رہا ۔ البتہ اس کا باپ مسو کنیرا بالکل خاموش بت بنا رہا ۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ ان پڑھ، احمق، بے وقوف ۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ مرنے والے کے کپڑے لتے، برتن اور نیاز کے پیسے مولوی صاحب کے گھر دینے پڑتے ہیں ۔ کہنے لگا ۔

''وسومائی کو انہی کپڑوں میں ہی ----!!!

بے وقوف احمق کہیں کا ۔

مولوی صاحب موت کی خبر سن کر علی الصبح آ پہنچے تھے ۔ بستی کے لوگ جمع ہو گئے تو مولوی صاحب نے تقریر شروع کر دی اور چندہ اکٹھا کر کے ممدو کنیرے کی ہتھیلی پر کچھ رقم رکھ دی ۔ یہ دیکھ کر مسو کنیرا کوشش کے باوجود چپ نہ رہ سکا اور نہایت چبھتے ہوئے انداز میں گویا ہوا ۔

''جب جیتے جی مدد نہیں کی تو اب ریاکاری سے کیا حاصل؟؟''

دوپہر تک مسو کنیرا خود سے جھگڑتا اور پوتی کو تسلی دیتا رہا جو بار بار قبرستان جانے کی ضد کر رہی تھی ۔ عصر کی نماز کے بعد مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے اعلان شروع ہو گیا ۔ ''ایمان والو ۔ خدا کا گھر بن رہا ہے ۔ بڑھ چڑھ کر

حصہ لو۔ تم خدا کے گھر کی امداد کرو، اللہ تمہارا گھر جنت میں بنا دیگا۔ جلدی جلدی آؤ۔۔۔۔!!!

بان بنتے بنتے ساری عمر الٹے قدموں چلنے والی کمسن تاجی نے یہ اعلان سنا تو خاموشی سے اٹھی اور ٹوٹے پھوٹے لکڑی کے صندوقچے سے وہ رقم اٹھا لائی جو مولوی صاحب نے جمع کر کے مدو کبیرے کی ہتھیلی پہ رکھی تھی۔ پھر وہ سیدھے قدموں چلتی ہوئی اپنے باپ کے پاس پہنچی اور کہنے لگی۔

"لو بابا!!!۔ ہم سے زیادہ ان پیسوں کی ضرورت خدا کو ہے۔ خدا کا گھر ضرور بننا چاہیے۔ ہم تو بھوکا سونے کے عادی ہیں"۔

یہ کہتے ہوئے اس کی معصوم آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ مدو کبیرا خاموشی سے پیسے لیکر مسجد کی طرف چل پڑا اور تاجی اپنی مرحومہ ماں کی چارپائی کے سرہانے بیٹھ کر روتے روتے مٹی پر سو گئی۔

☆☆☆☆

جمشید ناصر

سرائیکی زبان سے ترجمہ: طاہر شیرازی

سانحہ پشاور کے تناظر میں

نہ کر اب تُو کوئی ارمان، پگلی
کہ ہے یہ کربلا میدان، پگلی

یہاں پر جرم ہے بے جرم ہونا
یہی ہے چارسو اعلان، پگلی

کتاب خونچکاں اور بوٹ اور بستہ
بھلا یہ کس کا ہے سامان، پگلی

یہ بچوں کا تھا مکتب، ہائے افسوس
بنا جو آج گورستان، پگلی

مرا تو لعل خوں میں لال ہے اور
ہوا تیرا بھی کچھ نقصان، پگلی

یہ جنگل ہے یہاں جنگلی بلائیں
عبث تُو ڈھونڈ مت انسان، پگلی

☆☆☆☆

ڈاکٹر ادل سومرو

سندھی زبان سے ترجمہ: حبدار سولنگی

بچے ووٹ نہیں کرتے

تھر درد کا استعارہ ہے
اس کے دُکھ پر
اگر بادل نہیں روتے
تو دھرتی میں سے بھوک اُگتی ہے
جب آنکھیں ہی تھر بن جائیں
تو پھر خوابوں کے پاؤں جلنے لگتے ہیں
اور ہم سادہ لوگ ساری عُمر
خوابوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں
وہ صحافی اور فوٹوگرافر کے ساتھ
بڑی بڑی گاڑیوں میں آتے ہیں
اور امدادی کیمپوں میں
گھر کا ڈبہ اور دس کلو آٹے کے تھیلے دے کر
ہماری بوڑھی ماؤں کے ساتھ
فوٹو کھنچواتے ہیں
وہ ہمارے بھکاری بننے کا انتظار کرتے ہیں

جیسے کچھ امداد دے سکیں
ہمارے بچے اسکول نہیں جاتے
وہ قالین بنانے کے کارخانوں میں
بیمار ہوکر مر جاتے ہیں
ان کی تعلیم وصحت کے لیے
اُن کے پاس کوئی پروگرام نہیں
اس لیے کہ بچے ووٹ نہیں کرتے

(نثری نظم)

☆☆☆☆

رمضان نول

سندھی زبان سے ترجمہ: محمد مشتاق آشم

صلیب

صلیب حق
مرے ہاتھوں میں ہے
مصلوب ہونا
عین ممکن ہے

رمضان نول

سندھی زبان سے ترجمہ: محمد مشتاق آشم

گم شدہ بوسے

بند کر کے لفافے میں بھجوائے تھے
میں نے بوسے
تری سمت
وہ جو
بکھرے تھے ہونٹوں پہ تیرے
مگر
پوسٹ آفس میں گم ہو گئے

☆☆☆☆

منظور کوھیار

سندھی زبان سے ترجمہ: شاہد حنائی

سات مسافر

زندگی کی ٹرین کی ایک سپیشل بوگی میں سات مسافر ہم سفر تھے۔ برق رفتار ٹرین عمر کی آخری سرحدیں عبور کرتی جارہی تھی۔ سب مسافر اپنی آخری منزل کی جانب محوِ سفر تھے۔

ایک مسافر نے کہا:

”مَیں مُلک کا وہ معروف ڈاکٹر تھا، جس کی مسیحائی کے چرچے تھے۔ موت کے خوف سے سہمے مال دار لوگ میرے سامنے نیم ذبح مرغ کی مثل تڑپتے تھے۔ وہ روپیا پیسا پانی کی طرح بہا کر مجھ سے آبِ حیات جیسا کوئی نسخہ طلب کرتے تھے، جسے حاصل کر لینے کے بعد انھیں اَبدی زندگی نصیب ہو جائے۔ مَیں انھیں دُنیا کے مہنگے ترین نسخے لکھ کر دیتا اور طریقۂ استعمال سمجھاتے ہوئے یقین دہانی کرایا کرتا کہ یہ امرت دھارا جیسے ہی ہیں۔“

”مگر افسوس کہ آج مجھے جیون کا ٹکٹ زبردستی تھما کر اس ٹرین میں سوار کرا دیا گیا ہے۔ مجھے اپنی تو کوئی فکر نہیں، اگر تشویش ہے تو اپنے نازک، نفیس اور امیر کبیر مریضوں کی ہے۔ نہ جانے میرے بغیر ان کا کیا ہوگا۔۔۔۔!“

دُوسرا مسافر بولا:

” مَیں مُلک کا مشہور وکیل تھا۔ مَیں نے قانون کو اس حد تک سمجھ لیا تھا کہ شاید ہی کسی اور نے جانا ہو۔ مَیں قانون کو اپنی مرضی کے مطابق ربڑ کی طرح کھینچتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ میرے پاس دلائل کا انبار بھی ہوتا تھا۔ اس لیے مَیں مجرم کو بے گناہ اور بے خطا کو مجرم ثابت کر دیتا تھا۔ میری اس ذہانت اور ہوشیاری کے باعث مُلک کے کئی سفید پوش لوگ میرے مرید رہتے تھے۔ اسی لیے پورے مُلک میں میرا ڈنکا بجتا تھا۔“

”پریشانی تو صرف اس بات کی ہے کہ مجھے کسی دلیل اور وجہ کے بنا اس ٹرین میں بٹھا دیا گیا ہے۔ پتا

نہیں میرے بعد سفید پوش مُجرموں کا کیا بنے گا۔!''

تیسرا مسافر کہنے لگا:

'' مَیں ایک سرکاری اعلیٰ افسر تھا اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہا۔ میرے قلم کی جنبش سے بہت سوں کی زندگیاں سنور جاتی تھیں اور بہتیروں کے جیون تباہ ہو جاتے تھے۔ مَیں ایک ایسا پالیسی ساز افسر تھا، جس کی پالیسیوں کا ظاہری مقصد تو عوام کی بھلائی ہوتا تھا، مگر درحقیقت یہ پالیسیاں خواص کے خاص مفادات کے پیشِ نظر ترتیب دی جاتی تھیں۔ لہٰذا مَیں ذہانت اور اعتبار کی علامت بن چکا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے وقت مجھے ایکسٹنشن بھی اسی غرض سے دی گئی تھی کہ مَیں مُلک کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے خدمات انجام دے سکوں۔''

'' مگر غیر متوقع طور پر مجھے میری ذِمہ داریوں سے سبک دوش کر کے اس ٹرین پر سوار کرا دیا گیا۔ مجھے اپنی ذات کی حد تک تو قطعی کوئی ملال نہیں ہے۔ البتہ رنج اس بات کا ہے کہ میری غیر حاضری میں میری تیار کردہ پالیسیوں کا کیا بنے گا۔!''

چوتھے مسافر نے کہنا شروع کیا:

'' مَیں مُلک کا جانا پہچانا تاجر تھا، جس نے ہر شے کا بیوپار کیا۔ مَیں نے فلاحی تجارت کے نام پر لوگوں کو ہر شے فراہم کی۔ اجناس، آٹا، کپڑا، پلاٹ، مکان، زہر، تریاق، ہتھیار، بارود کا لین دین کیا۔ دین دھرم کے حوالے سے لوگوں کو کتنے ہی پنتھ اور فرقے دیے۔ کچھ کو صراطِ مستقیم کی سَند دی تو کچھ کو لادین اور اَدھرم قرار دیا۔ کچھ کو جنت کا ٹکٹ دیا تو کچھ کو دوزخ کا پروانہ دلایا۔ مَیں نے اس کاروبار سے اتنا کمایا کہ شاید ہی کسی نے کمایا ہو۔ قارون کے خزانے کی مثال دینا غلط نہ ہوگا۔''

'' مگر جب کچھ بتائے بنا مجھے اس ٹرین میں دھکیل دیا گیا تو مَیں حیران رہ گیا کہ ایسا کیوں کر ہوا۔؟ مگر کیا کیا جائے! شہ زور کے سامنے رویا ہی جا سکتا ہے۔ بس اگر کچھ ملال ہے تو اتنا کہ میری غیر موجودگی میں ان لوگوں کو کیا ہوگا، جو دین و دُنیا کے معاملات میں میرے محتاج تھے۔!''

پانچواں مسافر گویا ہوا:

'' مَیں مُلک کا وہ سیاست دان تھا، جس نے سیاست کو نئے رُخ، نئے زاویے دیے۔ مَیں نے کچھ لوگوں کو احساسِ برتری سے نوازا تو بہت سوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کیا۔ ایسے احساسات میں اُلجھے لوگ ہی میرے پیروکار تھے۔ اسی وجہ سے اقتدار ہمہ وقت میرے پاس رہا اور مَیں مقتدر قوتوں کا حلیف۔''

”پتا نہیں میرے اس بے وقت ٹرین میں سوار ہو جانے کے بعد میرے بے زبان لوگوں کا کیا ہوا ہوگا۔! بس غم ہے تو اس بات کا۔!“

چھٹا مسافر بولا:

” مَیں وہ قومی محافظ تھا، جس نے قوم کی یوں پاسبانی کی جیسے چیتا ہرن کی حفاظت کرتا ہے، کیوں کہ میری قوم ہی میری خوراک تھی۔ میرے الفاظ میں ایسی اثر انگیزی اور قوت تھی کہ اگر مَیں نے دن کو رات کہا تو رات ہو جاتی، اگر رات کو دن کہا تو دن ہو گیا۔ میری حکمرانی کی شہرت مُلکوں مُلکوں پھیلی ہوئی تھی۔ مَیں نے اپنی قوم پر اس طرح حکومت کی، جس طرح فاتحین مفتوحین کریں۔ میرا دبدبا و را نداز ہی نرالا تھا۔ اب مَیں خود اپنی تعریف کیا کروں۔! بس مَیں، مَیں تھا۔!“

” مگر یہ مجھے زبردستی اس ٹرین پر سوار کرا دینا بڑی زیادتی ہے۔! حقیقت میں تو مجھے کوئی دُکھ یا شرمندگی نہیں ہے، اگر کچھ ہے تو صرف یہ خوف ہے کہ میرے بغیر میری نا سمجھ قوم کے مستقبل کا کیا بنے گا۔!“

ساتواں مسافر:

ساتواں مسافر مسلسل چُپ چاپ اور پُر سکون بیٹھا رہا، جیسا سے کسی بات کی پروا نہ ہو۔ اس کی یہ خاموشی سب کو کاٹے جاتی تھی۔ بالآخر ان میں سے ایک نے سکوت توڑا اور پوچھا:

”تم کون ہو؟“

ساتویں مسافر نے دھیمے اور مطمئن لہجے میں جواب دیا:

” مجھے نہیں پتا کہ مَیں کون ہوں، مگر مَیں جس طرح دُنیا میں آیا تھا۔ اُسی طرح لوٹ کر جا رہا ہوں۔ لہٰذا مجھے کوئی افسوس، خطرہ یا پریشانی قطعی نہیں ہے۔“

”تو پھر یقیناً تم کوئی ولی ہو گے!“ ساتوں مسافروں نے یک زبان ہو کر کہا۔

ساتواں مسافر۔

۔۔۔ ساتویں مسافر نے کوئی جواب نہ دیا۔

وہ صرف مسکراتا رہا۔

☆☆☆☆

الطاف حسین اندرابی

کشمیری زبان سے ترجمہ: غلام حسن بٹ

ظلمِ عظیم

ایک کشمیری گھرانہ۔۔۔خواجہ صاحب کمرے میں کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر شال زانو کے اوپر رکھے کڑھائی کر رہے ہیں اور کیسٹ سُن رہے ہیں ۔ ہے مجھے تیری بہت محبت لیکن تیری جگہ کہاں ہے (گیت)

دروازے سے اُن کی بیگم سلیمہ آپا ہاتھ میں کانگڑی اُٹھائے اندر داخل ہوتی ہے)

سلیمہ آپا: کتنی محبت آپ کو اس گیت سے ہے۔ ہر وقت یہی کام ہے۔۔۔کسی سے کوئی بات چیت نہیں کرتے۔

خواجہ صاحب: اپنے آپ ہنستے۔۔۔ہونٹ گھماتے ہوئے۔۔۔محبت ہے کیا کہوں۔۔۔ تمھیں کیا خبر ہے۔۔۔اس کی محبت ہے۔۔۔ پہلے آپ کی بلا سے

سلیمہ آپا: کیوں؟ مجھے کیوں خبر نہیں۔۔۔میں کیا گونگی ہوں۔ گانے سے پیار۔ بیٹھے رہنے سے محبت۔ شال کو ٹانکا لگانے۔ گنگنانا اور کیا۔۔۔!

خواجہ صاحب: ہاہاہا۔۔۔سچ کہہ رہی ہو۔ اللہ کی قسم سچ کہہ رہی ہو۔ اری کبھی کبھار اٹھارہ آنے بات کرتی ہو۔

سلیمہ آپا: آپ کو باتیں کرنی ہیں۔ پورا دن گانے سُننا، سوئی سے چبھن چبھن دینا۔ کہانا محبت ہو گئی ہے۔

خواجہ صاحب: سچ کہہ رہی ہو۔ یہ محبت درحقیقت میری رگ رگ میں پیوست ہے۔ یہ اپنی ان ولیوں کی سرزمین کی محبت ہے۔ جو سب صاحبِ بصیرت اور محبت کرنے والوں نے اس سے کی ہے۔ جس کے ساز میں معرفت کے راز ہیں۔ اس سوئی اور دھاگے میں میرا کمال ہے۔ اب ثقافت کا پرتو ملا ہے۔ یہ جو شال پر

پھول بوٹے جڑتا ہوں یہ میری ولیوں کی سرزمین میں تابندہ مستقبل کی علامت ہیں۔۔۔ مگر کیا کروں۔۔۔ ہوش چھوڑ کر۔۔۔ ارے مگر۔۔۔

سلیمہ آپا: کیوں ہوش کیوں چھوڑ دیتے ہو۔

خواجہ صاحب: کیا کہوں! پھول بوٹے میں نئے بناتا ہوں لیکن سوئی ہاتھ میں نہیں رُکتی۔ پھول بوٹوں کے ساتھ کتنی ہی کونپلیں اور دانے (بیج) بھی چلے جاتے ہیں۔ جیسے دل پر گرفت (گرہ) لگ جاتی ہو۔

سلیمہ آپا: ارے جی اب واپس آ جائیں۔ آپ اس طرف زیادہ سوچتے ہیں۔ باقی دنیا کی بھی فکر کیا کریں۔

خواجہ صاحب: دنیا کی کیا فکر کروں۔ جسے اپنے گھر میں آرام نہ ہو۔۔۔ اسے کہاں قرار ہوگا۔ وہ کیا دل کا رونا سمجھے۔۔۔ جسے تازہ بہار میسر ہو۔

سلیمہ آپا: ہائے کیا ہوگیا۔۔۔ آپ کو گھر میں کیا تکلیف ہے؟ اللہ نے آپ کو خوب رو اولاد سے نوازا ہے۔ اللہ انھیں نظرِ بد سے بچائے۔ غلام نبی پہ واری جاؤں۔ صبح سویرے اپنی دکان پہ چلا جاتا ہے۔ ایسی ہی بڑے نصیبوں والی بیوی ملی ہے۔ کانگڑی کی انگاروں کو پلٹنے بھی نہیں دیتی۔

(دروازے سے ان کی بہو نسیمہ ہاتھ میں سماوار، پلیٹ میں کلچے اور کپ لیے داخل ہوتی ہے)

خواجہ صاحب: آؤ بیٹی۔ تمھاری بات تمھاری ماں کر رہی تھی۔ چائے کی طلب ہے۔

نسیمہ لالہ: سماوار کو پھونک مارتے ہوئے۔۔۔ پیارے) سسر کو کہتی ہے) چائے پورا دن اُبل رہی ہے۔ میں گلے (بیٹے کا نام) اور ڈالی (بیٹی) کا انتظار کر رہی تھی۔

سلیمہ آپا: ان دونوں بچوں کے صدقے جاؤں۔ پتہ نہیں آج انھیں کیوں دیر ہوگئی۔ چھٹی دیر سے ہوئی ہوگی۔

خواجہ صاحب: چل رہے ہوں گے۔ بچے ہیں نا۔۔۔ کہیں کھیل رہے ہوں گے۔

سلیمہ آپا: ہائے بھوک سے غش آ رہے ہوں گے۔ سویرے بھی چاول کے دو ہی لقمے کھائے ہیں۔ جگر سخت ہوا ہوگا۔ ساتھ ہی آج باہر رہنا مشکل ہے۔

خواجہ صاحب: یہی بات میں آپ کو بتا رہا ہوں۔۔۔ وہ سکون کا زمانہ نہ رہا۔ ہر طرف یہ بلائیں (بھارتی فوج) ناچ رہی ہیں۔ نہ انھیں انصاف اور نہ عار ہے۔ جب چاہیں جسے چاہیں دستار اُتار لیتے

ہیں (بے عزت کرتے ہیں)

سلیمہ آپا: میں نے کہا یہ شال وال زانو سے اُتار لیں۔ زانو کو بھی آنکھیں لگ گئی ہیں۔ غلام نبی سے کہیں کہ وہ بچوں کو دیکھے۔

خواجہ صاحب: ارے جی یہ اُٹھا (کھڑا ہوا) تم کہاں بیٹھنے دو گی۔۔۔ پیچھے پڑ گئی ہو۔ سوچ رہا تھا اس شال کا کام ختم کر دوں۔ بیوپاری نے رات سے دو تین چکر لگا لیے۔ اس نے کسی گاہک کو دینی ہے۔

نسیمہ لالہ (بہو): پیارے (سُسر کو عزت سے کہتی ہے) تب تک میں شال کا باڈر بنا دیتی ہوں۔ آپ دکان پہ نظر لگا آئیں۔

خواجہ صاحب: یہ لیں بیٹی مگر احتیاط سے۔ اس ساوار میں بھی کوئلے ڈالیں۔ آہستہ آہستہ پھر سلگ جائیں گے۔ جو اچھی طرح اُمل جائے۔ غلام نبی کو بچوں کی خبر کے لیے بھیجا گیا۔

سلیمہ آپا: وہاں سے خانیاری سبزی کی تھیلی لانا سبزی والے سے۔

خواجہ صاحب: اچھا جی

(خواجہ بیٹے کی دکان پر پہنچتا ہے۔ وہاں چند محلّہ دار غلام نبی سے بات کر رہے ہیں)

خواجہ صاحب: السلام علیکم

محلّہ دار: وعلیکم السلام۔ آئیں خواجہ صاحب خیریت ہے؟ اب آپ گھر سے کم ہی نکلتے ہیں۔

خواجہ: ہاں جی اللہ کا شکر، سچ پوچھیں باہر کے حالات سُن کر اور دیکھ کر گھر سے نکلنے کا جی نہیں چاہتا۔

غلام نبی: پیارے (والد کو مخاطب کر کے کہتا ہے) کہتے ہیں رات کو ڈاؤن ٹاؤن میں چھاپا مارا گیا۔ کتنے گھروں کو لُوٹا گیا ہے۔ ویسے ہی چند نوجوانوں کو گرفتار کر کے لے گئے۔ کیا پتہ بے چاروں پہ کیا الزام لگایا گیا ہے۔

محلّہ دار: ہاں انھیں کیا ڈھونڈنا ہے۔ کہیں گے تم ہی اگروادی (دہشت گرد) ہو۔

خواجہ: ہاں جی ان کو سب کشمیری اگروادی (دہشت گرد) نظر آتے ہیں۔ کب ان سے جان چھوٹے گی۔ (آزادی ہو گی)

محلّہ دار: چاروں طرف انھوں نے ملیامیٹ کر دیا۔ نہ دن کا خیال ہے انھیں نہ رات کا۔

خواجہ: ارے غلام نبی۔ یہ بچے سکول سے واپس نہیں لوٹے ابھی تک، ذرا صدقے نظر دے آؤ۔

غلام نبی: میں تب دکان بند کرتا ہوں۔

محلّہ دار: اچھا خواجہ صاحب اجازت جانے کی ہے؟

خواجہ: جائیں خدا کے حوالے (اللہ حافظ)

(محلے دار سلام کر کے چلا جاتا ہے اور غلام نبی دکان بند کر کے والد کے ہمراہ گھر کی طرف چل پڑتا ہے۔ گلزار اور ڈالی سکول سے واپس آ کر سلام کرتے ہیں)

گلزار اور لاڈلی: السلام علیکم۔

خواجہ: وعلیکم السلام بیٹا آج کیوں دیر ہوئی؟

غلام نبی: کھیلتے رہے ہوں گے۔ آپ اب تک کہاں تھے؟

گلزار: پیارے والد۔ سکول میں انڈین آرمی آئی تھی۔

خواجہ: کیوں؟

گلزار: کہہ رہے تھے کہ آپ کیوں جلوس نکالتے اور نعرے لگاتے ہو۔ اگر دوبارہ ایسا کیا تو ہم ہڈیاں توڑ دیں گے۔ انھوں نے ہمیں ابھی تک بند رکھا۔

خواجہ: اچھا جی خیال رکھا کریں۔ ان پہ کوئی بھروسہ نہیں۔ چلیں امی گھر میں انتظار کر رہی ہوگی۔ او غلام نبی والدہ خانیاری سبزی (کرم) مانگ رہی تھی۔

غلام نبی: پیارے والد۔ آپ چلیں میں خود لا رہا ہوں۔

(تینوں باپ بیٹے گھر کی طرف چل پڑتے ہیں)

(دروازے کو ٹھک ٹھک ہوتا ہے۔۔۔ امی دروازہ کھولیں)

سلیمہ آپا: ارے نسیمہ لالہ جلدی جلدی دروازہ کھولو۔ گلہ (گلزار) اور ڈالی آ گئے (ان پہ واری جاؤں)

(نسیمہ لالہ جلدی جلدی دروازہ کھولتی ہے اور سارے باپ بیٹا گھر میں داخل ہوتے ہیں)

نسیمہ: آپ اتنی دیر کہا تھے، دیر کیوں ہوئی؟

خواجہ: اب انھیں کپڑے بدلنے دیں۔ چائے تیار نہیں ہے؟

سلیمہ آپا: چائے پورا دن اُبل رہی ہے۔ ہاتھ دھوؤ۔ چہرے پر بھی پانی کے چھینٹے مارنا، جلدی جلدی

آؤ چائے تیار ہے۔ غلام نبی کہاں گیا؟

خواجہ: آ رہا ہوگا۔ سبزی (کرٗم) لانے گیا ہے۔ یہ آ گیا۔

(غلام نبی ہاتھ میں سبزی اٹھائے بے چینی کے عالم میں اندر داخل ہوتا ہے اور سلام کرتا ہے)

سلیمہ آپا: صدقے جاؤں تم کیوں پریشان ہو خیر تو ہے؟

غلان نبی: ہاں ماں خیر ہی ہے۔ کہہ رہے ہیں یہ موچی (انڈین آرمی) گھر گھر تلاشی لے رہی ہے۔ رات کو نیچے والے محلے میں لوٗٹ مار کی ہے۔

خواجہ: آہستہ آہستہ اوپر محلہ میں بھی آ جائیں گے۔

سلیمہ آپا: میرے دگیر (ولی پیر دستگیر) اس راستے کو پوشیدہ ہی رکھے (دور رکھے) میرے اللہ تو خود ہی حفاظت فرما!۔

ڈالی: کہا جاتا ہے کہ پرسوں ڈاؤن ٹاؤن سے چار لڑکوں کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔

نسیمہ لالہ: ڈالی تمھیں کس نے یہ بات بتائی۔

ڈالی: امی (بوبہٗ) سکول میں یہ بات سنی تازہ ہے نا تازہ۔ میری سہیلی نا

نسیمہ: ہاں نا۔

ڈالی: اُسی نے بتائی اس کے ہمسائے ہیں نا! کہا جا رہا ہے کہ رات کو آئے تمام گھر والوں کی مار پیٹ کی اور سارے گھر کو لوٗٹا۔

سلیمہ آپا: توبہ تسخیر! ان لڑکوں کو بہت مارا ہوگا۔ ان موچیوں سے کوئی پوچھتا چھ نہیں کرتا۔

غلام نبی: کون پوچھے ان سے۔ پوچھنے والوں کو یا تو مار دیا گیا۔ یا پابندِ سلاسل کیا گیا۔ بات کرنے والے کی زبان کاٹ دی جاتی ہے۔

نسیمہ: ہائے کیا کروں یہ تو گٹہ کار (ظلم) ہے۔

سلیمہ آپا: گٹہ کار (ظلم) نہیں تو کیا۔ اسی کو کہتے ہیں اندھیر نگری چوپٹ راج۔

خواجہ: یہی بات میں ان کو بتا رہا تھا۔ آپ بتائیں ان حالات میں کوئی آرام کیسے کر سکتا ہے۔ یہی سوچ سوچ کر میرا جگر چھلنی ہو گیا۔

کیا ہوا ہماری اس ولیوں کی سرزمین کو۔ نظرِ بد لگ گئی کسی کی۔ وہ پیار اور محبت کہاں رہا۔۔۔۔۔ ذرا بیٹی

یہ شال ادھر لاؤ۔

(خواجہ نے شال گھٹنوں کے اوپر رکھی اور دھاگے کے ساتھ گنگنانے لگا)

شعر: کشمیر تھا! اس آنکھوں کے دریچے کو کیا ہو گیا
اس رواداری اور ملنساری کو کیا ہو گیا
لیکن چرار شریف کی جمعرات کو کیا ہو گیا
زعفران نوحہ کناں ہیں ولیوں کی سرزمین کو کیا ہو گیا

(تمام گھر والے چائے پیتے اور باتیں بھی کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے ٹیپ ریکارڈر آن کیا اور شال پہ کڑھائی شروع کر دی۔ باہر گاڑی رُکنے کی آواز آئی اور چند لوگ پریشانی کی حالت میں نیچے اُترے اور دروازے کو زور زور سے لاتیں مارنے لگے)

سلیمہ آپا: غلام نبی ذرا دیکھو دروازے کو کون لاتیں مار رہا ہے۔

(غلام نبی دروازے پہ جاتا اور معلوم کرتا ہے۔)

غلام نبی: ارے کون ہو؟ ٹھہریں میں دروازہ کھولتا ہوں۔

آواز نمبر ا: دروازہ کھولو ہمیں توڑنا بھی آتا ہے۔

(غلام نبی نے جوں ہی دروازہ کھولا چند بندوق بردار غصے کی حالت میں داخل ہوئے)

خواجہ: بیٹا کیا بات ہے؟ کیا تلاش کر رہے ہیں؟

آواز نمبر ۲: ارے بڈھے بہانے نہ بنا! بتا انھیں کہاں چھپایا ہے۔

خواجہ: کون؟ یہاں کوئی نہیں آیا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

آواز نمبر ۲: یہاں کوئی نہیں آیا؟ سیدھے بتاؤ۔ نہیں تو کہلوائیں!

(سامان کو جھاڑنا شروع کیا)

سلیمہ آپا: ارے آپ کو نظر نہیں آ رہا۔ آپ کو کسی نے غلط راستہ بتایا ہے۔

آواز نمبر ا: دیکھو تمہارا راستہ بھولا ہے۔

غلام نبی: (غصے میں) ارے یار تمھیں بات کرنے کی تمیز ہی نہیں۔ کس سے بات کر رہے ہو۔

آواز نمبر ا: او پہلے اسی کو مار دو۔ یہ زیادہ پُر پُر کرتا ہے۔

خواجہ: ارے بیٹا بات سنو۔ خدا کی قسم یہاں کوئی نہیں ہے۔

آواز نمبر۲: تم سیدھے بتاؤنا۔ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔

(اس نے خواجہ (کے گریبان کو ہاتھ ڈالا) کا گریبان پکڑا)

سلیمہ آپا: ہائے کیا ہوا! ارے تمھیں کیا ہوگیا۔ شرم نہیں آتی۔ دفع ہو جاؤ

(غلام نبی نے بندوق بردار کو پکڑا اور نیچے گرایا۔ گلزار چھڑی لے کر آیا)

خواجہ: او غلام نبی کچھ نہ کرو۔ ٹھہر وا سے پولیس کے حوالے کرتے ہیں۔

غلام نبی: ابا جی آپ بہت سادھا ہیں۔ یہ تو ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اُن کے ناؤٹ ہیں۔

خواجہ: ہمیں قانون ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔ ہم نے کوئی خطا نہیں کی۔

غلام نبی: ابا جی (پیارے) قانون کا احترام وہاں لازم ہے جہاں قانون ہو۔ یہاں انسانیت کا گلہ کاٹنے اور انسان کو مسلا جاتا ہے۔

قانون بندوق کے زور پر نافذ کیا جاتا ہے۔ وہاں کوئی ایسے قانون کا کیا احترام کرے۔

(باہر چند افراد چہرے پر کالی پٹیاں باندھ کر اندھا دُھند فائرنگ کر رہے ہیں۔ دروازے کو لات مار کر اندر داخل ہوتے ہیں۔ غلام نبی اس بندوق بردار کو کھلا چھوڑ دیتا ہے۔ منہ کالے افراد کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

گھر کے سارے افراد پریشانی کے عالم میں جیسے سُن ہو جاتے ہیں (بے حس)۔

فائرنگ تیز ہو جاتی ہے اور ایک گولی غلام نبی کے سینے سے پار ہو جاتی ہے۔ گلزار نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی اور اُسے بھی پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے گاڑی کے اندر ڈالا۔

ماں بیٹی نے روتے ہوئے اپنا آپ غلام نبی کے اوپر پھینکا (ڈالا)۔

غلام نبی شہادت کا جام نوش کر کے اُس دنیا میں پہنچ گیا تھا جہاں سے کوئی نہیں آتا۔ جسے فنا نہیں ہے۔

محلّہ دار جمع ہو گئے۔ یہ تو ظلمِ عظیم ہے۔

خواجہ ایک کونے میں بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے۔

ایک محلّہ دار: چمچ دانتوں میں دبا کر خواجہ کے دانت کھولنے کی کوشش کرتا ہے اور پانی ڈالتا ہے۔

اے خواجہ صاحب! اے خواجہ صاحب آنکھیں کھولیں۔

خواجہ صاحب نے آنکھ کھولی۔ تھوتھلی زبان میں پکارتے ہیں۔ میرے غلام نبی! میرے غلام نبی!

اپنے پیارے جگر کے ٹکڑے کی جدائی کا تیر خواجہ کے سینے کو چیر کے چلا گیا اور اس چھلنی سینے سے غمناک آواز نکل رہی تھی۔

میرے اللہ! میرے اللہ!

ٹیپ ریکارڈ میں ابھی کیسٹ چل رہی تھی۔

دیکھ لالہ اس زمین نے کون کون سے پھول ختم کر دیے (کھا لیے)

ہمارے بدن رنجیدہ اور ان کے مزار ہوں گے۔

جو رنجیدہ ہوا سے کہاں قرار ہوتا ہے۔

وہ دل کے جلنے کو کیا محسوس کرے۔

جسے دل کا قرار نہ ہو۔

☆☆☆☆

پروفیسر صوفی عبدالرشید

ہندکو زبان سے ترجمہ: امتیاز الحق امتیاز

رباعیات

رحمان و رحیم ذات تیری مولا
سب کچھ ہے فنا، حیات تیری مولا
تیرے ہیں ثنا خوان، زمین اور زمان
ہر ذرّے کے لب پہ بات تیری مولا

مکّہ کے رسولؐ کا مدینہ دیکھوں
میں نور ہی نور زینہ زینہ دیکھوں
کھل جائے اگر باب عنایات رشیدؔ
اللہ کی رحمت کا خزینہ دیکھوں

یارو! جو کسی طور بے جا دیکھو
ایسا بھی نہیں اس کا تماشا دیکھو
اس کے برتاؤ کا کرو شکوہ بھی
اور اپنے بدلنے کا طریقہ دیکھو

☆☆☆☆

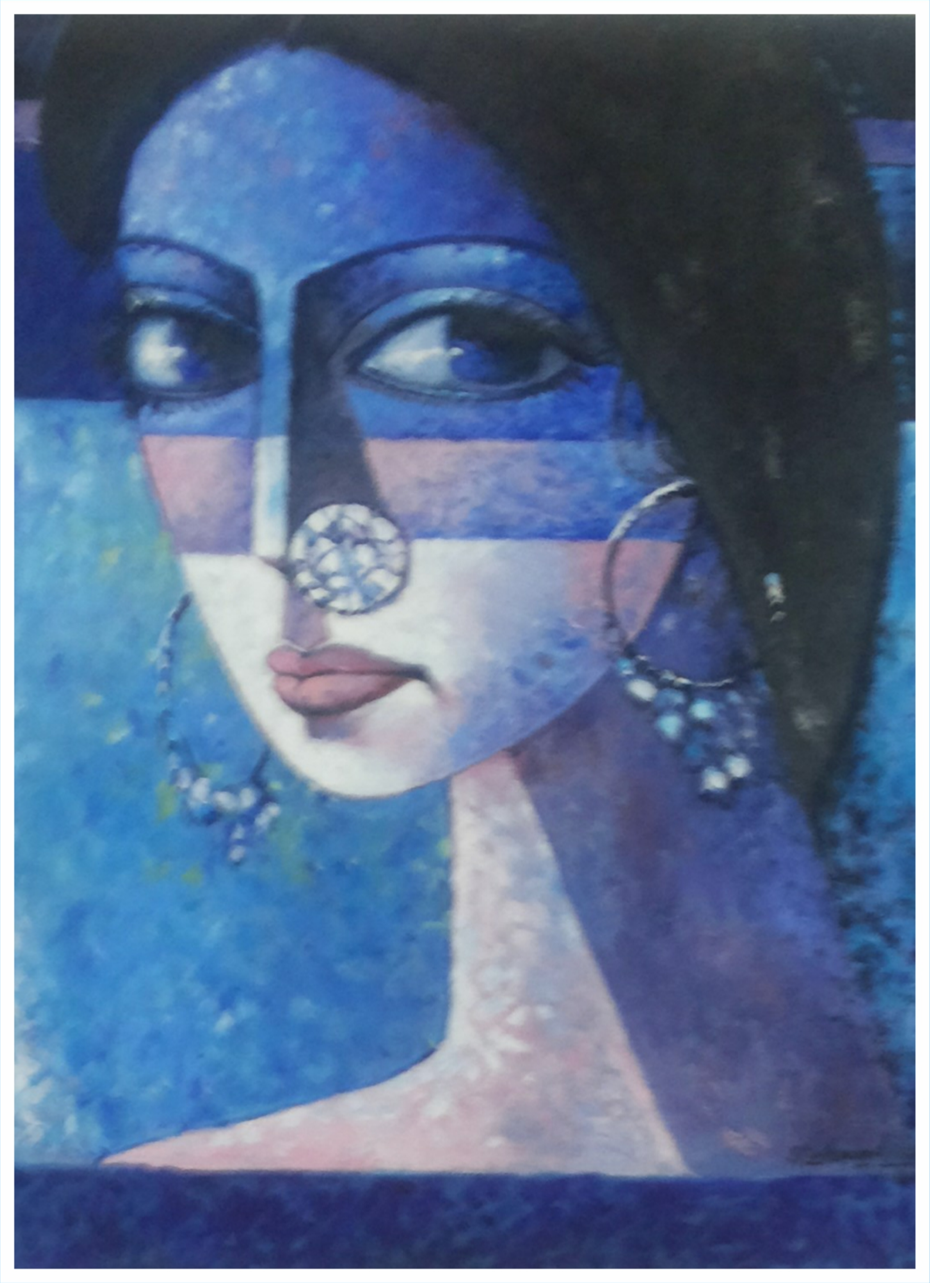

حرف تھے اور بھی پر پھول بنایا مجھے تھا

(غزلیات)

آخر کس کہانی کو جلی عنوان ہونا ہے

(ناول کا ایک باب)

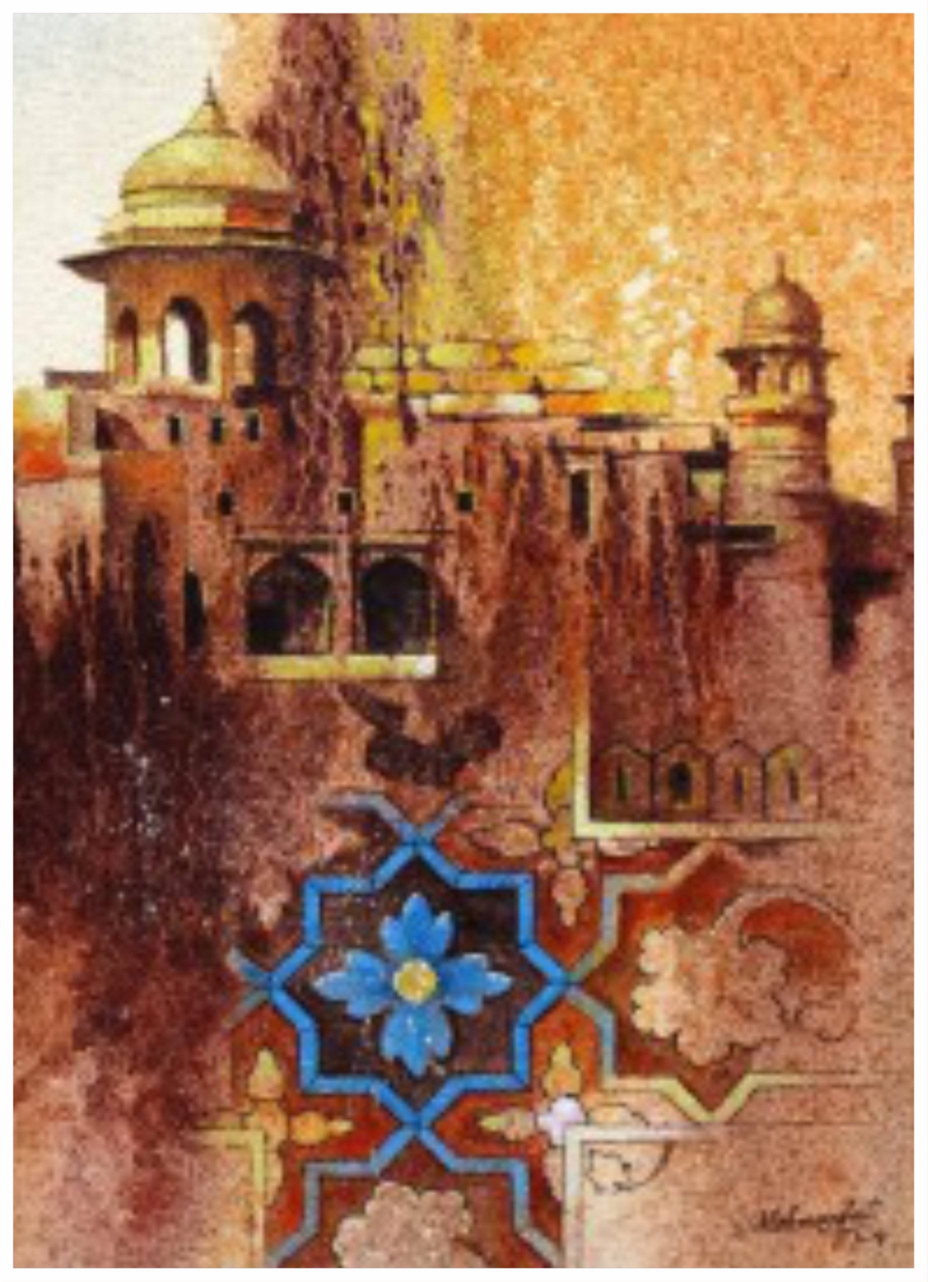

زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

(پاکستانی زبانوں سے تراجم)

حضوری اپنے لیے ہی فقط نہیں مانگی

(عقیدت)

میں جو بھی ہوں مجھے ویسا رقم کیا جائے

(خصوصی مطالعے)

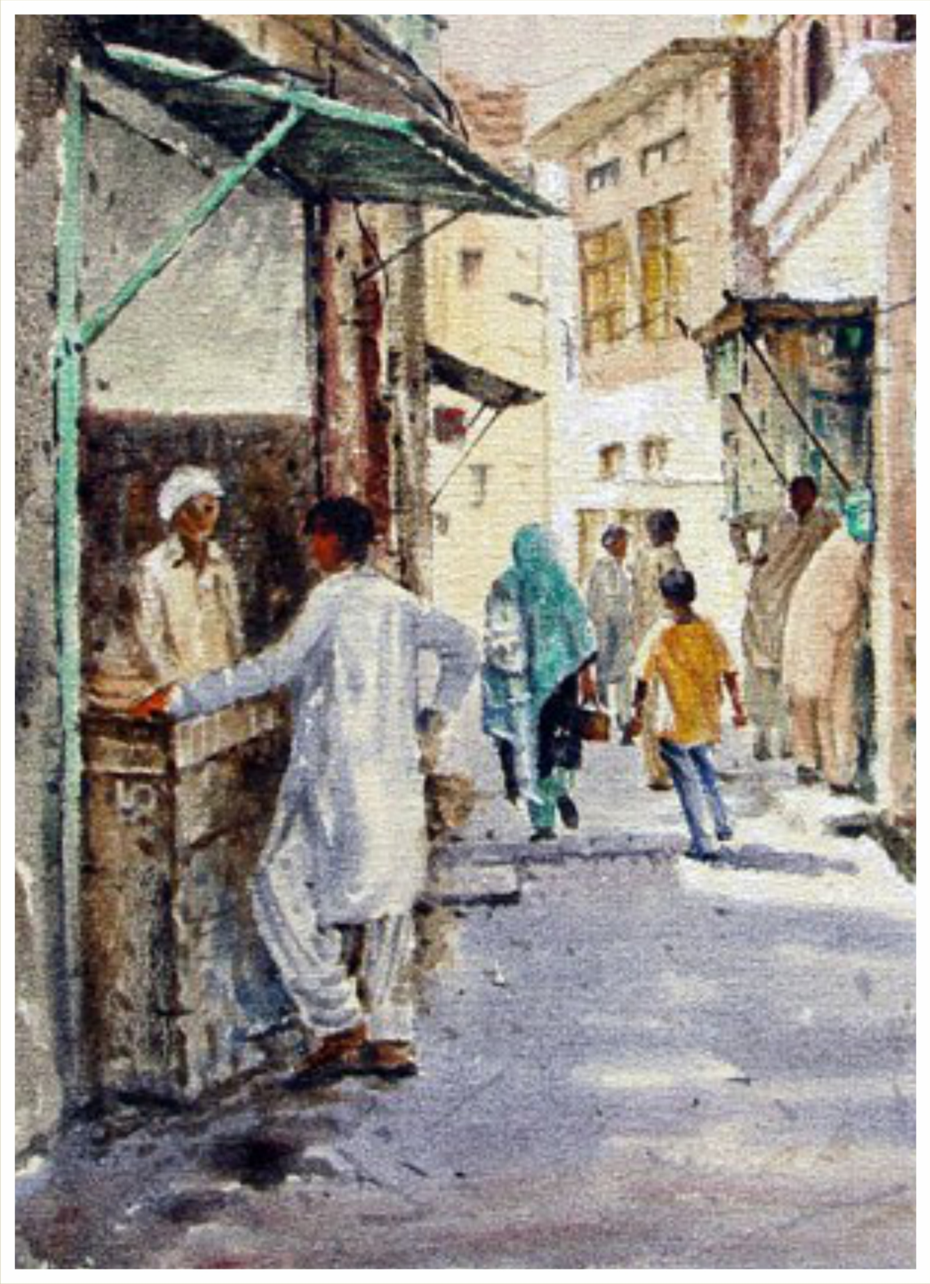

کیا باغ و بہار اُس کا فسانہ ہے سنو تو

(افسانے)

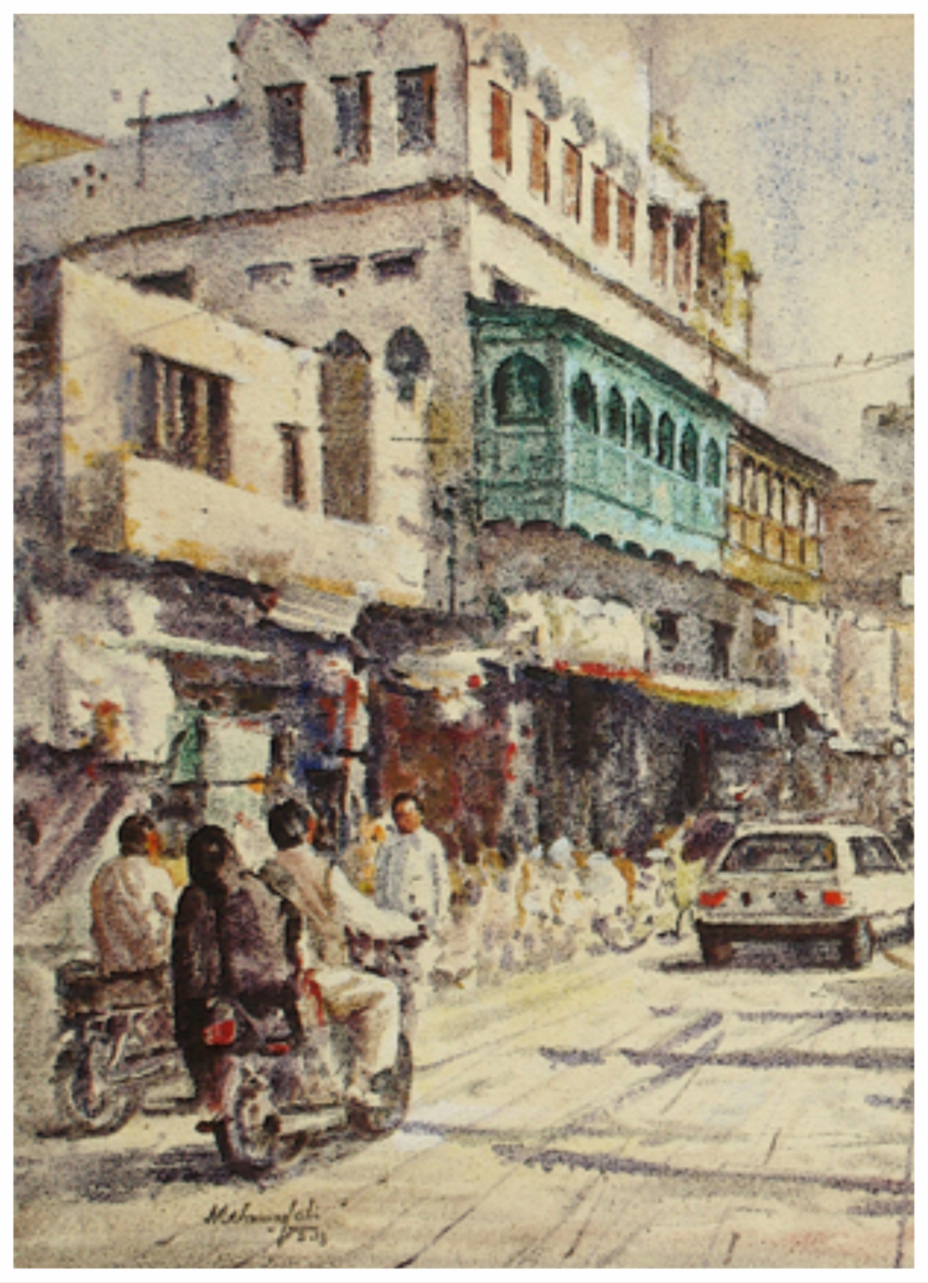

رفتگاں کی کھوج اور آئندگاں کا انتظار

(یادداشتیں/خاکے)

کتابوں میں لکھے الفاظ مجھ سے پوچھتے ہیں

(مضامین)

Quarterly **Adabiyaat** Islamabad

July to September 2015

ISSN: 2077-0642

پاکستانی لٹریچر کا تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

PAKISTANI LITERATURE

Vol.18 2015 Issue 1 ISSN 2411-037X

Pakistan Academy of Letters

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269721, 9269714
Website: www.pal.gov.pk -email: adabiyaat@pal.gov.pk